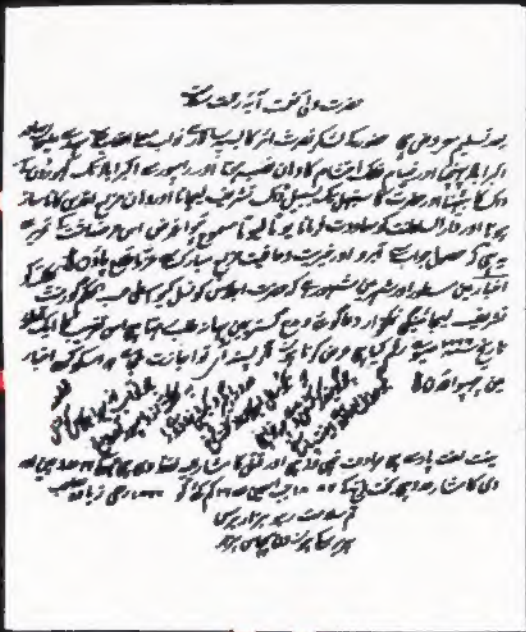
مرتبہ

خلیق انجم



غالب کے خطوط

جلد دوم

غالبؔ کے خطوط

(جلد دوم)

غالب کے خطوط

(جلد دوم)

مُرتّبہ

خلیق انجم

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

بہ اہتمام : شاہد ماہلی

سنہ اشاعت : ۲۰۰۶ء

تعداد : ۵۰۰

قیمت : ۲۵۰؍روپے

مطبوعہ : اصیلا آفسیٹ پریس، نئی دہلی

جلد دوم

غالب انسٹی ٹیوٹ،

ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۔۲

www.ghalibinstitute.com-- E-mail: ghalib@vsnl.net

فہرست

مکتوب الیہم

خطوطِ غالبؔ کے عکس

مکتوب الیہم

حرفِ آغاز

"غالب کے خطوط" کی پہلی جلد مارچ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی تھی۔
غالب کے ماہروں، محققوں اور نقّادوں نے جس طرح اس حقیر کام کی پذیرائی کی اور جس فراخ دلی سے میری حوصلہ افزائی فرمائی اُس کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ان دوستوں کا بھی دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں، جنھوں نے پہلی جلد کی بعض کوتاہیوں کی تشہیر کرکے شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کے بجائے، براہِ راست خطوط لکھ کر اُن کوتاہیوں کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ چوتھی جلد میں استدراک کے عنوان کے تحت اُن حضرات ہی کے حوالے سے تسامحات کی نشان دہی کی جائے گی۔

میں اُن تمام اڈیٹر حضرات کا ممنون ہوں جنھوں نے "غالب کے خطوط" (جلد اول) پر تبصروں کے لیے اپنے رسالوں کے قیمتی صفحات وقف کیے۔

کاظم علی خاں صاحب کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں، جنھوں نے بہت سے قیمتی مشورے دیے۔

میں اپنے عزیز دوست جناب اکبر علی خاں ڈائرکٹر رضا لائبریری رام پور کا ممنون ہوں جنھوں نے نواب امین الدین خاں اور ایک نامعلوم مکتوب الیہ کے نام غالب کے خطوط کے عکس

فراہم کیے۔

غالب کا ایک خط پہلی بار "خیاباں" لکھنؤ، نومبر ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا تھا۔ پوری کوشش کے باوجود "خیاباں" کا یہ شمارہ نہیں مل سکا تھا۔ میری خوش نصیبی کہ ڈاکٹر حنیف نقوی کے پاس یہ رسالہ نکل آیا۔ انھوں نے متعلقہ خط کی نقل فراہم کی جس کی وجہ سے متن کی کئی غلطیاں دُور ہو سکیں۔ میں ڈاکٹر نقوی کا شکر گزار ہوں۔

اگر غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری جناب محمد شفیع قریشی اس کام میں غیر معمولی دلچسپی نہ لیتے تو اس کتاب کی طباعت میں نہ جانے اور کتنی تاخیر ہوتی۔ میں قریشی صاحب، انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب رفعت سروش اور پبلی کیشنز انچارج جناب شاہد ماہلی کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ ان حضرات کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے "غالب کے خطوط" کی دوسری جلد اتنی خوبصورت شائع ہو رہی ہے۔

خلیق انجم
۱۲/۱/۸۵

میر مہدی مجروحؔ

(۱)

میاں!

آج یک شنبے کا دن، ساتویں فروری کی اور شاید بائیسویں جمادی الثانی کی ہے۔ دوپہر کے وقت شیخ مشرف علی، رہنے والے استاد حامد کے کوچے کے، میرے پاس آئے اور انھوں نے تمھارا خط، لکھا ہوا پندرہ جمادی الثانی کا دیا۔ ڈاک کا خط ہرگز مجھ تک نہیں پہنچا اور نہ میں شہر سے کہیں گیا۔ جہاں رہتا تھا وہیں ہوں۔ خدا جانے وہ خط سترد کیوں ہوا؟ بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ تمھارا خط آوے اور میں پھیر دوں؟ تم خود کہتے ہو کہ اُس پر یہ لکھا ہوا آیا کہ مکتوب الیہ یہاں نہیں ہے۔ میں ہوتا اور یہ لکھتا کہ میں نہیں ہوں؟ آگرے اور الور اور کول سے برابر خط چلے آتے ہیں۔

تمھاری والدہ کا مرنا سن کر مجھ کو بڑا غم ہوا۔ خدا تم کو صبر دے۔ اور اُس عفیفہ کو بخشے۔ میرا حقیقی بھائی مرزا یوسف خاں دیوانہ بھی مر گیا۔

کیسا پنسن اور کہاں اُس کا ملنا، یہاں جان کے لالے پڑے ہیں:

ہے موجزن اک قلزمِ خوں، کاش یہی ہو
آتا ہے، ابھی دیکھیے، کیا کیا مرے آگے

اگر زندگی ہے اور پھر مل بیٹھیں گے تو کہانی کہی جائے گی۔ تم کہتے ہو کہ "آیا چاہتا ہوں"۔ اگر آؤ تو بے ٹکٹ کے نہ آنا۔ میر احمد علی صاحب کو لکھتے ہو کہ "یہاں ہیں" مجھ کو نہیں معلوم کہ کہاں

ہیں۔ مجھ سے ملتے تو اچھا کرتے۔ میں مخفی نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں۔ حکام جانتے ہیں کہ یہ یہاں ہے مگر نہ باز پرس و گیر و دار میں آیا ہوں، نہ خود اپنی طرف سے قصد ملاقات کا کیا ہے بہ ایں ہمہ ایمن بھی نہیں ہوں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہے؟

نثر کیا لکھوں گا اور نظم کیا کہوں گا۔ وہ نثر جو تم دیکھ گئے ہو، وہی دو چار ورق اور بھی سیاہ کیے گئے ہیں، بھیجنا ممکن نہیں جب آؤ گے اور مجھ کو جیتا پاؤ گے تو دیکھ لو گے۔

میکش چین میں ہے۔ باتیں بناتا پھرتا ہے۔ سلطان جی میں تھا۔ اب شہر میں آگیا ہے۔ دو تین بار میرے پاس بھی آیا۔ پانچ سات دن سے نہیں آیا۔ کہتا تھا کہ بی بی کو اور لڑکے کو بہرام پور، میر وزیر علی کے پاس بھیج دیا ہے۔ خود یہاں لُوٹ کی کتابیں خریدتا پھرتا ہے۔

میرن صاحب کی خیر و عافیت معلوم ہوئی، مگر نہ معلوم ہوا کہ وہ وہاں مع قبائل ہیں یا تنہا ہیں اگر تنہا ہیں تو قبائل کہاں ہیں؟ تمھارے چھوٹے بھائی کو تو میں جانتا ہوں کہ وہ یہاں ہیں اور اچھی طرح ہیں۔

بڑے بھائی کا حال کیوں نہ لکھا؟ یقین ہے کہ وہ اور تم یک جا ہو۔ گو اُن کو ربط مجھ سے زیادہ نہیں، لیکن فرزند ہونے میں تم اور وہ برابر ہو۔ خط بھیجنے میں تردد نہ کرو اور ڈاک میں بے تامل بھیجا کرو۔ زیادہ، زیادہ۔

یکشنبہ ہفتم فروری ۱۸۵۸ء وقتِ رسیدن نامہ　　　　غالب

(۲)

صاحب!

دو خط تمھارے بہ سبیلِ ڈاک آئے۔ کل دوپہر ڈھلے ایک صاحب اجنبی، سانولے سلونے، ڈاڑھی منڈے، بڑی بڑی آنکھوں والے تشریف لائے۔ تمھارا خط دیا، صرف اُن کی ملاقات کی تقریب میں تھا۔ بارے اُن سے اسم شریف پوچھا گیا۔ فرمایا: "اشرف علی"، قومیت کا استفسار ہوا۔ معلوم ہوا سید ہیں۔ پیشہ پوچھا، حکیم نکلے یعنی حکیم میر اشرف علی۔ میں اُن سے مل کر بہت خوش ہوا۔ خوب آدمی ہیں اور کام کے آدمی ہیں۔

کتنے اوچھے ہو "مصطلحات الشعرا" "مصطلحات الشعرا" بھائی! وہ کتاب تمھاری ہے۔ میں نے غصب نہیں کی۔ میرے پاس مستعار ہے۔ دیکھ چکوں گا بھیج دوں گا۔ تقاضا کیوں کرو۔ میاں محمد افضل تصویر کھینچ رہے ہیں۔ جلدی نہ کرو۔ دیر آید درست آید۔ سرفراز حسین اور میرن صاحب اور میر نصیر الدین کو دعائیں۔

صبح چارشنبہ ہفتم رمضان ۱۲۷۱ھ

۲۱ اپریل ۱۸۵۵ء غالب

(۳)

کیوں یار، کیا کہتے ہو؟ ہم کچھ آدمی کام کے ہیں یا نہیں؟ تمھارا خط پڑھ کر دو سو بار یہ شعر پڑھا:

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک
آتشِ شوق تیز تر گردد

کلو کو مولوی مظہر علی صاحب کے پاس بھیج کر کہلا بھیجا کہ آپ کہیں جائیے گا نہیں، میں آتا ہوں۔ بھلا بھائی! اچھی حکمت کی۔ کیا وہ میرے باپا کے نوکر تھے کہ میں اُن کو بلاتا؟ انھوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ آپ تکلیف نہ کریں، میں حاضر ہوتا ہوں۔ دو گھڑی کے بعد وہ آئے۔ اِدھر کی بات، اُدھر کی بات۔ کوئی انگریزی کاغذ دکھایا، کوئی فارسی خط پڑھوایا۔ اجی کیوں حضرت! آپ میرن صاحب کو نہیں بلاتے؟ صاحب! میں تو اِن کو لکھ چکا ہوں کہ تم چلے آؤ اور ایک مقام کا اُن کا پتا لکھا ہے کہ وہاں ٹھہر کر مجھ کو اطلاع کرو۔ میں شہر میں بلا لوں گا۔ صاحب! اب وہ ضرور آئیں گے۔ آخر کار اُن سے اجازت لے کر اب تم کو لکھتا ہوں کہ اُن سے مختصر یہ کلمہ کہہ دو کہ بھائی، یہ تو مبالغہ ہے کہ روٹی وہاں کھاؤ تو پانی یہاں پیو، یہ کہتا ہوں کہ عید وہاں کرو تو باسی عید یہاں کرو۔

یہ میرا حال سنو کہ بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آ گیا ہے۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینا روزہ کھا کھا کر کاٹا، آیندہ خدا رزاق ہے۔ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔

بس صاحب، جب ایک چیز کھانے کو ہوئی، اگرچہ غم ہی ہو تو پھر کیا غم ہے؟

میر سرفراز حسین کو میری طرف سے گلے لگانا اور پیار کرنا۔ میر نصیر الدین کو دعا کہنا اور شفیع احمد صاحب کو اور میر احمد علی صاحب کو سلام کہنا۔ میرن صاحب کو نہ سلام نہ دعا۔ یہ خط پڑھا دو اور ادھر کو روانہ کرو۔

کیا خوب بات یاد آئی ہے۔ کیوں وہ شہر سے باہر ٹھہریں اور کیوں کسی کے بلانے کی راہ دیکھیں؟ شکرم میں، کرانچی میں، چوپہیے میں یعنی ڈاک میں آئیں۔ بلّی ماروں کے محلے میں میرے مکان پر اُتر پڑیں۔ مرزا قربان بیگ کے مکان میں مولوی مظہر علی رہتے ہیں۔ میرے اُن کے مسکن میں ایک میر خیراتی کی حویلی درمیان ہے، ڈاک کو زنہار کوئی نہیں روکتا۔ یہ صلاح تو ایسی ہے کہ اگر اس خط کے پہنچتے ہی چل دیں تو عید بھی یہیں کریں۔

اپریل ۱۸۵۵ء

(۴)

خوبی دین و دنیا روزی باد۔ میر اشرف علی صاحب نے تمھارا خط دیا۔ وہ جو تم نے لکھا تھا کہ "تیرا خط میرے نام کا میرے ہم نام کے ہاتھ جا پڑا"۔ صاحب! قصور تمھارا ہے۔ کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو، جہاں دوسرا میر مہدی بھی ہو؟ مجھ کو دیکھو کہ میں کب سے دلّی میں رہتا ہوں۔ نہ کوئی اپنا ہم نام ہونے دیا، نہ کوئی اپنا ہم عرف بننے دیا، نہ اپنا ہم تخلّص بہم پہنچایا۔ فقط۔

پنسن کی صورت یہ ہے کہ کوتوال سے کیفیت طلب ہوئی۔ اُس نے اچھی لکھی۔ کل ہفتے کا دن، ساتویں اگست کی، مجھ کو اجرٹن صاحب بہادر نے بلایا۔ کچھ سہل سوال مجھ سے کیے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنخواہ ملے اور جلد ملے، تردّد اگر ہے تو اس میں ہے کہ پندرہ مہینے پچھلے بھی ملتے ہیں یا صرف آیندہ کو مقرر ہوتی ہے۔

غلام فخر الدین خاں کی دو ایک روبکاریاں ہوئی ہیں۔ صورت اچھی ہے۔ خدا چاہے تو رہائی ہو جائے۔

صاحب! ہم نے گھبرا کر اُس تحریرِ فارسی کو تمام کیا۔ دفتر بند کر دیا اور یہ لکھ دیا کہ یکم اگست ۱۸۵۵ء تک میں نے پندرہ مہینے کا حال لکھا اور آیندہ لکھنا موقوف کیا۔ تم کو آگے اس سے لکھا تھا کہ تم اپنے اوراق کا فقرۂ اخیر لکھ بھیجو۔ اب پھر تم کو لکھا جاتا ہے کہ جلد لکھو تاکہ میں اُس کے آگے کی عبارت تم کو لکھ کر بھیج دوں۔ ہاں صاحب! میر اشرف علی صاحب بھی[۲] یہی فرماتے تھے کہ میر سرفراز حسین پانی پت آیا چاہتے ہیں، اگر آجائیں تو مجھ کو اطلاع کرنا۔

یکشنبہ ۸ اگست ۱۸۵۸ء[۴]

(۵)

بھائی!

تم تو لڑکوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ جو ماجرا میں نے سنا تھا، وہ البتہ موجبِ تشویش تھا۔ تمھاری تحریر سے وہ تشویش رفع ہوگئی۔ پھر تم کیوں ہائے واویلا کرتے ہو؟ اوپر کا حاکم موافق ہے۔ ماتحت کا حاکم، جو مخالف تھا، سو گیا۔ پھر کیا قصہ ہے؟[۵]

"قاطع برہان" کے مسودے سب میں نے پھاڑ ڈالے، اس واسطے کہ ہر نظر میں اُس کی صورت بدلتی گئی۔ وہ تحریر بالکل مغشوش ہوگئی۔ ہاں اُس کی نقلیں صاف، کہ جن[۶] میں کسی طرح کی غلطی نہیں، نواب صاحب نے کر لی ہیں۔ ایک میرے واسطے، ایک بھائی[۷] ضیاءالدین خاں کے واسطے میری مِلک کی جو کتاب ہے اُس کی جلد بندھ جائے تو بہ طریقِ مستعار تم کو بھیج دوں گا۔ تم اُس کی نقل لے کر میری کتاب مجھ کو پھیر دینا، اور یہ امر بعد محرم واقع ہوگا۔ مگر یہ یاد رہے کہ جو صاحب اس کو دیکھیں گے، وہ ہرگز نہ سمجھیں گے۔ صرف "برہانِ قاطع" کے نام پر جان دیں گے۔ کئی باتیں جس شخص میں جمع ہوں گی، وہ اس کو مانے گا۔ پہلے تو عالم ہو، دوسرے فنِ لغت کو جانتا ہو، تیسرے فارسی کا علم خوب ہو اور اس زبان سے اُس کو لگاؤ ہو۔ اساتذۂ سلف کا کلام بہت کچھ دیکھا ہو اور کچھ یاد بھی ہو، چوتھے منصف ہو، ہٹ دھرم نہ ہو، پانچویں طبعِ سلیم و ذہنِ مستقیم رکھتا ہو۔ معوج الذہن اور کج فہم نہ ہو۔ نہ یہ پانچ باتیں کسی میں جمع ہوں گی اور نہ کوئی میری محنت کی داد دے گا۔

"فہمایش" کا لفظ میاں بدھا ولد میاں جما اور لالہ گنیشی داس ولد لالہ بھیروں ناتھ کا گھڑا ہوا ہے۔ میری زبان سے کبھی تم نے سنا ہے؟ اب تفصیل سنو۔ امر کے صیغے کے آگے "شین" آتا ہے، تو وہ امر معنی مصدری دیتا ہے اور اس کو "حاصل بالمصدر" کہتے ہیں۔ "سوختن" مصدر، "سوزد" مضارع "سوز" امر "سوزش" حاصل بالمصدر" اسی طرح ہیں۔ "خواہش" و "کاہش" و "گزارش" و "گدازش" و "آرایش" و "پیرایش" و "فرمایش"۔ "فہمیدن" فارسی الاصل نہیں ہے۔ مصدر جعلی ہے۔ "فہم" لفظ عربی الاصل ہے۔ "طلب" لفظ عربی الاصل ہے۔ ان کو موافق قاعدہ تفریس "فہمیدن" و "طلبیدن" کر لیا ہے اور اس قاعدے میں یہ کلیہ ہے کہ لغت اصلی عربی آخر کو امر بن جاتا ہے۔ "فہم" یعنی "بہ فہم" "سمجھ" "طلب" یعنی "بہ طلب" "مانگ" "فہمد" مضارع بنا "طلبد" مضارع بنا۔ خیر یہ فرض کیجیے کہ جب ہم نے مصدر اور مضارع اور امر بنایا تو اب حاصل بالمصدر کیوں نہ بنائیں؟ سنو، حاصل بالمصدر "فہمش" اور "طلبش" ہونا چاہیے۔ "فہم" تھا صیغہ امر فہمد سے نکلا تھا۔ "الف" اور "یے" کہاں سے آیا؟ "فہمائی" تو نہیں ہے۔ جو "فہمایش" درست ہو کہیں "فرمایش" کو اس کا نظیر گمان نہ کرنا۔ وہ مصدر اصلی فارسی "فرمودن" ہے۔ "فرماید" مضارع، "فرمائے" امر حاصل مصدر "فرمایش"۔ ۵

پہلے حکیم میر اشرف علی کو دعا اور بیٹا پیدا ہونے کی مبارک باد۔ میاں میں نے رات کو اپنے عالم سرخوشی میں تاریخی نام کا خیال کیا۔ میر کاظم دین کے بارہ سو پچھتر ہوتے ہیں لیکن یہ اسم بھی مانند لفظ "فہمایش" ٹکسال سے باہر ہے۔

اگست ۱۸۵۸ء[۶]

غالب

(۶)

میاں!

تم کو پنسن کی کیا جلدی ہے؟ ہر بار پنسن کو کیوں پوچھتے ہو؟ پنسن جاری ہو اور میں تم کو اطلاع نہ دوں؟ ابھی تک کچھ حکم نہیں۔ دیکھوں کیا حکم ہو اور کب ہو؟

میرن صاحب جے پور پہنچے۔ تم شاہ پوری بتاتے ہو، شاید سچ یہی ہو۔ ہاں! میر محمود علی اور یہ، بیربر اور ابوالفضل تو تھے، مگر دیکھا چاہیے، درخت جگہ سے اُکھڑ کر بہ دشواری جمتا ہے۔ خلاصہ میری فکر کا یہ ہے کہ اب بچھڑے ہوئے یار کہیں قیامت ہی کو جمع ہوں تو ہوں، سو وہاں کیا خاک جمع ہوں گے۔ سنّی الگ، شیعہ الگ، نیک جدا، بد جدا۔

میر سرفراز حسین کو دعا۔ میر نصیر الدین کو پہلے بندگی، پھر دعا۔ کتاب کا نام "دستنبو" رکھا گیا۔ آگرے میں چھاپی جاتی ہے۔ تم سے تمھارے ہاتھ کے اوراق لکھے لوں گا، تب ایک کتاب تم کو دوں گا۔

روزِ ورودِ نامہ پنج شنبہ، ۷ اکتوبر ۱۸۵۸ء[۲] — از غالب

(۷)

سید صاحب!

تمھارے خط کے آنے سے وہ خوشی ہوئی جو کسی دوست کے دیکھنے سے ہو لیکن زمانہ وہ آیا ہے کہ ہماری قسمت میں خوشی ہی نہیں۔ خط سے معلوم ہوا تو کیا معلوم ہوا کہ ڈھائی سو روپے۔ ان دنوں میں ڈھائی روپے بھی بھاری ہیں، ڈھائی سو کیسے؟ سُبحانَ اللہ باوجود اس تہی دستی کے پھر بھی کہنا پڑتا ہے کہ روپیہ گئے بلا سے۔ آبرو بچی، جان بچی۔ اب میر سرفراز حسین کو چاہیے کہ الور چلے جائیں۔ شاید نئے بندوبست میں کوئی صورت نوکری کی نکل آئے۔ میری دعا کہو اور یہ کہو کہ اپنا حال اور اپنا قصہ اپنے ہاتھ سے مجھ کو لکھیں۔

پنسن کا حال کچھ معلوم ہوا ہو تو کہوں۔ حاکم خط کا جواب نہیں لکھتا۔ عملے میں ہر چند تفحص کیجے کہ ہمارے خط پر کیا حکم ہوا۔ کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ بہ ہر حال، اتنا سنا ہے اور دلائل اور قرائن سے معلوم ہوا ہے کہ میں بے گناہ قرار پایا ہوں اور ڈپٹی کمشنر بہادر کی رائے میں پنسن پانے کا استحقاق رکھتا ہوں۔ بس اس سے زیادہ نہ مجھے معلوم، نہ کسی کو خبر۔

میاں! کیا باتیں کرتے ہو؟ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا؟ روٹی کھانے کو نہیں، شراب

پینے کو نہیں، جاڑے آتے[1] ہیں۔ لحاف توشک کی فکر ہے، کتابیں کیا[2] چھپواؤں گا۔ منشی امید سنگھ اندور والے دلّی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست اُن کو میرے گھر لے آیا۔ انھوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا۔ آگرے میں میرا شاگردِ رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا، اُس کو میں نے لکھا۔ اُس نے اس اہتمام کو اپنے ذمہ لیا۔ مسودہ بھیجا گیا۔ آٹھ آنے فی جلد قیمت ٹھہری۔ پچاس جلدیں منشی امید سنگھ نے لیں۔ پچیس روپے چھاپے خانے میں بہ طریقِ ہنڈوی بھجوا دیے۔ صاحبِ مطبع نے بشمولِ سعیِ منشی ہرگوپال تفتہ چھاپنا شروع کیا۔ آگرے کے حکام کو دکھایا۔ اجازت چاہی[3]۔

حکام نے بہ کمال خوشی اجازت دی۔ پانسو جلد چھاپی جاتی ہے۔ اُس پچاس جلدیں لئے[4] شاید پچیس جلد منشی امید سنگھ مجھ کو دیں گے۔ میں عزیزوں کو بانٹ دوں گا۔ پرسوں خط تفتہ کا آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک فرما چھپنا باقی رہا ہے۔ یقین ہے کہ اسی اکتوبر میں قصہ تمام ہو جائے۔

بھائی! میں نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے اور خاتمے میں اس کی اطلاع دے دی ہے! امین الدین خاں کی جاگیر کے ملنے کا حال اور بادشاہ کی روانگی کا حال کیوں کر لکھتا۔ اُن کو جاگیر اگست میں ملی۔ بادشاہ اکتوبر میں گئے[5]۔ کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا؟ منشی امید سنگھ اندور جانے والے تھے، اگر ختم کر کر مسودہ اُن کے سامنے آگرے نہ بھیج دیتا تو پھر چھپواتا کون[6]؟

اہلِ خطہ کا حال از روے تفصیل مجھ کو کیوں کر معلوم ہو۔ سنتا ہوں کہ دعویِ خون پیش کیا چاہتے ہیں۔ سودا ہو گیا ہے۔ مسودہ ہو رہا ہے۔ بلیک[7] صاحب کے جے پور میں ٹکڑے اُڑ گئے[8]۔ گورنر مدعی نہ ہوئے۔ قصاص نہ لیا، اب ایک ہندوستانی کا قصاص کون لے گا؟

اے سبزۂ سرِ راہ، از جورِ پا چہ نالی
در کیشِ روزگاراں گل خوں بہا ندارد

خیر جو ہوتا[9] ہے ہو رہے گا۔ بعدِ وقوع ہم بھی سن لیں گے۔ تم اتنا کیوں دل جلا رہے ہو؟

اکتوبر ۱۸۵۸ء

(۸)

بھائی!

ایک خط تمھارا پہلے پہنچا اور ایک خط کل آیا۔ پہلے خط میں کوئی امر جواب طلب نہ تھا۔ اگرچہ کل کے خط میں بھی صرف کتابوں کی رسید تھی، لیکن چونکہ دو امر لکھنے کے لائق تھے اس واسطے ایک لفافہ تمھاری پسند کا تمھاری نذر کرنا پڑا۔ پہلا امر یہ کہ آج میر نصیر الدین دوپہر کو میرے پاس آئے تھے۔ اُن کو دیکھ کر دل خوش ہوا۔ تم نے بھی خط میں لکھا تھا کہ میر سرفراز حسین الور گئے[۱] اور میر نصیر الدین بھی کہتے تھے کہ میں اور وہ ایک دن پانی پت سے چلے، وہ اُدھر گئے اور[۲] میں ادھر آیا۔ ظاہرا پارسل کے پہنچنے سے پہلے وہ روانہ ہوئے ہیں۔ اُن کی کتاب رہ گئی اب اُن تک کیوں کر پہنچے گی؟ خدا خیر کرے۔

میاں لڑکے سُنو! میر نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد اعظم[۳] صاحب کی، وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے، اور میں مُرید ہوں اس خاندان کا۔ اس واسطے میر نصیر الدین کو پہلے بندگی لکھتا ہوں اور پھر تمھارے علاقے سے اُن کو[۴] دعا لکھتا ہوں صوفی صافی ہوں اور حضرات صوفیہ حفظِ مراتب ملحوظ رکھتے ہیں:

گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی

یہ جواب ہے تمھارے اُس سوال کا کہ جو پہلے خط میں تم نے لکھا تھا۔ اب کے خط میں تم نے میرن صاحب کی خیر و عافیت کیوں نہ لکھی۔ یہ بات اچھی نہیں۔ میں تو ڈر گیا کہ اگر تمھارے خط میں اُن کو دعا سلام لکھوں گا تو اُن سے تم کاہے کو کہو گے۔ پیرزادہ صاحب یعنی میر نصیر الدین نے اُن کی بندگی مجھ سے کہی ہے۔ واسطے[۵] خدا کے میری دعا ان کو کہہ دینا۔

نومبر ۱۸۵۸ء

(۹)

واہ واہ سید صاحب۔ تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے۔ نثر میں خود نمائیاں کرتے

لگے۔ کئی دن سے تمھارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں، مگر جاڑے نے بے حس و حرکت کر دیا ہے۔ آج جو بہ سبب ابر کے وہ سردی نہیں تو میں نے خط لکھنے کا قصد کیا ہے، مگر حیران ہوں کہ کیا سحر سازی کروں۔ جو سخن پردازی کروں؟ بھائی تم تو اردو کے مرزا قتیل بن گئے ہو، اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رودِ نیل بن گئے ہو۔ کیا قتیل کیا رودِ نیل۔ یہ سب ہستی کی باتیں ہیں، لوستو، اب تمھاری دلّی کی باتیں ہیں۔

چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اُس میں سنگ و خشت و خاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلی ماروں کے دروازے کے پاس کی کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔ شہر کی آبادی کا حکم، خاص و عام، کچھ نہیں[۳]۔ پنسن داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں۔ تاج محل، مرزا قیصر، مرزا جواں بخت کے سالے ولایت علی بیگ جے پوری کی زوجہ، ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہو گئی۔ بادشاہ، مرزا جواں بخت، مرزا عباس شاہ، زینت محل[۴] کلکتے پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہو گی۔ دیکھیے، کیپ میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے از روے قیاس، جیسا کہ دلّی کے خبر تراشوں کا دستور ہے یہ بات اُڑا دی ہے، سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری، شروع سال ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے اور پنسن داروں کو جھولیاں بھر بھر روپیے دیے جائیں گے۔ خیر، آج بدھ کا دن ۲۲ دسمبر کی ہے۔ اب شنبے کو بڑا دن اور اگلے شنبے کو جنوری کا پہلا دن ہے۔ اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کیا ہوا۔ تم اِس خط کا جواب لکھو اور شتاب لکھو۔

میری جان سرفراز حسین[۹]! تم کیا کر رہے ہو اور کس خیال میں ہو۔ اب صورت کیا ہے۔ اور آیندہ عزیمت کیا ہے۔ میر اشرف علی صاحب آپ تو دائر سائر تھے۔ پانی پت میں مقیم کیوں کر ہو گئے، کچھ لکھیے تو میں جانوں۔

میر نصیر الدین کو صرف دعا اور اشتیاقِ دیدار۔

میرن صاحب کہاں ہیں؟ کوئی جائے اور بلا لائے۔ حضرت آئے۔ سلام علیکم، مزاج مبارک،

کہیے، مولوی مظہر علی نے آپ کے خط کا جواب بھیجا یا نہیں؟ اگر بھیجا تو کیا لکھا ہے؟ میں جانتا ہوں کہ میر اشرف علی صاحب اور میر سرفراز حسین کم اور یہ ستم پیشہ میر مہدی بہت آپ کی جناب میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ کیا کروں میں کہیں، تم کہیں۔ وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ کیوں کر تم سے بے ادبیاں کر سکتے۔ إِنْ شَاءَ اللهُ تَعَالَىٰ جب ایک جا ہوں گے تو انتقام لیا جائے گا۔ ہے ہے، کیوں کر ایک جا ہوں گے۔ دیکھیے زمانہ اور کیا دکھائے گا۔ اللہ اللہ اللہ۔

بدھ ۲۲ دسمبر ۱۸۵۸ء

(۱۰)

سید صاحب!

نہ تم مجرم نہ میں گنہگار۔ تم مجبور میں ناچار۔ لو اب کہانی سنو۔ میری سرگذشت میری زبانی سنو۔ نواب مصطفیٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے، سو اُن کی تقصیر معاف ہوئی اور اُن کو رہائی ملی۔ صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہانگیر آباد کی زمین داری اور دلّی کی املاک اور پنشن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ میں بہ مجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا۔ اُن کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا۔ پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ دن و تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں، مگر ہفتے کو گیا، منگل کو آیا۔ آج بدھ دوم فروری ۹ ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے تواں دن ہے۔ انتظار میں تھا کہ تمھارا خط آئے تو اُس کا جواب لکھا جائے۔ آج صبح کو تمھارا خط آیا، دوپہر کو میں جواب لکھتا ہوں :

روز اِس شہر میں ایک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آ کر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے، جو باہر

سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے، اُس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو۔ دو روپیے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس سے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو، کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جماعہ دار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا۔ بھائی! تو مجھے نقشے میں نہ رکھ۔ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ "اسد اللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا، نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نہ نکالا گیا۔ کرنل برن صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے۔" پرسوں یہ عبارت جماعہ دار نے محلے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی میں بھیج دی ہے۔ کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں؟ جو مکان بن چکے ہیں انھیں ڈھا دو اور آیندہ کو ممانعت کا حکم سنا دو اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں، جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بہ قدرِ مقدور نذرانہ دے۔ اُس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے۔ آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھیے شہر کے بسنے کی کون سی مہورت ہے؟ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں؟ اَلْمُلْکُ لِلّٰہِ وَالْحُکْمُ لِلّٰہِ۔

نورِ چشم میر سرفراز حسین اور برخوردار میر نصیر الدین کو دعا اور جناب میرن صاحب کو سلام بھی اور دعا بھی۔ اس میں سے وہ جو چاہیں قبول کر لیں۔

بدھ ۲ فروری ۱۸۵۹ء　　　　غالبؔ

(۱۱)

میری جان!

خدا تجھ کو ایک سو بیس برس کی عمر دے۔ بوڑھا ہونے آیا۔ ڈاڑھی میں بال سفید آ گئے،

مگر بات سمجھی نہ آئی۔ پنسن کے باب میں اُلجھے ہو اور کیا بے جا اُلجھے ہو۔ یہ تو جانتے ہو کہ دلّی کے سب پنسن داروں کو مئی ۱۸۵۷ء عیسوی سے پنسن نہیں ملا۔ یہ فروری ۱۸۵۹ء بائیسواں مہینا ہے۔ چند اشخاص کو اس بائیس مہینے میں سال بھر کا روپیہ بہ طریقِ مدد خرچ مل گیا۔ باقی چڑھے ہوئے روپیے کے باب میں اور آیندہ ماہ بہ ماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں ہوا[۲] تم اب اپنے سوال کو یاد کرو کہ اِس واقعے سے اُس کو کچھ نسبت ہے یا نہیں؟ یہ حضرت کا سوال امیر خسرؔو کی اَملی ہے: چیل البسولا لے گئی تو کاہے سے پٹکول راب۔

علی بخش خاں پچاس روپیے مہینا پاتے تھے۔ بائیس مہینے کے گیارہ سو ہوتے ہیں۔ اُن کو چھے سو روپیے مل گئے۔ باقی روپیہ چڑھا رہا۔ آیندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں۔ غلام حسن[۳] خاں سو روپیے مہینے کا پنسن دار۔ بائیس مہینے کے بائیس سو روپیے ہوتے ہیں۔ اُس کو بارہ سو ملے دیوان کشن لال[۴] کا ڈیڑھ سو روپیے مہینا، بائیس مہینے کے تین[۵] ہزار تین سو ہوتے ہیں۔ اُس کو اٹھارہ سو ملے۔ مثلاً جماعہ دار دس روپیے مہینے کا سک لمبر۔ سال بھر کے ایک سو بیس لے آیا۔ اسی طرح پندرہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے۔ آیندہ کے واسطے کسی کو کچھ حکم نہیں۔ مجھ کو بھر مدد خرچ نہیں ملا۔ جب کئی خط لکھے تو اخیر خط پر صاحب کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ سائل کو بہ طریقِ مدد خرچ سو روپیے مل جائیں۔ میں نے وہ سو روپیے نہ لیے اور پھر صاحب کمشنر بہادر کو لکھا کہ میں باسٹھ روپیے آٹھ آنے مہینا پانے والا ہوں۔ سال بھر کے ساڑھے سات سو روپیے ہوتے ہیں۔ سب پنسن داروں کو سال سال بھر کا روپیہ ملا، مجھ کو سو روپیے کیسے ملتے ہیں؟ مثل اوروں کے مجھے بھی سال بھر کا روپیہ مل جائے۔ ابھی اس میں کچھ جواب نہیں ملا۔

آبادی کا یہ رنگ ہے کہ ڈھنڈورا پٹوا کر ٹکٹ چھپوا کر اجرٹن صاحب بہادر بہ طریقِ ڈاک کلکتے چلتے گئے۔ دلّی کے حمقا، جو باہر پڑے ہوئے ہیں، منھ کھول کر رہ گئے۔ اب جب وہ معاودت کریں گے، تب شاید آبادی ہو گی یا کوئی اور نئی صورت نکل آئے۔

میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین اور میرن صاحب کو دعائیں پہنچیں۔

۹ فروری ۱۸۵۹ء

(۱۲)

میاں!

کیوں تعجب کرتے ہو یوسف مرزا کے خطوط کے نہ آنے سے؟ وہ وہاں اچھی طرح ہے۔ حاکموں کے ہاں آنا جانا، نوکری کی تلاش۔ حسین مرزا صاحب بھی وہیں ہیں۔ وہاں کے حکام سے ملتے ہیں۔ وہاں پنسن کی درخواست کر رہے ہیں۔ ان دونوں صاحبوں کے ہر ہفتے میں ایک دو خط مجھ کو آتے ہیں۔ جواب بھیجتا ہوں۔

بھائی! لکھنؤ میں وہ امن و امان ہے کہ نہ ہندوستانی عمل داری میں ایسا امن و امان ہوگا نہ اس فتنہ و فساد سے پہلے انگریزی عمل داری میں یہ چین ہوگا۔ امرا اور شرفا کی حکام سے ملاقاتیں، بہ قدرِ رتبہ تعظیم و توقیر، پنسن کی تقسیم علیٰ العموم، آبادی کا حکم عام، لوگوں کو کمال لطف اور نرمی سے آباد کرتے جاتے ہیں۔

اور ایک نقل سنو۔ وہاں کے صاحب کمشنر بہادر اعظم نے جو دیکھا کہ عملے میں ہنود بھرے ہوئے ہیں، اہلِ اسلام نہیں ہیں، ہنود کو اور علاقوں پر بھیج دیا اور اُن کی جگہ مسلمانوں کو بھرتی کیا۔ یہ تو آفت دلی ہی پر ٹوٹ پڑی ہے۔ لکھنؤ کے سوا اور سب شہروں میں عمل داری کی وہ صورت ہے جو غدر سے پہلے تھی۔ اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ میں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے: "ٹکٹ آبادی درون شہر دلی بہ شرطِ ادخال جرمانہ"۔ مقدار روپیے کی حاکم کی رائے پر ہے۔ آج پانچ ہزار ٹکٹ چھپ چکا ہے۔ کل اتوار یوم التعطیل ہے۔ پرسوں دوشنبے سے دیکھیے یہ کاغذ کیوں کر تقسیم ہوں۔

یہ تو کیفیت عموماً شہر کی ہے۔ خصوصاً میرا حال سنو۔ بائیس مہینے کے بعد پرسوں کوتوال کو حکم آیا ہے کہ اسد اللہ خاں پنسن دار کی کیفیت لکھو کہ وہ بے مقدور اور محتاج ہے یا نہیں۔ کوتوال نے موافق ضابطے کے مجھ سے چار گواہ مانگے ہیں۔ سو کل چار گواہ کوتوالی چبوترے جائیں گے اور میری بے مقدوری ظاہر کر آئیں گے۔ تم کہیں یہ نہ سمجھنا کہ بعد ثبوت مفلسی چڑھا ہوا روپیہ مل جائے گا اور آیندہ کو پنسن جاری ہو جائے گا۔ نہ صاحب، یہ تو ممکن ہی نہیں۔ بعد ثبوت افلاس

مستحق ٹھہروں گا چھے مہینے یا برس دن کا روپیہ علی الحساب پانے کا۔

میرن صاحب، جو بلائے گئے ہیں، اُس طلب کے جواب میں یہی کیوں نہیں لکھتے کہ ٹکٹ میرے نام کا حاصل کرکر بھیج دو تو میں آؤں۔ دیکھو اب دس پانچ دن میں سب حال کھلا جاتا ہے۔ میر سرفراز حسین کو دعا کہنا اور میری طرف سے گلے لگانا اور پیار کرنا۔ میر نصیر الدین کو دعا کہنا۔ اور میرن صاحب کو مبارک باد کہنا۔

فروری ۱۸۵۹ء

(۱۳)

میری جان سُوداستان، صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی جناب سانڈرس صاحب بہادر نے مجھ کو بلایا۔ پنجشنبہ، ۲۴ فروری کو میں گیا۔ صاحب شکار کو سوار ہو گئے تھے۔ میں اُلٹا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵ فروری کو گیا۔ ملاقات ہوئی، کرسی دی۔ بعد پرسش مزاج کے ایک خط انگریزی چار ورق کا اُٹھا کر پڑھتے رہے۔ جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے میکلوڈ صاحب حاکم اکبر صدر بورڈ پنجاب کا تمھارے باب میں، لکھتے ہیں کہ اُن کا حال دریافت کرکر لکھو۔ سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکۂ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو؟ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمد ولایت لے گیا تھا، وہ پڑھوا دیا۔ پھر پوچھا تم نے کتاب کیسی لکھی ہے؟ اس کی حقیقت بیان کی، کہا: "ایک میکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے اور ایک ہم کو دو۔" میں نے عرض کیا: "کل حاضر کروں گا۔" پھر پنسن کا حال پوچھا، وہ بھی گزارش کیا۔ اپنے گھر آیا اور خوش آیا۔

دیکھو میر مہدی حاکم پنجاب کو مقدمہ ولایت کی کیا خبر؟ کتابوں سے کیا اطلاع؟ پنسن کی پرسش سے کیا مدعا؟ یہ استفسار بہ حکم نواب گورنر جنرل بہادر ہوا ہے اور یہ صورت مقدمۂ فتح و فیروزی ہے۔ غرض کہ دوسرے دن یک شنبہ یوم التعطیل تھا، میں اپنے گھر رہا، دوشنبہ، ۲۸ فروری کو گیا۔ باہر کے کمرے میں بیٹھ کر اطلاع کروائی، کہا "اچھا! توقف کرو۔" بعد تھوڑی دیر کے گڑھ کپتان کی چھٹی آئی، سواری مانگی، جب سواری آگئی، باہر نکلے۔ میں نے کہا وہ کتابیں حاضر ہیں۔ کہا، منشی جیون لال کو دے جاؤ۔ وہ اُدھر سوار ہو گئے، میں اِدھر سوار ہو کر اپنے مکان

پر آیا۔ سہ شنبہ، یکم مارچ کو پھر گیا۔ بہت التفات اور اختلاط سے باتیں کرتے رہے۔ کچھ ساری فکٹ گورنروں کے لے گیا تھا، وہ دکھائے۔ ایک خط میکلوڈ صاحب بہادر کے نام کا لے گیا تھا، وہ دے کر یہ استدعا کی کہ کتاب کے ساتھ یہ بھی بھیجا جائے۔" بہت اچھا" یہ کہ کر رکھ لیا۔ پھر مجھ سے کہا کہ ہم نے تمھارے پنسن کے باب میں اجرٹن صاحب کو کچھ لکھا ہے۔ تم اُن سے ملو۔" عرض کیا، بہتر۔ اجرٹن صاحب بہادر جیسا کہ تم کو معلوم تھا، گئے ہوئے تھے۔ کل وہ آئے۔ آج میں نے اُن کو خط لکھا ہے۔ جیسا کہ وہ حکم دیں گے اُس کے موافق عمل کروں گا۔ جب بلائیں گے، تب جاؤں گا۔ دیکھو سیّد اسد اللہ الغالب علیہ السّلام کی مدد کو کہ اپنے غلام کو کس طرح سے بچایا۔ بائیس مہینے تک بھوکا پیاسا بھی نہ رہنے دیا۔ پھر کس محکمے سے کہ وہ آج سلطنت کا دہندہ ہے، میرے تفقّد کا حکم بھجوایا۔ حکام سے مجھ کو عزّت دلوائی۔ میرے صبر و ثبات کی داد ملی۔ صبر و ثبات بھی اسی کا بخشا ہوا تھا، میں کیا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا؟ میر سرفراز حسین کو یہ خط پڑھا دینا اور اُن کو اور نصیر الدین چراغ دہلی کو اور میرن صاحب کو دعا کہنا۔

مارچ ۱۸۵۹ء

(۱۴)

میر مہدی!

جیتے رہو، آفریں، صد ہزار آفریں۔ اردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا۔ سنو، دلّی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطے میں گئی ہے۔ یہ طرزِ عبارت خاص میری دولت تھی، سو ایک ظالم پانی پت، انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا، مگر میں نے اُس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے۔

میرے پنسن اور ولایت کے انعام کا حال کماہو حقہ سمجھ لو وَلِلّٰہِ سُبْحَانَہٗ اَلْطَافٌ خَفِیَّۃٌ۔ ایک طرزِ خاص پر تحریک ہوئی۔ سر رشتہ کی پابندی ضرور ہے۔" نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکم

پنجاب کو لکھا کہ حاکمِ دہلی سے فلاں شخص کے پنسن کے کُل چڑھے ہوئے روپیے کے یک مُشت پانے کی اور آیندہ ماہ بہ ماہ روپیہ ملنے کی رپوٹ منگوا کر، اپنی منظوری لکھ کر ہمارے پاس بھیج دو تا کہ ہم حکمِ منظوری دے کر تمھارے پاس بھیج دیں۔ سو یہاں اُس کی تعمیل فوراً بہ طرزِ مناسب ہوگئی۔ کم و بیش دو مہینے میں روپیہ سب مل جائے گا اور ہاں صاحب کمشنر بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو ضرورت ہو تو سو روپیے تحزلنے سے منگوالو۔ میں نے کہا: صاحب! یہ کیسی بات ہے کہ اوروں کو برس دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپیے دلواتے ہو؟ فرمایا کہ "تم کو اب چند روز میں سب روپیہ اور اجرا کا حکم مل جائے گا، اوروں کو یہ بات شاید برسوں میں میسر آئے گی۔" میں چپ ہو رہا۔ آج دوشنبہ، یکم شعبان اور ہفتم مارچ ہے۔ دوپہر ہو جائے تو اپنا آدمی مع رسید بھیج کر سو روپیے منگالوں۔ پیر یار ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے۔ حکم تو اسی حکم کے ساتھ اُس کی رپوٹ کرنے کا بھی آیا ہے، مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو۔ اب دیکھیے یہ دو حاکم یعنی حاکمِ دہلی اور حاکمِ پنجاب اپنی رائے کیا لکھتے ہیں۔

حاکمِ پنجاب کو گورنر بہادر کا یہ بھی حکم ہے کہ "دستنبو" منگا کر، اور تم دیکھ کر، ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اُس میں کیا لکھا ہے۔" چنانچہ حاکمِ دہلی نے ایک کتاب مجھ سے یہی کہہ کر مانگی اور میں نے دی۔ اب دیکھوں حاکمِ پنجاب کیا لکھتا ہے۔

اِس وقت تمھارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا۔ مجھ کو جو باتیں کرنے کا مزا ملا تو دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانہ کیا۔ اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔

میر سرفراز حسین، میرن صاحب اور میر نصیر الدین کو دعا۔

دوشنبہ، ہفتم مارچ ۱۸۵۹ء
یکم شعبان ۱۲۷۵ھ

(۱۵)

سید!
خدا کی پناہ! عبارت لکھنے کا ڈھنگ بات کیا آیا ہے کہ تم نے سارے جہاں کو سر پر اُٹھایا

ہے۔ ایک غریب سید مظلوم کے چہرۂ نورانی پر مہاسا نکلا ہے۔ تم کو سرمایۂ آرایشِ گفتار بہم[1] پہنچا ہے۔ میری اُن کو دعا پہنچاؤ اور اُن کی خیر و عافیت جلد لکھو۔

بھائی! یہاں[2] کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ سمجھ میں کسی کے نہیں آتا کہ کیا طور ہے۔ اوائل ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہوتی تھی۔ آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی۔ اس مہینے میں برابر[3] وہی صورت رہی ہے۔ آج ستائیس مارچ کی ہے۔ پانچ چار دن مہینے میں باقی ہیں۔ آنچ ویسی ہی تیز ہے۔ خدا اپنے بندوں پر رحم کرے۔

مجھ پر میرے[4] اللہ نے ایک اور عنایت کی ہے اور اس غم زدگی میں ایک گونہ خوشی اور کیسی بڑی خوشی دی ہے۔ تم کو یاد ہو گا کہ ایک "دستنبو" نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی نذر، اور دوسری گورنر جنرل بہادر کلکتہ کی نذر بھیجی تھی۔ آج پانچواں دن ہے کہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کا خط مقام الہ آباد سے بہ سبیل ڈاک آیا۔ وہی کاغذ افشانی، وہی القاب قدیم، کتاب کی تعریف، عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات۔ کبھی تم کو خدا یہاں لائے گا تو اس کی زیارت کرنا۔

پنسن کے ملنے کا بھی حکم آج کل آیا چاہتا ہے اور یہ بھی توقع پڑی ہے کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں[5] سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے۔ میرن صاحب کو سلام پہلے لکھ چکا ہوں۔ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین کو دعا کہہ دینا اور یہ خط دکھا دینا۔

۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء[9]

(۱۶)

مار ڈالا یار، تیری جواب طلبی نے۔ اِس چرخِ کج رفتار کا بُرا ہو، ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک و مال و جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا، چند مفلس و بے نوا[1] ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے:

سو بھی نہ تو کوئی دم، دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا، ایک مگر دیکھنا

یاد رہے یہ شعر خواجہ میر دردؔ کا ہے۔

کل سے مجھ کو میکشؔ بہت یاد آتا ہے، سو صاحب، اب تم ہی بتاؤ کہ میں تم کو کیا لکھوں؟ وہ صحبتیں اور تقریریں جو یاد کرتے ہو اور تو کچھ بن نہیں آتی، مجھ سے خط پر خط لکھواتے ہو۔ آنسوؤں پیاس نہیں بجھتی۔ یہ تحریر تلافی اُس تقریر کی نہیں کرسکتی۔ بہ ہر حال کچھ لکھتا ہوں، دیکھو کیا لکھتا ہوں۔

سنو، پنشن کی رپوٹ کا ابھی کچھ حال نہیں معلوم — دیر آید درست آید۔ بھئی میں تم سے بہت آزردہ ہوں۔ میرن صاحب کی تندرستی کے بیان میں نہ اظہارِ مسرت، نہ مجھ کو تہنیت، بلکہ اس طرح سے لکھا ہے کہ گویا اُن کا تندرست ہونا تم کو ناگوار ہوا ہے۔ لکھتے ہو کہ میرن صاحب ویسے ہی ہو گئے جیسے آگے تھے۔ اُچھلتے کودتے پھرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی کہ ہے ہے، کیا غضب ہوا کہ یہ کیوں اچھے ہو گئے۔ یہ باتیں تمھاری ہم کو پسند نہیں آتیں۔ تم نے میرؔ کا وہ مقطع سنا ہوگا۔ بتغیرِ الفاظ لکھتا ہوں:

یوں نہ میرن کو مغتنم جانوں
دلّی والوں میں اِک بچا ہے یہ

میر تقی کا مقطع یوں ہے:

میرؔ کو کیوں نہ مغتنم جانیں
اگلے لوگوں میں اِک رہا ہے یہ

"میرؔ" کی جگہ "میرن" اور "رہا" کی جگہ "بچا" کیا اچھا تصرف ہے!

ارے میاں! تم نے کچھ اور بھی سُنا؟ کل یوسف مرزا کا خط لکھنؤ سے آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ نصیر خاں عرف نواب جان، والد اُن کا دائم الحبس ہو گیا۔ حیران ہوں کہ یہ کیا آفت آئی۔ یوسف مرزا تو جھوٹ کاہے کو لکھے گا۔ خدا کرے اُس نے جھوٹ سنا ہو۔

لو بھئی، اب تم چاہو بیٹھے رہو، چاہو اپنے گھر جاؤ، میں تو روٹی کھانے جاتا ہوں۔ اندر باہر سب روزہ دار ہیں۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی۔ صرف ایک میں اور ایک میرا پیارا بیٹا حسین علی خاں، یہ ہم روزہ خوار ہیں۔ وہی حسین علی خاں جس کا روزمرہ ہے "کھلونے منگا دو، میں بھی بجار جاؤں گا" میر سرفراز حسین،

کو دعا کہنا اور یہ خط اُن کو ضرور سُنا دینا۔ برخوردار میر نصیر الدین کو دعا پہنچے۔

اپریل ۱۸۵۹ء

(۱۷)

برخوردار کامگار میر مہدی!

قطعہ تم نے دیکھا؟ سچ سچ میرا حُلیہ ہے۔ واہ اب کیا شاعری رہ گئی ہے۔ جس وقت میں نے یہ قطعہ وہاں کے بھیجنے کے واسطے لکھا، ارادہ تھا کہ خط بھی لکھوں۔ لڑکوں نے ستایا کہ دادا جان چلو کھانا تیار ہے، ہمیں بھوک لگی ہے۔ تین خط اور لکھے ہوئے رکھے تھے۔ میں نے کہا کہ اب کیوں لکھوں۔ اُسی کاغذ کو لفافے میں رکھ کر، ٹکٹ لگا، سرنامہ لکھ، کلیان کے حوالے کر، گھر میں چلا گیا اور ہاں، ایک چھیڑ بھی تھی کہ دیکھوں میرا میر مہدی خفا ہو کر کیا باتیں بناتا ہے، سو وہی ہوا تم نے جَلے پھپھولے پھوڑے۔ لو، اب بتاؤ، خط لکھنے بیٹھا ہوں، کیا لکھوں۔ یہاں کا حال، زبانی میرن صاحب کی سُن لیا ہوگا، مگر وہ جو کچھ تم نے سنا ہوگا، بے اصل باتیں ہیں۔ پنسن کا مقدمہ کلکتے میں نواب گورنر جنرل بہادر کے پیشِ نظر یہاں کے حاکم نے اگر ایک روبکاری لکھ کر اپنے دفتر میں رکھ چھوڑی، میرا اُس میں کیا ضرر۔

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ دو ایک آدمی آ گئے، دن بھی تھوڑا رہ گیا۔ میں نے بکس بند کیا۔ باہر تخنوں پر آ بیٹھا۔ شام ہوئی، چراغ روشن ہوا۔ منشی سیّد احمد حسین سرہانے کی طرف مونڈھے پر بیٹھے ہیں۔ میں پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں کہ ناگاہ چشم و چراغ دودمانِ علم و یقین سیّد نصیر الدین آیا۔ ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ، اُس کے سر پر ایک ٹوکرا اُس پر گھاس ہری بچھی ہوئی۔ میں نے کہا۔ آہا ہا، سلطان العلما مولانا سرفراز حسین دہلوی نے دوبارہ رسد بھیجی ہے بارے معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہے یہ کچھ اور ہے۔ فیضِ خاص نہیں لطفِ عام ہے، یعنی شراب نہیں آم ہے۔ خیر، یہ عطیہ بھی بے خلل ہے بلکہ نعم البدل ہے۔ ایک ایک آم کو ایک ایک سربمہر گلاس سمجھا، لیکوڑ سے بھرا ہوا مگر واہ کس حکمت سے بھرا ہے کہ باوجودیکہ گلاس میں سے ایک قطرہ نہیں

بُرا ہے۔ میاں کہتا تھا کہ یہ اسّی تھے۔ پندرہ بگڑ گئے، بلکہ سڑ گئے۔ تا اُن کی بُرائی اوروں میں سرایت نہ کرے، ٹوکرے میں سے پھینک دیے۔ میں نے کہا، بھائی، یہ کیا کم ہے؟ مگر میں تمھاری تکلیف اور تکلف سے خوش نہیں ہوا۔ تمھارے پاس روپیہ کہاں، جو تم نے آم خریدے؟ خانہ آباد دولت زیادہ۔

لکیور کے معنی تم نہ سمجھے ہوگے؟ ایک انگریزی شراب ہوتی ہے۔ قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی، جیسا قند کا قوام پتلا۔ دیکھو، اس لغت کے معنی کسی فرہنگ میں نہ پاؤ گے۔ ہاں فرہنگ سروری میں ہوں تو ہوں۔

مجتہد العصرؒ اور حکیم میر اشرف علی کو، کہ وہ ان کے علم کی کنجی ہیں اور ٹکے ٹکے کی کتابیں چالیس پچاس روپے کو لے گئے ہیں، میری دعا کہہ دینا۔

مرقومۂ چہار شنبہ ششم جولائی ۱۸۵۹ء

(۱۸)

میری جان!

تم کو تو بے کاری میں خط لکھنے کا ایک شغل ہے۔ قلم دوات لے بیٹھے۔ اگر خط پہنچا ہے تو جواب ورنہ شکوہ و شکایت و عتاب و خطاب لکھنے لگے۔ کل حکیم میر اشرف علی آئے تھے۔ سر منڈوا ڈالا ہے۔ "مُحَلِّقِیْنَ رُؤسَکُم" پر عمل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ سر منڈوایا ہے تو ڈاڑھی رکھو۔ کہنے لگے: "دامن از کجا آرم کہ جامہ نہ دارم"۔ واللہ، اُن کی صورت قابل دیکھنے کے ہے۔ کہتے تھے کہ میر احمد علی صاحب آگئے اور بحال و برقرار رہے۔ خدا کا شکر بجا لایا۔ کبھی تو ایسا بھی ہو کہ کسی عزیز کی اچھی خبر سُنی جائے۔ میرا سلام کہنا اور مبارک باد دینا۔ خبردار بھول نہ جائیو۔ تمھاری شکایت ہائے بے جا کا جواب یہ ہے کہ تم نے جو خط پانی پت سے بھیجا تھا اور کرنال کی روانگی کی اطلاع دی تھی، میں نے تجویز کر لیا تھا کہ جب کرنال سے خط آئے گا، تو میں جواب لکھوں گا۔ آج شنبہ، ۱۵ اکتوبر، صبح کا وقت، ابھی کھانا پکا بھی نہیں۔ تبریدپی کر بیٹھا تھا کہ تمھارا خط آیا،

اور پڑھا اور یہ جواب لکھا۔ کلیان بیمار ہے۔ ایاز کو خط دے کر ڈاک گھر روانہ کیا۔ بولو، تمھارا گلہ بے جا یا بجا؟ بھائی گلہ کرو تو اپنے سے کرو کہ تم نے کرنال پہنچ کر خط لکھنے میں کیوں دیر کی، اور ہاں، یہ کیا سبب ہے کہ بہت دن سے میر نصیر الدین کا نام تمھارے قلم سے نہیں نکلتا؟ نہ اُن کی خیر و عافیت نہ اُن کی بندگی۔ اگر وہ مجھ سے خفا ہیں تو اُن کی بندگی نہ لکھتے مگر خیر و عافیت تو لکھتے، یہ باتیں اچھی نہیں۔

میرن صاحب کے باب میں حیران ہوں، تنہا تمھارے ساتھ گئے ہیں۔ والدہ اُن کی پانی پت میں ہیں۔ وہاں کوئی مکان لے کر والدہ کو وہیں بلائیں گے یا خود بعد چند روز کے یہاں آجائیں گے؟ یہ دو باتیں جواب طلب ہیں۔ میر نصیر الدین کی بندگی نہ لکھنے کا سبب اور میرن صاحب کی بود و باش کی حقیقت لکھو۔

رہا میرا پنسن، اس کا ذکر نہ کرو، اگر ملے گا تو تم کو اطلاع دی جائے گی۔ شہر کی آبادی کا چرچا ہوا۔ کرایے کو مکان ملنے لگے ــ چار پانسو گھر آباد ہوئے تھے کہ پھر وہ قاعدہ مٹ گیا۔ اب خدا جانے کیا دستور جاری ہوا ہے، آیندہ کیا ہوگا؟

سلطان العلما مجتہد العصر مولوی سید سرفراز حسین کو اگر چہ، نظر اُن کے مدارج علم و عمل پر، بندگی چاہیے، مگر خیر میں عزیزداری و یگانگی کی راہ سے دعا لکھتا ہوں۔ میرن صاحب کو دعا اور بعد دعا کے بہت سا پیار۔ میر نصیر الدین کو دُعا۔ زیادہ کیا لکھوں۔

شنبہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۵۹ء

(۱۹)

بھائی!

نہ کاغذ ہے نہ ٹکٹ ہے۔ اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتاب میں سے یہ کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں اور بیرنگ لفافے میں لپیٹ کر بھیجتا ہوں۔ غمگین نہ ہونا، کل شام کو کچھ فتوح کہیں سے پہنچ گئی ہے۔ آج کاغذ و ٹکٹ منگا لوں گا۔ سہ شنبہ ۸ نومبر صبح کا

وقت ہے جس کو عوام بڑی فجر کہتے ہیں۔ پرسوں تمہارا خط آیا تھا آج جی چاہا کہ ابھی تم کو خط لکھوں اس واسطے یہ چند سطریں لکھیں۔

برخوردار میر نصیر الدین پر اُن کی بیٹی کا قدم مبارک ہو۔ نام تاریخی تو مجھ سے ڈھونڈا نہ جائے گا، ہاں عظیم النسا بیگم نام اچھا ہے کہ اس میں ایک رعایت ہے، شاہ محمد عظیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام کی۔ مجتہد العصر کو میری دعا کہنا۔ تم کو کیا ہوا ہے کہ تم اُن کو اپنا چھوٹا بھائی جان کر مجتہد العصر نہیں لکھا کرتے، یہ بے ادبی اچھی نہیں۔ میرن صاحب کو بہت بہت دعا کہنا اور میری طرف سے پیار کرنا۔

شہر کا حال میں کیا جانوں کیا ہے؟ "پون ٹوٹی" کوئی چیز ہے وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔

جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ "دار البقا" فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ، شاہ بولا کے بڑ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑہ چل رہا ہے۔ باقی خیر و عافیت ہے۔

حاکم اکبر کی آمد آمد سن رہے ہیں۔ دیکھیے دلی آئیں یا نہیں۔ آئیں تو دربار کریں یا نہیں۔ دربار کریں تو میں گنہگار بلایا جاؤں یا نہیں۔ بلایا جاؤں تو خلعت پاؤں یا نہیں۔ پنسن کا تو نہ کہیں ذکر ہے نہ کسی کو خبر ہے۔

شنبہ ۸ نومبر ۱۸۵۹ء

غالب

(۲۰)

میری جان!

تو کیا کہہ رہا ہے؟ بنیے سے سیانا سو دیوانہ۔ صبر و تسلیم و توکل و رضا شیوہ صوفیہ کا ہے۔ مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا، جو تم مجھ کو سمجھاتے ہو؟ کیا میں یہ جانتا ہوں کہ ان لڑکوں کی پرورش میں کرتا ہوں؟ اَستَغفِرُاللہ، لَامُؤَثِّرَ فِی الوُجُودِ اِلَّا اللہ۔ یا تم یہ سمجھے ہو کہ میں شیخ چلّی کی طرح سے

یہ خیال باندھتا ہوں کہ مرغی مول لوں گا اور اُس کے انڈے بچے بیچ کر بکری خرید دں گا اور پھر کیا کروں گا اور آخر کیا ہوگا؟ بھائی! یہ تو میں نے اپنا رازِ دل تم سے کہا تھا کہ آرزو یوں تھی اور اب وہ نقش باطل ہوگیا۔ ایک حسرت کا بیان تھا، نہ خواہش کا۔

دیکھا، اس پنسن قدیم کا حال؛ میں تو اس سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں، لیکن جب تک جواب نہ پاؤں، کہیں اور کیوں کر چلا جاؤں؟ حاکمِ اکبر کے آنے کی خبر گرم ہے[1]۔ دیکھیے کب آئے؟ آئے تو مجھے بھی دربار میں بلائے یا نہ بلائے؟ خلعت ملے یا نہ ملے؟ اس[2] پیچ میں ایک اور پیچ آپڑا ہے۔ اُس کو دیکھ لوں اور پھر صرف اسی کا انتظار نہیں۔

اِس مرحلے کے طے ہونے کے بعد پنسن کے ملنے نہ ملنے کا تردد بہ دستور رہے گا۔ سبک سیر یوں کر بن جاؤں کہ یہ سب امور ملتوی چھوڑ کر نکل جاؤں؟ پنسن جاری ہوئے پر بھی تو سوا رام پور[3] کے کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ وہاں تو جاؤں اور ضرور جاؤں۔ تین برس ثباتِ قدم اختیار کیا اب انجامِ کار میں اضطراب کی کیا وجہ؟ چپکے ہو رہو اور مجھ کو کسی عالم میں غمگین اور مضطر گمان نہ کرو۔ ہر وقت میں جیسا مناسب ہوتا ہے ویسا عمل میں آتا ہے۔

صاحب! یہ میرن صاحب نے[4] جو دو سطریں دستخطِ خاص سے لکھی[5] تھیں، واللہ میں کچھ نہیں سمجھا کہ یہ کس مقدمے کا ذکر ہے۔

نومبر ۱۸۵۹ء[6]

(۲۱)

بھائی!

کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی[7]۔ قلعہ، چاندنی[8] چوک، ہر روزہ[9] بازار مسجد جامع کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پُل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلّی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمروِ ہند میں اس نام کا تھا۔

نواب گورنر جنرل بہادر پندرہ دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھیے کہاں اُترتے ہیں۔

اور کیوا ۔ دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں[1] میں سات جاگیردار تھے کہ اُن کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو۔ چار معدوم محض، تین جو باقی رہے اس میں سے دوجانہ و لوہارو تحتِ حکومت ہانسی۔ حصار، پاٹودی حاضر۔ اگر ہانسی حصار کے[3] صاحب[4] کمشنر بہادر، اُن دونوں کو یہاں لے آئے[5] تو تین رئیس، ورنہ ایک رئیس بس[6]۔ رہے[7] دربارِ عام والے مہاجن لوگ، سب موجود۔ اہلِ اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفےٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں[9]۔ بلی ماروں میں سگِ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود و مطرود و محروم و مغموم۔

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

تم آتے ہو، چلے آؤ۔ جاں نثار خاں[10] کے چھتے کی سڑک، خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھہنا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان نکلنا سُن جا۔ غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ، چلے جاؤ[11]۔

مجتہد العصر میر سرفراز[12] حسین کو دعا۔ حکیم الملک حکیم میر اشرف علی کو دعا۔ قطب الملک میر نصیر الدین کو دعا۔ یوسفِ ہند میر افضل علی کو دعا۔

مرقومۂ صبح جمعہ ۶ جمادی الاوّل ۱۲۷۶ء[13]

۲۰ دسمبر ۱۸۵۹ء

(۲۲)

بے مے نکند در کفِ من خامہ روائی
سرد است ہوا، آتشِ بے دود کجائی[14]

میر مہدی!

صبح کا وقت ہے، جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں،

آگ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ[1] میں گرمی سہی، مگر ہائے وہ[2] آتشِ سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے، فوراً رگ و پے میں دوڑ[3] گئی، دل توانا ہوگیا، دماغ روشن ہوگیا۔ نفسِ ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقیِ کوثر کا بندہ اور تشنہ لب! ہائے غضب! ہائے غضب[4]!

میاں! تم پنسن، پنسن کیا کر رہے ہو؟ گورنر جنرل کہاں اور پنسن کہاں؟ صاحب[5] ڈپٹی کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر، نواب لفٹنٹ گورنر بہادر، جب اِن تینوں نے جواب دیا ہو تو اُس کا مرافعہ گورمنٹ میں کروں، مجھے تو دربار و خلعت کے لالے پڑے ہیں، تم کو پنسن کا فکر ہے۔ یہاں کے حاکم نے میرا نام دربار کی فرد میں نہیں لکھا۔ میں نے اس کا اپیل نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کے ہاں کیا ہے:

دیکھیے، کیا جواب آتا ہے

بہ ہر حال جو کچھ ہوگا تم کو لکھا جائے گا۔

اجی! وہ یوسفِ ہند نہ سہی، یوسفِ دہر سہی، یوسفِ عصر سہی، یوسفِ ہفت[8] کشور سہی۔ اُن کی زلیخا نے ستم برپا کر رکھا ہے۔ مجھے تو خبر نہیں، کہیں حضرت کہہ گئے ہیں کہ میں[9] ساڑھے سات روپے مہینا[10] بھیجے جاؤں گا۔ اب اُس[11] کا تقاضا ہے۔ رحیم بخش روز آتا ہے اور کہتا ہے کہ پھوپھا جان کو لکھو کہ پھوپھی جان بھوکی مرتی ہیں۔ خرچ جلد بھیجو، ورنہ نالش کی جائے گی اور تم کو گواہ قرار دیا جائے گا۔ بہ ہر حال میرن صاحب کو یہ عبارت پڑھوا دینا۔ میر سرفراز حسین کو دعا، میر نصیر الدین کو دعا، حکیم میر اشرف علی کو دعا۔ یوسفِ ہفت کشور کو دعا۔

سہ شنبہ ۱۴ دسمبر ۱۸۵۹ء[12]

(۲۳)

میاں لڑکے!

کہاں پھر رہے ہو؟ ادھر آؤ، خبریں سنو۔ دربار لارڈ[13] صاحب کا میرٹھ میں ہوا۔ دلی کے علاقے کے جاگیردار بہ موجب حکم کمشنر دہلی، میرٹھ گئے۔ موافق دستورِ قدیم مل آئے۔ غرض کہ پنجشنبہ

۲۹ دسمبر کو پہر دن چڑھے لارڈ صاحب یہاں پہنچے۔ کابلی دروازے کی فصیل کے تلے ڈیرے[1]
ہوئے۔ اُسی وقت توپوں کی آواز سنتے ہی میں سوار ہو کر گیا۔ میر منشی سے ملا۔ اُن کے خیمے
میں بیٹھ کر صاحب سکرتر کو خبر کروائی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ یہ جواب سُن کر نومیدی کی پوٹ
باندھ کرلے آیا۔ ہر چند پنسن کے باب میں ہنوز لاونعم نہیں، مگر کچھ فکر کر رہا ہوں۔ دیکھوں کیا
ہوتا ہے۔ لارڈ صاحب کل یا پرسوں جانے والے ہیں۔ یہاں کچھ کلام و پیام نہیں ممکن۔ تحریر
ڈاک میں بھیجی جائے گی۔ دیکھیے کیا صورت درپیش آئے گی۔

مسلمانوں کی املاک کی واگذاشت کا حکم عام ہو گیا ہے جن کو کرایے پر ملی ہے اُن کو کرایہ معاف
ہو گیا ہے۔ آج یک شنبہ، یکم جنوری ۱۸۶۰ء ہے۔ پہر دن چڑھا ہے کہ یہ خط تم کو لکھا ہے۔ اگر
مناسب جانو تو آؤ۔ اپنی املاک پر قبضہ پاؤ۔ چاہو یہیں رہو۔ چاہو پھر چلے جاؤ۔ میر سرفراز حسین
میر نصیر الدین میرن صاحب کو میری دعائیں کہنا اور حکیم میر اشرف علی کو بعد دعا کے یہ کہہ دینا کہ وہ حبوب
جو تم نے مجھ کو دی تھیں، اُن کا نسخہ جلد لکھ کر بھیج دو۔ اللہ موجود، ماسویٰ معدوم۔

یکشنبہ یکم جنوری ۱۸۶۰ء[2] اپنی مرگ کا طالب غالب

(۲۴)

اہا ہا ہا! میرا پیارا میر مہدی آیا۔ آؤ بھائی، مزاج تو اچھا ہے؟ بیٹھو، یہ رام پور ہے۔
دار السرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے؟ پانی، سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم
پر ایک دریا ہے اور کوسی اُس کا نام ہے۔ بے شبہہ چشمۂ آبِ حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر،
اگر یوں بھی ہے تو بھائی آبِ حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا۔

تمھارا خط پہنچا۔ تردّد عبث۔ میرا مکان ڈاک گھر کے قریب اور ڈاک منشی میرا دوست
ہے، نہ عُرف لکھنے کی حاجت، نہ محلے کی حاجت۔ بے وسواس خط بھیج دیا کیجے اور جواب لیا
کیجے۔ یہاں کا حال سب طرح خوب ہے[3] اور صحبت مرغوب ہے۔ اس وقت تک مہمان ہوں۔
دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہے۔ لڑکے دونوں میرے

ساتھ آئے ہیں۔ اِس وقت اِس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔

فروری ۱۸۶۰ء[1]

(۲۵)

میر مہدی!

تم میرے عادات کو بھول گئے؟ ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجدِ جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے۔ میں اِس مہینے میں رام پور کیوں کر رہتا؟ نواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر بھائی، میں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کے دن یہاں آپہنچا۔ یک شنبہ کو غرہ ماہ مقدس ہوا، اُسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جاکر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں۔ شب کو مسجدِ جامع جاکر نماز تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقتِ صوم مہتاب باغ میں جاکر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں۔ واہ، واہ، کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے۔

اب اصل حقیقت سُنو۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں انھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا۔ ورنہ گرمی برسات وہاں کاٹتا۔ اب بہ شرطِ حیات جریدہ بعد برسات جاؤں گا اور بہت دنوں تک یہاں نہ آؤں گا۔

قرارداد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینا ہے سو روپیے مجھے ماہ بہ ماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا تو سو روپیے مہینا بہ نام دعوت اور دیا۔ یعنی رام پور رہوں تو دو سو روپیہ مہینا پاؤں اور دلی رہوں تو سو روپیے، بھائی سو دو سو میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں، مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ہیں۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم، جس طرح احباب میں رسم ہے، وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی۔ بس، بہ ہر حال غنیمت ہے۔ رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیے۔

کمی کا شکوہ کیا، انگریز کی سرکار سے دس ہزار روپیے سال ٹھہرے۔ اُس میں سے مجھ کو ملے ساڑھے سات سو روپیے سال۔ ایک صاحب نے نہ دیے۔ مگر تین ہزار روپیے سال۔

عزت میں وہ پایہ جو رئیس زادوں کے واسطے ہوتا ہے، بنا رہا، خاں صاحب بسیار مہربان دوستان' القاب، خلعت: سات پارچہ او جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید۔ بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔ بخشی، ناظر، حکیم کسی سے توقیر کم نہیں۔ مگر فائدہ وہی قلیل، سو میری جان، یہاں بھی وہی نقشہ ہے۔

کوٹھری میں بیٹھا ہوں، ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آرہی ہے۔ پانی کا جھجر دھرا ہوا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا۔ یہ باتیں کرلیں۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور میر نصیر الدین کو یہ خط پڑھا دینا اور میری دعا کہہ دینا۔

جمعہ ۶ اپریل ۱۸۶۰ء[۱]

(۲۶)

میاں!

کیوں ناسپاسی و ناحق شناسی کرتے ہو؟ چشم بیمار ایسی چیز ہے کہ جس کی کوئی شکایت کرے؟ تمھارا منھ چشم بیمار کے لائق کہاں! چشم بیمار میرن صاحب قبلہ کی آنکھ کو کہتے ہیں جس کو اچھے اچھے عارف دیکھتے رہتے ہیں۔ تم گنوار چشم بیمار کو کیا جانو؟ خیر ہنسی ہو چکی۔ اب حقیقت مفصل لکھو۔ تم زحیر کی عادت رکھتے ہو۔ عوارض چشم سے تم کو کیا علاقہ؟ میرے نور چشم کی آنکھ کیوں دکھی؟ دربیہ بال بال بچ گیا۔ جو اس کے خلاف کہے اُس کو غلط جانتا[۲]؟

میں نے خط تمھیں جان کر نہیں لکھا۔ تم نے لکھا تھا کہ بعد عید میں وہاں آؤں گا۔ مجھ کو خط بھیجنے میں تامل ہوا، لکھتے کچھ ہو، کرتے کچھ ہو۔

تنخواہ کی سنو۔ تین برس کے ڈھ ہزار دو سو پچاس روپیے ہوئے۔ سود خرچ کے جو لیے تھے، وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو عملۂ فعلہ کی نذر ہوئے۔ مختار کار دو ہزار لایا۔ چونکہ میں اُس کا قرض دار

ہوں، روپیے اُس نے اپنے گھر میں رکھے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجیے۔ حساب کیا۔ سود مول سات کم پندرہ سو ہوئے۔ میں نے کہا میرے قرضِ متفرق کا حساب کر۔ کچھ اوپر گیارہ سو روپیے[1] نکلے۔ میں کہتا ہوں یہ گیارہ سو بانٹ دے، تو سو بچے۔ آدھے تو لے، آدھے مجھے دے۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو مجھ کو دو، پان سو سات تم لو۔ یہ جھگڑا مٹ جائے گا، تب کچھ ہاتھ آئے گا۔ خزانے سے روپیہ آگیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی، پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آگئی۔ دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں، جب تک جیوں گا، ایسا ہی رہوں گا۔ میرا دار و گیر سے بچنا معجزۂ[2] اسد اللہی ہے۔ ان بیسوں کا ہاتھ آنا عطیہ یداللہی ہے۔ حاکمِ شہر لکھ دے کہ یہ شخص ہرگز پنسن پانے کا مستحق نہیں۔ حاکمِ صدر مجھ کو پنسن دلوائے اور پورا دلوائے۔

میرن صاحب کو دعا کہتا ہوں اور مزاج کی خبر پوچھتا ہوں۔ جواب ترکی، ترکی، جواب عربی، عربی۔ جو انھوں نے لکھا وہ میں نے بھی لکھا۔ مجتہد العصر کو بندگی لکھوں، دعا لکھوں، کیا لکھوں؟ نہیں بھئی وہ مجتہد ہوں، ہوا کریں، میرے تو فرزند ہیں۔ میں دعا ہی لکھوں گا اور اسی طرح میر نصیرالدین کو بھی دعا۔

اوائل مئی ۱۸۶۰ء[3]

(۲۷)

جانِ غالب!

اب کے ایسا بیمار ہو گیا تھا کہ مجھ کو خود افسوس تھا۔ پانچویں دن غذا کھائی۔ اب اچھا ہوں، تندرست ہوں۔ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ تک کچھ کھٹکا نہیں ہے۔ محرم کی پہلی تاریخ سے اللہ مالک ہے۔ میر نصیرالدین آئے۔ کئی بار، مگر[4] میں نے اُن کو دیکھا نہیں۔ اب کے بار درد میں مجھ کو غفلت بہت رہی۔ اکثر احباب کے آنے کی خبر نہیں ہوئی۔ جب سے اچھا ہوا ہوں سید صاحب نہیں آتے۔ تمھاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلّی میں ڈھائے گئے، اور جہاں جہاں

سٹرکیں نکلیں، جتنی گرد اڑی، اُس کو آپ نے ازراہِ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔ بہ ہر حال، اچھے ہو جاؤ، اور جلد آؤ۔

مجتہد العصر میر سرفراز حسین کا خط آیا تھا میں نے میرن صاحب کی آزردگی کے خوف سے اُس کا جواب نہیں لکھا۔ یہ رقعہ اُن دونوں صاحبوں کو پڑھا دینا تاکہ میر سرفراز حسین صاحب[2] اپنے خط کی رسید سے مطلع ہو جائیں اور میرن صاحب میرے پاس الفت پر اطلاع پائیں۔

چہارشنبہ ۶ جون ۱۸۶۰ء[3]

(۲۸)

میاں!

تمھارے خط کا جواب منحصر تین باتوں پر ہے۔ دو کا جواب لکھتا ہوں تیسری بات کا جواب تم بتاؤ کہ تمھیں کیا لکھوں۔ پہلی بات میاں محمد افضل تصویر لے گئے۔ اب وہ تصویر کھینچا کریں اور تم انتظار۔ دوسری بات، میر نصیر الدین آئے اور ان تینوں صاحبوں کا جیند جاتے کا حال مفصل معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ اپنے بندوں پر رحم فرمائے۔ تیسری بات میرن صاحب کو، جب تک تم نہ کہو، میں دلی نہ بلاؤں۔ گویا اُن کے عاشق تم ہی ہو، میں نہیں۔ بھائی ہوش میں آؤ۔ غور کرو۔ یہ مقدور مجھ میں نہیں کہ اُن کو یہاں بلا کر ایک الگ مکان رہنے کو دوں اور اگر زیادہ نہ ہو تو تیس روپیے مہینا مقرر کروں کہ بھائی یہ لو اور دریبہ اور چاوڑی اور اجمیری دروازے کا بازار اور لاہوری دروازے کا بازار ناپتے پھرو اور اردو بازار اور خاص بازار اور بلاقی بیگم کا کوچہ اور خان دوران خاں کی حویلی کے کھنڈر گنتے پھرو۔ اے میر مہدی! تو درماندہ و عاجز پانی پت میں پڑا ہے۔ میرن صاحب وہاں پڑے ہوئے دلی دیکھنے کو ترسا کریں۔ سرفراز حسین نوکری ڈھونڈتا پھرے اور میں ان غم ہائے جاں گداز کی تاب لاؤں؟ مقدور ہوتا تو دکھا دیتا کہ میں نے کیا کیا:

اے بسا آرزو کہ خاک شد

اللہ اللہ اللہ۔

سہ شنبہ ۴ جمادی الثانی ۱۲۷۷ھ ۱۸ دسمبر ۱۸۶۰ء[5]

(۲۹)

میاں!

تمھاری تحریر کا جواب یہ ہے کہ وہ تصویر جو میں نے میاں محمد افضل کو دی تھی، وہ انھوں نے واپس دی اور اُس کی نقل کے باب میں یہ کہا کہ ابھی تیار نہیں ہے۔ جب وہ تیار ہو جائے گی، میں اُن کو روپیہ دے کر لے لوں گا۔ خاطر جمع رکھو۔

پنسن سراسر سب کو ششش ماہی ملنے کا حکم ہو گیا۔ ہر مہینے میں سودی لو اور کھاؤ۔ کشمیری کٹرہ بگڑ گیا۔ ہائے! وہ اونچے اونچے در اور وہ بڑی بڑی کوٹھریاں دو رویہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں۔ آہنی سڑک کا آنا اور اُس کی رہگزر کا صاف ہونا ہنوز ملتوی ہے۔ چار دن سے پُروا ہوا چلتی ہے، ابر آتے ہیں، مگر صرف چھڑکاؤ ہوتا ہے، مینہہ نہیں برستا۔ گیہوں، چنا، باجرہ، تینوں اناج ایک بھاؤ ہیں نو سیر، ساڑھے نو سیر۔

میر سرفراز حسین اور میرن صاحب کو میں اچھی طرح نہیں سمجھا کہ جیند میں ہیں یا یہاں ہیں۔ میر نصیر الدین دو بار میرے پاس آئے۔ اب مجھ کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں۔ قاسم علی خاں قطب الاقطاب ایک دن کہتے تھے کہ میر احمد صاحب کے قبائل یہاں آئے ہوئے ہیں۔ آخر وہ شادی بھی کب ہونے والی ہے، اور کہاں ہونے والی ہے؟ اس کا جواب لکھو تو سب حالات مفصل لکھو۔

صبح چہارشنبہ نہم جنوری ۱۸۶۱ء

غالب

(۳۰)

لو صاحب! یہ تماشا دیکھو۔ میں تو تم سے پوچھتا ہوں کہ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین کہاں ہیں۔ حال آں کہ میر نصیر الدین شہر میں ہیں اور مجھ سے نہیں ملتے۔ میر سرفراز حسین آئے ہیں اور میرے ہاں نہیں اُترے۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ۔ اترنا کیسا، ملنے کو بھی تو نہیں آئے۔ افسوس ہے جن کو میں اپنا سمجھتا ہوں، وہ مجھ کو بیگانہ جانتے ہیں۔ اب تم یہ پوچھو کہ نصیر الدین کا تو میں

ہونا اور مجتہد العصر کا یہاں آنا تو تے پیرل کر جانا۔

بھائی! آج جمعے کا دن، ۲۰ جمادی الثانی کی، ۱۱ جنوری کی صبح کے وقت منہ اندھیرے اُسی وقت میری آنکھ کھلی تھی۔ لحاف میں لپٹا ہوا پڑا تھا کہ ناگاہ میر نصیر الدین صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ میں اب جاتا ہوں اور میر حسن صاحب بھی جاتے ہیں۔ میں سمجھا میر سرفراز حسین۔ جب بعد تکرار معلوم ہوا تو میر حسن جے پور سے آئے اور خدا جانے کہاں اُترے اور اب کہاں جاتے ہیں۔ ہے ہے! مجھے غیر سمجھا یا مرا ہوا سمجھا کہ میرے ہاں نہ آئے اور مجھ سے نہ ملے اپنی سسرال میں رہے اور میکے کو چھوڑا۔ واللہ میرا جی اُن کے دیکھنے کو بہت چاہتا تھا۔ اب اُٹھا ہوں۔ سردی رفع ہولے، دھوپ نکل لے۔ آغا جان کے ہاں آدمی کو بھیجتا ہوں۔ میں کم بخت یہ بھی تو نہیں جانتا کہ آغا جان کہاں رہتے ہیں۔ اب میر احمد علی کی بی بی پاس حبش خاں کے پھاٹک آدمی بھیجوں گا۔ جب آغا جان کے گھر کا پتا معلوم ہو جائے گا اور آدمی دیکھ آئے گا اور یہ بھی معلوم کر آئے گا کہ میر حسن صاحب ہیں تو میں سوار ہو کر جاؤں گا اور اُن سے ملوں گا۔

تم اس خط کا جواب جلد لکھو اور اپنے چچا کے یہاں آنے کا منشا اور اُن کا احوال مفصل لکھو۔ تصویر کا حال آگے لکھ چکا ہوں۔ خاطر جمع رکھو اور مجتہد العصر اور میرن صاحب کا حال لکھو۔

صبح جمعہ ۱۱ جنوری ۱۸۶۱ء نجات کا طالب۔ غالبؔ

(۳۱)

جانِ غالب!

تمھارا خط پہنچا۔ غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے:

ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے

مصرع بدل دینے سے یہ شعر کس رتبے کا ہو گیا۔[۳]

اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی:

میاں، یہ اہلِ دہلی کی زباں ہے

ارے اب اہلِ دہلی یا ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے؟ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی، باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔

خس کی ٹٹی، پُروا ہوا، اب کہاں لطف؟ وہ تو اُسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ چھت اور سمت بدلی ہوئی ہے۔ بہ ہر حال، مے گزرد۔

مصیبتِ عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر، کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال معلوم کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک، بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اُٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں باقی سب اَٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹڑا، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹڑہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، اِن میں سے کسی کا پتا نہیں ملتا۔ قصہ مختصر، شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہرِ نایاب ہو گیا۔ تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلّی نہ رہی اور دلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حُسنِ اعتقاد، ارے بندۂ خدا، اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں؟ دلی کہاں؟ واللہ، اب شہر نہیں ہے، کیمپ ہے، چھاونی ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔

الور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور انقلاب سے کیا کام؟ الگزنڈر ہدرلی کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہراً اُن کی مصاحبت نہیں۔ ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب

اور نصیرالدین کو دعا۔

۱۸۶۰ء[2]

(۳۴۲)

او میاں سید زادۂ آزادہ، دلّی کے عاشق دلدادہ، ڈھے ہوئے اُردو بازار کے رہنے والے۔ حسد سے لکھنؤ[3] کو بُرا کہنے والے، نہ دل میں مہر و آزرم[4]، نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنونؔ کہاں، ذوقؔ کہاں؟ مومنؔ خاں کہاں؟ ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالبؔ وہ بے خود و مدہوش۔ نہ سخن وری رہی، نہ سخن دانی، کس برتے پر تتا پانی؟ ہائے دلّی؟ وائے دلّی، بھاڑ میں جائے دلّی۔

سنو صاحب! پانی پت کے رئیسوں میں ایک شخص ہیں احمد حسین خاں ولد سردار خاں، ولد دلاور خاں اور نانا اُس احمد حسین خاں کے غلام حسین خاں ولد مصاحب خاں۔ اس شخص کا حال از روئے تحقیق مشرح اور مفصل لکھو۔ قوم کیا ہے، عمر کیا ہے[5]؟ معاش کیا[6] ہے؟ طریق[7] کیا ہے[8]؟ احمد حسین خاں کی لیاقت ذاتی کا کیا رنگ ہے؟ طبیعت کا کیا ڈھنگ ہے؟ بھائی! خوب چھان[9] کر لکھ اور جلد لکھ۔

پنجشنبہ ۲۳ مئی ۱۸۶۱ء[10]

(۳۴۳)

اے جناب میرن صاحب! السلام علیکم۔

حضرت! آداب۔

کہو صاحب آج اجازت ہے، میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی۔

حضور میں کیا منع کیا کرتا ہوں؟ میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں۔ بخار جاتا رہا ہے۔ صرف پیچش باقی ہے، وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ آپ پھر کیوں تکلف کریں۔

نہیں، میرن صاحب اُس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔

حضرت! وہ آپ کے فرزند ہیں آپ سے خفا کیا ہوں گے۔

بھائی! آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟

سُبحَانَ اللہ، سُبحَانَ اللہ، اے لو حضرت! آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔

اچھا تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟

کیا عرض کروں، سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اُٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمھارا خط جاوے۔ میں اب پنجشنبے کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن کے بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔

میاں مٹھو، ہوش کی خبر لو۔ تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، تمھاری باتوں میں آگیا اور آج تک اُسے[۱] خط نہیں لکھا۔ لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃَ۔

سنو میر مہدی صاحب! میرا کچھ گناہ نہیں۔ میرے[۲] خط کا جواب لکھو۔ تپ تو رفع ہوگئی۔ پیچش کے رفع ہونے کی خبر شتاب لکھو۔ پرہیز کا بھی خیال رکھا کرو۔ یہ بڑی بات ہے کہ وہاں کچھ کھانے کو ملتا ہی نہیں۔ تمھارا پرہیز اگر ہوگا بھی تو عصمت بی بی از بے چادری ہوگا۔

حالات یہاں کے مفصل میرن صاحب کی زبانی معلوم ہوں گے۔ دیکھو بیٹھے ہیں۔ کیا جانوں، حکیم میر اشرف علیؒ اور اُن میں کچھ کونسل ہو تو رہی ہے۔ پنجشنبہ روانگی کا دن ٹھہرا تو ہے۔ اگر چل نکلیں اور پہنچ جائیں تو اُن سے یہ پوچھیو کہ جناب ملکۂ انگلستان کی سالگرہ کی روشنی کی محفل میں تمھاری کیا گت ہوئی تھی اور یہ بھی معلوم کرلیجیو کہ یہ جو فارسی مثل مشہور ہے کہ "دفتر را گاؤ خورد" اس کے معنی کیا ہیں؟

پوچھیو اور نہ چھوڑیو، جب تک نہ بتائیں۔ اس وقت پہلے تو آندھی چلی پھر مینہ آیا۔ اب مینہ

برس رہا ہے۔ میں خط لکھ چکا ہوں۔ سرنامہ لکھ کر رکھ چھوڑوں گا۔ جب ترشح موقوف ہو جائے گا تو کلیان ڈاک کو لے جائے گا۔ میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے۔ اللہ اللہ، تم پانی پت کے سلطان العلما اور مجتہد العصر بن گئے۔ کہو وہاں کے لوگ تمھیں قبلہ و کعبہ کہنے لگے یا نہیں۔ میر نصیر الدین کو دعا کہنا۔

مئی ۱۸۶۱ء

(۳۴)

میاں!

کس حال میں ہو؟ کس خیال میں ہو؟ کل شام کو میرن صاحب روانہ ہوئے۔ یہاں اُن کی سسرال میں قصے کیا کیا نہ ہوئے۔ ساس اور سالیوں نے اور بی بی نے آنسوؤں کے دریا بہا دیے۔ خوش دامن صاحب بلائیں لیتی ہیں۔ سالیاں کھڑی ہوئی دعائیں دیتی ہیں۔ بی بی مانندِ صورتِ دیوار چپ، جی چاہتا ہے چیخنے کو، مگر ناچار چپ، وہ تو غنیمت تھا کہ شہر ویران، نہ کوئی جان نہ پہچان، ورنہ ہم سائے میں قیامت برپا ہو جاتی۔ ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آتی۔ امام ضامن علیہ السلام کا روپیہ بازو پر باندھا گیا۔ گیارہ روپے خرچ راہ دیے، مگر ایسا جانتا ہوں کہ میرن صاحب اپنے جد کی نیاز کا روپیہ راہ ہی میں اپنے بازو پر سے کھول لیں گے اور تم سے صرف پانچ روپے ظاہر کریں گے۔ اب سچ جھوٹ[۲] تم پر کھل جائے گا۔ دیکھنا یہی ہوگا کہ میرن صاحب تم سے بات چھپائیں گے۔ اس سے بڑھ کر ایک بات اور ہے، اور وہ محلِ غور ہے۔ ساس غریب نے بہت سی جلیبیاں اور تودۂ قلاقند ساتھ کر دیا ہے اور میرن صاحب نے اپنے جی میں یہ ارادہ کر لیا ہے کہ جلیبیاں راہ میں چٹ کریں گے اور قلاقند تمھاری نذر کر کر تم پر احسان دھریں گے: "بھائی! میں دلّی سے آیا ہوں، قلاقند تمھارے واسطے لایا ہوں۔" زنہار نہ باور کیجیو۔ مالِ مفت سمجھ کر لے لیجیو۔ کون گیا ہے؟ کون لایا ہے؟ کلو، ایاز کے سر پر قرآن رکھو۔ کلیان کے ہاتھ[۳] گنگا جلی دو۔ بلکہ میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ ان تینوں میں

سے کوئی نہیں لایا۔ واللہ میرن صاحب نے کسی سے نہیں منگایا۔ اور سنو مولوی مظہر علی صاحب لاہوری دروازے کے باہر صدر بازار تک اُن کو پہنچانے کو گئے۔ رسم مشایعت[1] عمل میں آئی۔ اب کہو بھائی، کون برا اور کون اچھا ہے۔ میرن صاحب کی نازک مزاجیوں نے کھیل بگاڑ رکھا ہے۔ یہ لوگ تو اُن پر اپنی جان نثار کرتے ہیں۔ عورتیں صدقے جاتی ہیں، مرد پیار کرتے ہیں۔

مجتہد العصر سلطان العلما مولانا سرفراز[2] حسین کو میری دعا کہنا اور کہنا کہ حضرت ہم تم کو دعا کہیں اور تم ہم کو دعا دو۔ میاں کس قصے میں پھنسا ہے؟ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا۔ طب و نجوم و ہیئت[3] و منطق، فلسفہ پڑھ، جو آدمی بنا چاہے۔ خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام، یہی ہے مذہب حق والسلام والاکرام علی علی کیا کر[4] اور فارغ البال رہا کر۔

مئی ۱۸۶۱ء[5]

(۳۵)

برخوردار!

تمھارا خط آیا۔ حال معلوم ہوا۔ میں اس خیال میں تھا کہ الور[6] کا کچھ حال معلوم کر لوں اور کپتان الگزنڈر کا خط آئے اور میں اس کو میر سرفراز حسین کے مقدمے میں لکھ لوں، تو اس وقت تمھارے خط کا جواب لکھوں۔ چونکہ آج تک اُن کا خط نہ آیا۔ میں نے سوچا کہ اگر اسی انتظار میں رہوں گا اور خط کا جواب نہ بھیجوں گا تو میرا پیارا میر مہدی خفا ہو گا۔ ناچار جو کچھ الور کا حال سنا ہے، وہ، اور کچھ اپنا حال لکھتا ہوں۔

ہر چند میں نے دریافت کرنا چاہا مگر حکیم محمود[9] علی کا وہاں پہنچنا اور یہ کہ[10] وہاں پہنچنے کے بعد کیا طور قرار پایا، کچھ معلوم نہیں ہوا۔ صرف خبر واحد ہے کہ اُن کو راؤ راجا نے صاحب ایجنٹ سے اجازت لے کر بلا لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ صاحب ایجنٹ الور نے راجا کے بالغ اور عاقل ہونے کی رپورٹ صدر کو بھیجی ہے۔ کیا عجب ہے کہ ان کا راج ان کو مل جائے۔ کہتے[11] ہیں کہ راؤ راجا نے اہل خطہ کے فراق کی شکایت حاکم سے کی تھی۔ جواب پایا کہ وہ لوگ مفسد اور بدمعاش ہیں اور تمھاری برادری کے لوگ اُن سے ناخوش ہیں۔ اُن کے آنے میں فساد کا احتمال ہے،

وہ نہ آنے پائیں[۱] گے۔

مولانا غالب علیہ الرحمۃ اِن دنوں میں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جز کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی آگئی ہے۔ سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانے میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں، رات بھر شراب پیا کرتے ہیں:

کسے کایں مرادش میسّر بود

اگر جم نہ باشد سکندر بود

میر سرفراز[۲] حسین کو اور میرن صاحب کو اور میر نصیر الدین صاحب کو دعائیں اور دیدار کی آرزوئیں۔

۱۸۶۱ء[۳]

(۳۶)

سید صاحب!

کل پہر دن رہے تمھارا خط پہنچا۔ یقین ہے کہ اُس[۴] وقت یا شام کو میر سرفراز حسین تمھارے پاس پہنچ گئے ہوں۔ حال سفر کا جو کچھ ہے اُن کی زبانی سن لو گے۔ میں کیا لکھوں، میں نے بھی جو کچھ سنا ہے انھی سے سنا ہے۔ اُن کا اِس طرح ناکام پھر آنا میری تمنا اور میرے مقصود کے خلاف ہے لیکن میرے عقیدے اور میرے تصور کے مطابق ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہاں کچھ نہ ہوگا۔ سو روپیے کی ناحق زیر باری[۵] ہوئی۔ چونکہ یہ زیر باری میرے بھروسے پر ہوئی تو مجھے بھی[۶] شرمساری ہوئی۔ میں نے اس چھیاسٹھ برس میں اس طرح کی شرمساریاں اور روسیاہیاں بہت اُٹھائی ہیں۔ جہاں ہزار داغ ہیں، ایک ہزار ایک سہی۔ میر سرفراز[۷] حسین کی زیر باری سے دل کڑھتا ہے[۸]۔

وبا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر انداز قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا بڑا[۱۰]، وبا کیوں نہ ہو؟ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا

ہے:

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفعِ فسادِ ہوا سمجھ لیا جائے گا۔

کلیات اردو کا چھاپا تمام ہوا۔ اغلب کہ اسی ہفتے میں نہایت اسی مہینے میں ایک نسخہ بہ سبیلِ ڈاک تم کو پہنچ جائے گا[1]۔

کلیاتِ نظمِ فارسی کے چھاپنے کی بھی تدبیر ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بن گیا تو وہ بھی چھاپا جائے گا۔ "قاطع برہان" کے خاتمے میں کچھ فوائد بڑھائے گئے ہیں۔ اگر مقدور مساعدت کرے گا تو میں بے شرکت غیر اس کو چھپواؤں گا، مگر یہ خیال محال ہے۔ میرے مقدور کی تیاری کا حال مجتہد العصر کو معلوم ہے۔ واللہ علیٰ کلِّ شیءٍ قدیر۔ خدا کا بندہ ہوں، علی کا غلام۔ میرا خدا کریم، میرا خداوند سخی[2]:

علی دارم، چہ غم دارم

وبا کی آنچ مدھم ہو گئی ہے۔ یہاں سات دن بڑا زور شور رہا۔ پرسوں خواجہ مرزا ولد خواجہ امان مع اپنی بی بی بچوں کے دلی میں آیا۔ کل رات کو اس کا نو برس کا بیٹا ہیضہ کر کے مر گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ الور میں بھی وبا ہے۔ الگزنڈر ہدرلی مشتہر بہ الک صاحب مر گیا۔ واقعی بے تکلف وہ میرا عزیز اور ترقی خواہ اور راج میں اور مجھ میں متوسط تھا۔ اس جرم میں ماخوذ ہو کر مرا۔ خیر، یہ عالمِ اسباب ہے۔ اس کے حالات سے ہم کو کیا؟

جمعہ ۲۶ جولائی ۱۸۶۱ء
۱۷ محرم ۱۲۷۸ھ

(۲۷۱)

بھائی!

تم سچ کہتے ہو:

برسرِ فرزندِ آدم ہرچہ آید بگزرد

لیکن مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ یہ زیر باری میری تحریر کے بھروسے پر ہوئی اور خلاف میری مرضی کے ہوئی جس طرح سے یہ آئے ہیں اگرچہ میری طبیعت اور میری خواہش کے منافی ہے لیکن واللہ میرے عقیدے اور تصور اور قیاس کے مطابق ہے۔ یعنی میں یہی سمجھا تھا کہ البتہ یوں ہی ہوگا؟

دیوانِ اُردو چھپ چکا۔ ہائے لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا، اُس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ حُسنِ خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلّی پر اور اُس کے پانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت۔ صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتّے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اور تھا۔ متوسط جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا، وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکے، حق التصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ غلط جوں کے توں ہیں یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا۔ وہ چھپا۔ بہر حال خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا۔ اگر خدا چاہے تو اسی ہفتے میں تین مجلد اصحاب ثلٰثہ کے پاس پہنچ جائیں۔ نہ میں خوش ہوا ہوں نہ تم خوش ہوگے۔

اور یہ جو لکھتے ہو کہ یہاں خریدار ہیں، قیمت لکھ بھیجو۔ میں دلال نہیں، سوداگر نہیں، مہتمم مطبع نہیں۔ مطبعِ احمدی کے مالک محمد حسین خاں مہتمم، مرزا اموجان، مطبع شاہدرہ میں، محمد حسین خاں دلّی شہر، رائے مان کے کوچے میں، مصوروں کی حویلی کے پاس، قیمت کتاب چھ آنے، محصول ڈاک خریدار کے ذمّے۔ طالبانِ کتاب کو اطلاع دو۔ دو، چار، دس، پانچ جلدیں جس کو منگانی ہوں، محمد حسین خاں کے نام پر، دلّی رائے مان کے کوچے، مصوروں کی حویلی کا پتا لکھ کر خط ڈاک میں بھجوا دو۔ کتاب ڈاک میں پہنچ جائے گی۔ قیمت چاہو نقد، چاہو ٹکٹ ارسال کرو۔ مجھ کو کیا اور تم کو کیا؟ جو کہے اُس کو یہ جواب دے دو۔

وبا تھی کہاں، جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ، ایک چھیاسٹھ برس کا مرد، ایک چونسٹھ برس کی عورت، ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی۔ تف بریں وبا۔ پنجشنبہ

۸ ماہ اگست کی۔ قمری مہینے کا حال کچھ معلوم نہیں۔ کل شام کو دو دو مونڈھے رکھ کر کئی آدمی دیکھا کیے۔ ہلال نظر نہیں آیا۔

پنجشنبہ ۸ اگست ۱۸۶۱ء[۲] نجات کا طالب۔ غالب

(۳۸)

ہاں صاحب! تم کیا چاہتے ہو؟ مجتہد العصر کے مسودے کو اصلاح دے کر بھیج دیا۔ اب[۳] اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں جو سلام لکھوں۔ میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔ تمھارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو کرید اکرو، مسودے کو[۴] بار بار دیکھا کرو، پاؤ گے کیا[۵]؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں کہ[۶] "یہاں خیریت ہے، وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمھارا بہت دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار میر سرفراز حسین کو دینا اور دعا کہنا اور ہاں حکیم میر اشرف علی اور میر افضل علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمۂ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح سے خط بھیجتے رہو[۸]۔"

کیوں سچ کہیو[۹]؟ اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی[۱۰]؟ ہائے، کیا اچھا شیوہ[۱۱] ہے۔ جب[۱۲] تک یوں نہ لکھو۔ گویا[۱۳] وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہِ بے آب ہے۔ ابرِ بے باراں ہے۔ نخلِ بے میوہ ہے۔ خانۂ بے چراغ ہے، چراغِ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ[۱۴] تم زندہ ہو۔ تم جانتے ہو کہ ہم زندہ ہیں۔ امرِ ضروری کو لکھ لیا۔ زوائد کو اور[۱۵] وقت پر موقوف رکھا[۱۶] اور اگر تمھاری خوشنودی اسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے تو بھائی ساڑھے تین سطریں ویسی بھی میں نے لکھ دیں۔ کیا نماز قضا نہیں پڑھتے اور وہ مقبول نہیں ہوتی؟ خیر ہم نے بھی وہ عبارت جو مسودے کے ساتھ لکھی تھی۔ اب لکھ بھیجی۔ قصور معاف کرو، خفا نہ ہو[۱۷]!

میر نصیر الدین ایک بار آئے تھے، پھر نہ آئے۔

نثرِ[۱۸] فارسی نئی میں نے کہاں لکھی کہ تمھارے چچا کو یا تم کو بھیج دوں۔

نواب فیض محمد خاں کے بھائی حسن علی خاں مر گئے۔ حامد علی خاں کی ایک لاکھ تیس ہزار

کئی سو روپے کی ڈگری بادشاہ پر ہوگئی۔

کلو داروغہ بیمار ہوگیا تھا۔ آج اس نے غسل صحت کیا۔ باقر علی خاں کو مہینا بھر سے تپ آتی ہے۔ حسین علی خاں کے گلے میں دو غدود ہو گئے ہیں۔

شہر چپ چاپ، نہ کہیں پھاوڑا بجتا ہے، نہ سرنگ لگا کر کوئی مکان اڑایا جاتا ہے، نہ آہنی سڑک آتی ہے، نہ کہیں دمدمہ بنتا ہے۔ دلّی شہر خموشاں ہے۔ کاغذ نبڑ گیا، ورنہ تمھارے دل کی خوشی کے واسطے ابھی اور لکھتا۔

یکشنبہ ۲۲ ستمبر ۱۸۶۱ء

(۳۹)

صاحب!

آج تمھارا خط دوپہر کو آیا۔ اُس میں میں نے مسودہ تاریخ کا پایا۔ قلم دان میں رکھ لیا۔ خط پڑھ کر میر سرفراز حسین کو بھیج دیا۔ کل وہ کہتے تھے کہ انتیس روپیے کو تین گاڑیاں مقرر ہوگئی ہیں۔ میں کل یعنی آج شام کو سوار ہو جاؤں گا۔ اب اس وقت جو میں یہ خط لکھ رہا ہوں، پہر دن باقی ہے۔ لکھ کر کھُلا رکھ چھوڑوں گا۔ شام کو مجتہد العصر میرے گھر ضرور آئیں گے۔ اگر آج جائیں گے تو واسطے تودیع کے اور اگر نہ جائیں گے تو موافق معمول کے آئیں گے۔ اُن کے جانے نہ جانے کا حال صبح کو اِسی ورق پر لکھ کر خط بند کر کے بھیج دوں گا۔ خدا کرے، اُردو کی نثر کا لفافہ انھوں نے ڈاک میں بھیج دیا ہو۔ شام کو مجھے دے جائیں تو میں کل اُس خط کے ساتھ اُس کو بھی بھجوا دوں۔

مہاراج اگر دورے کو گئے تو کیا اندیشہ ہے؟ گرمی کا موسم ہے، لمبا چوڑا سفر کیوں کریں گے؟ آٹھ سات دن میں پھر آئیں گے۔ یہاں کی تلاش کا نتیجہ دیکھو، تب کہیں جائیو۔

میرن صاحب کی تمھاری چُوما چاٹی کے لکھنے کا مجھ میں دم نہیں۔ تم جانو وہ جانیں۔ کلیات کے چھاپے کی حقیقت سنو۔ ساٹھ صفحے چھاپے گئے تھے کہ مولوی ہادی علی مصحح بیمار ہو گئے۔ کاپی نگار رخصتی اپنے گھر گیا۔ اب دیکھیے کب چھاپا شروع ہو۔ قاطع برہان کا چھاپا ختم ہوا۔ ایک جلد بہ طریق

نمونہ آگئی۔ میں نے پچاس جلدوں کی درخواست پہلے سے دی رکھی ہے۔ اب پچاس روپے بھیجوں تو انچاس جلدیں منگاؤں۔ دیکھیے نو من تیل کب میسر ہو اور رادھا کب ناچے۔

میاں، کل شام کو میر سرفراز حسین میرے گھر نہیں آتے یا تو الور کو، مجھ سے بغیر رخصت ہوئے گئے یا نہیں گئے۔ میں تو آج جمعہ سولہ مئی صبح کے وقت یہ خط ڈاک میں بھیجتا ہوں۔

جمعہ ۱۵ ذیقعدہ و مئی باہم ۱۲۷۸ھ نجات کا طالب۔ غالب

۱۶ مئی ۱۸۶۲ء[1]

(۴۰)

سید صاحب!

اچھا ڈھکوسلا نکالا ہے[2]، بعد القاب کے شکوہ شروع کر دینا اور میرن صاحب کو اپنا ہم زبان کر لینا۔ میں میر مہدی نہیں کہ میرن صاحب پر مرتا ہوں۔ میر سرفراز حسین نہیں کہ ان کو پیار کرتا ہوں۔ علی کا غلام اور سادات کا معتقد ہوں[3]، اُس میں تم بھی آ گئے۔ کمال ہے کہ میرن صاحب سے محبتِ قدیم ہے، دوست ہوں، عاشقِ زار نہیں۔ بندۂ مہر و وفا ہوں، گرفتار نہیں۔

تمھارے بھائی نے سخت شورش بلکہ نعل در آتش کر رکھا ہے۔ ایک سلام اصلاح کے واسطے بھیجا اور لکھا کہ بعد محرم[4] کے میں بھی آؤں گا۔ میں نے سلام رہنے دیا اور منتظر رہا کہ ڈاک میں کیوں بھیجوں، وہ آئیں گے تو یہیں اُن کو دے دوں گا۔ محرم تمام ہوا۔ آج سہ شنبہ، غرۂ صفر ہے۔ حضرت کا پتا نہیں۔ ظاہرا برسات نے آنے نہ دیا۔

برسات کا نام آ گیا۔ سنو پہلے[5] مجملاً سنو۔ ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدامِ مکانات کا، ایک آفت وبا کی۔ ایک مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح گاہ گاہ نظر آ جاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ اُن کو جگنو[6] سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی ہے۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر[7] کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا

ہزار ہا مکان گر گئے، سینکڑوں آدمی جا بہ جا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ بقصۂ مختصر وہ اُن کال تھا کہ مینھ نہ برسا۔ اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ پن کال ہے۔ پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہہ گئے۔ جنھوں نے ابھی نہیں بویا تھا، وہ بونے سے رہ گئے۔ سُن لیا دلّی کا حال؟ اس کے سوا کوئی نئی بات نہیں ہے۔

جناب میرن صاحب کو دعا۔ زیادہ کیا لکھوں۔[1]

سہ شنبہ یکم صفر ۱۲۷۹ھ۔ ۲۹ جولائی سال رستاخیز ۱۸۶۲ء[2]

(۱۴)

واہ حضرت[3]!

کیا خط لکھا ہے؟ اس خرافات کے لکھنے کا فائدہ؟ بات اتنی ہی ہے کہ میرا پلنگ مجھ کو ملا، میرا بچھونا مجھ کو ملا، میرا حجام مجھ کو ملا۔ میرا بیت الخلا مجھ کو ملا۔ رات کا وہ شور کوڑی آئیو، کوئی آئیو فرو ہو گیا۔ میری جان بچی، میرے آدمیوں کی جان بچی: اکنوں شبِ من شب است و روزم روز است۔

بھئی، تم نے یہ نہ لکھا کہ میرن صاحب کو میرا خط پہنچا یا نہ پہنچا۔ میں گمان کرتا ہوں کہ نہیں پہنچا۔ اگر پہنچتا تو بے شک وہ تمھاری نظر سے گزرتا اور میرن صاحب اس کی اصل حقیقت تم سے پوچھتے اور اس صورت میں یہ بھی ضرور تھا کہ تم اس واہیات کے بدلے مجھ کو وہ روداد لکھتے جو میرن صاحب میں اور تم میں پیش آئی۔ پس اگر جیسا کہ میرا گمان ہے۔ خط نہیں پہنچا، تو خیر جانے دو۔ اگر خط پہنچا ہے تو میرن صاحب کے خط کے جواب لکھوانے میں تم نے میرا دم ناک میں کر دیا تھا۔ اب اُن سے میرے خط کے جواب کا تقاضا کیوں نہیں کرتے؟ حسن بھی کیا چیز ہے۔ نادر کا اتنا خوف نہیں جتنا حسین آدمی کا ڈر ہوتا ہے۔ تم اُن سے خواہشِ وصال کرتے ہوئے ڈرو[6]، میرے خط کے جواب کے باب میں کیوں نہیں کہتے؟ نہ صاحب یہ کچھ بات نہیں۔ میرے خط کا جواب اُن سے لکھوا کر بھجواؤ۔

یہاں کا حال وہ ہے جو دیکھ گئے ہو۔ پانی گرم، ہوا گرم، تپیں مستولی، اناج مہنگا۔

بے چارہ منشی میر احمد حسین کا بھتیجا، میر[2] امداد علی آشوب کا بیٹا، محمد میر شب گذشتہ کو گزر گیا۔ آج صبح کو اس کو دفن کر آئے۔ جوان، صالح، پرہیزگار، مومنین کا پیش نماز تھا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

مجتہد العصر کا حکم بجا لاؤں گا۔ اور نہ رئیس کو بلکہ مدار المہام ریاست کو لکھوں گا۔ رئیس میرے سوال کا جواب قلم انداز کر جائے گا اور مدار المہام امرِ واقعی لکھ بھیجے گا۔

مجتہد العصر[3] کو دعا کہنا اور یہ خط پڑھا دینا میرن صاحب کو دعا اور کہنا کہ بھلا صاحب تم نے ہمارے خط کا جواب نہیں لکھا۔ ہم بھی تمھاری طرز کا تتبع کریں گے۔ حکیم میر اشرف علی کو دعا کہنا اور کہنا کہ اگر تم میں ان میں راہ و رسمِ تعزیت اور تہنیت ہو تو میر احمد حسین کو خط لکھو اور یہ بھی اُن کو معلوم ہو کہ حفیظ یہاں آیا ہوا ہے۔ قبائل تمھارے یہیں ہیں۔ اگر وہاں کچھ رسائی حاصل ہو تو خیر، ورنہ یہاں کیوں نہ چلے آؤ۔ شعر:

میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جان
کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکان

برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ خاں کے کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے، جو دروازہ تھا، گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے کتابیں، قلم دان سب توشہ خانے میں۔ فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا، کہیں چلمچی دھری ہوئی۔ خط کہاں بیٹھ کر لکھوں[9]؟ پانچ چار دن سے فرصت ہے، مالک مکان کو فکرِ مرمت ہے۔ آج ایک امن کی صورت نظر آئی۔ کہا کہ آؤ میر مہدی کے خط کا جواب لکھوں۔

انور کی ناخوشی، راہ کی محنت کشی، تپ کی حرارت، گرمی کی شرارت، یاس کا عالم، کثرتِ اندوہ و غم، حال کی فکر، مستقبل کا خیال، تباہی کا رنج، آوارگی کا ملال، جو کچھ کہو وہ

کم ہے۔ بالفعل تمام عالم کا ایک سا عالم ہے۔

سنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجا کو اختیار ملے گا۔ ہاں ملے گا مگر وہ اختیار ایسا ہوگا جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا، آدمی کو بدنام کیا ہے۔

بارے رفعِ مرض کا حال لکھو۔ خدا کرے تپ جاتی رہی ہو تندرستی حاصل ہوگئی ہو۔ میر صاحب کہتے ہیں:

تندرستی ہزار نعمت ہے

ہائے پیش مصرع مرزا قربان علی بیگ سالک نے کیا خوب بہم پہنچایا ہے۔ مجھ کو بہت پسند آیا ہے:

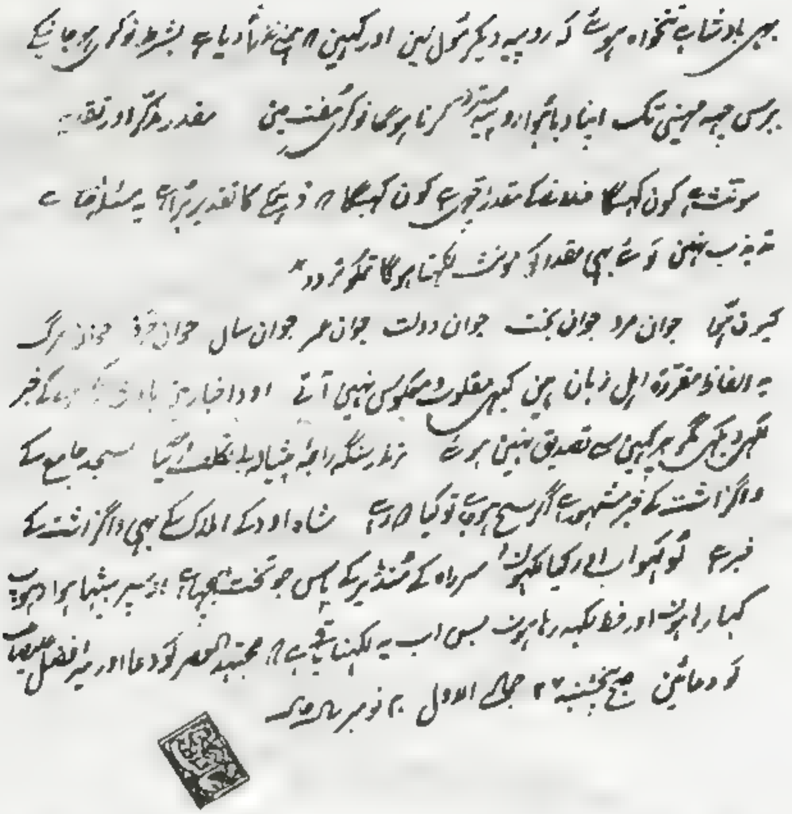
تنگدستی اگر نہ ہو سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے

مجتہد العصر[۲] میر سرفراز حسین صاحب کو دعا۔ آہا ہا میر افضل علی صاحب کہاں ہیں حضرت! یہاں تو اس نام کا کوئی آدمی نہیں ہے۔ لکھنؤ کے مجتہد العصر کے بھائی کا نام میرن صاحب تھا۔ جے پور کے مجتہد العصر کے بھائی میرن صاحب کیوں نہ کہلائیں؟ ہاں بھائی میرن صاحب بھلا اُن کو ہماری دعا کہنا۔

صبح جمعہ ۲۶ ستمبر ۱۸۶۲ء

(۴۲)

میری جان تم خط نہ بھیجو اور میرے خط کا انتظار کرو اسکی وجہ میں نہیں سمجھا
تمہارا خط آیا اور میں جواب نہ لکھوں تو گنہگار ہونگا نواب سعد الدین خاں ناظم کا
دیوان میرے پاس کہاں تھا اور جب نہ بسبیل ارمغان مجھکو ایک دیوان بھی نہیں بھیجا
یہاں کچھ بکتے آ گئے تھے میں نے ایک جلد لیکر مصطفیٰ خانکو جہانگیر آباد
بھیجا تھا اب محمد بخش اور میرجی سے کہدونگا اگر کہیں مل گیا تو ایک جلد
میر سرفراز حسین کو بھیجدونگا توقیع نوکری کا حال مجکو مفصل معلوم ہے یہ



میری جان!

خط نہ بھیجو اور میرے خط کا انتظار کرو۔ اس کی وجہ میں نہیں سمجھا۔ تمھارا خط آئے اور میں جواب نہ لکھوں تو گناہگار۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کا دیوان میرے پاس کہاں؟ نواب صاحب نے یہ سبیلِ ارمغاں مجھے ایک ورق بھی نہیں بھیجا۔ یہاں کچھ بکتے آ گئے تھے میں نے ایک مول لے کر نواب مصطفےٰ خاں کو جہاں گیر آباد بھیجا تھا۔ ب۔ تمدبخش اور پیر جی سے کہہ دوں گا، اگر کسی نے لا دیا تو ایک جلد میر سرفراز حسین کو بھیج دوں گا۔

توقعِ نوکری کا حال مجھ کو مفصل معلوم ہے۔ یہ بھی بادشاہی تنخواہ ہوئی کہ روپیہ دے کر مول لیں اور کہیں کہ ہم نے نذرانہ دیا ہے۔ بہ شرط نوکری ہو جانے کے برس چھے مہینے تک اپنا دبا ہوا روپیہ مسترد کرنا ہوگا۔ نوکری مفت میں۔

"مقدر" مذکر اور "تقدیر" مونث ہے۔ کون کہے گا" فلانے کی مقدر اچھی ہے؟ کون

کہے گا کہ "ڈھکے کا تقدیر بُرا ہے"؟ یہ مسئلہ صاف ہے۔ مذبذب نہیں، کوئی بھی مقدر کو مونث نہ کہتا ہوگا۔ تم کو تردد کیوں ہوا؟

"جواں مرد" "جواں بخت" "جواں دولت" "جواں عمر" "جواں سال" "جواں خرد" "جواں مرگ" یہ الفاظ مقررۂ اہلِ زبان ہیں، کبھی مقلوب و معکوس نہیں آتے۔

"اودھ اخبار" میں بادشاہ کے مرنے کی خبر لکھی دیکھی مگر پھر کہیں سے تصدیق نہیں ہوئی۔ نرندر سنگھ راجا پٹیالہ بے تکلف مر گیا۔ مسجدِ جامع کی واگذاشت کی خبر مشہور ہے۔ اگر سچ ہو جائے تو کیا دُور ہے؟ شاہ اودھ کی املاک کی بھی واگذاشت کی خبر ہے۔

لو بھئی اب اور کیا لکھوں؟ سرِ راہ کی منڈیر کے پاس جو تخت بچھا ہے اُس پر بیٹھا ہوا دھوپ کھا رہا ہوں اور خط لکھ رہا ہوں۔ بس اب یہ لکھنا باقی ہے کہ مجتہد العصر کو دعا اور میر افضل علی صاحب کو دعائیں۔

صبح پنجشنبہ ۲۷ جمادی الاول ۱۲۷۹ھ

۲۰ نومبر سال حال ۱۸۶۲ء غالب

(۴۳)

(مہر) غالب

جُو یائے حالِ دہلی و الور سلام لو

مسجدِ جامع واگذاشت ہو گئی۔ چیتلی قبر کی طرف کی سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں۔ انڈا مرغی کبوتر بکنے لگا۔ عشرۂ مبشرہ یعنی دس آدمی مہتمم ٹھہرے۔ مرزا الٰہی بخش، مولوی صدرالدین، تفضل حسین خاں ابنِ فضل اللہ خاں، تین یہ اور سات اور۔

۷ نومبر ۱۴ جمادی الاول سالِ حال، جمعے کے دن ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ و قیدِ جسم سے رہا ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

جاڑا پڑ رہا ہے۔ ہمارے پاس شراب آج کی اور ہے کل سے رات کو نری انگیٹھی پر گزارا ہے۔ بوتل گلاس موقوف۔

راجا پٹیالہ مر گیا۔ مہندر سنگھ، اُس کے خلف پر خطاب فرزندی اور القاب بحال و برقرار رہا۔ بالفعل دیوان نہال چند کام کر رہا ہے۔ ظاہرا جو رنگ اس ریاست کا ہونے والا ہے وہ نواب گورنر جنرل کے آنے پر کھلے گا اور وہ فروری مہینے میں یہاں آئیں گے۔

الور کی ریاست کا حال بدستور ہے۔ گورنر صاحب ہی انھیں اختیار دیں گے یعنی پٹیالہ اور الور کے راج کا انتظام اُسی وقت پر ہوگا۔ بالفعل اپنے صاحب اجنٹ الور دلی ہوتے ہوئے میرٹھ گئے ہیں۔ راجا صاحب تجارہ تک ان کی مشایعت کر گئے۔ یہاں اپنے صاحب سے کوئی صاحب سنگھ ٹھیکہ دارِ الور کی سڑک کا ہے، اُس نے کچھ کہا تھا۔ جواب دیا کہ الور کے مقدمات میں پنچوں کو اختیار ہے، ہم کچھ حکم نہ دیں گے۔ اسفندیار بیگ متوفیٰ کا کوئی متبنیٰ مستدعی پرورش ہوا، اُس کو بھی یہی جواب ملا۔ اب اور بولو کیا لکھوں۔

دھوپ میں بیٹھا ہوں۔ یوسف علی خاں اور لالہ ہیرا سنگھ بیٹھے ہیں۔ کھانا تیار ہے۔ خط لکھ کر، بند کر کر آدمی کو دوں گا اور میں گھر جاؤں گا۔ وہاں ایک دالان میں دھوپ ہوتی ہے اُس میں بیٹھوں گا، ہاتھ منہ دھوؤں گا، ایک روٹی کا چھلکا سالن میں بھگو کر کھاؤں گا۔ بیسن سے ہاتھ دھوؤں گا۔ باہر آؤں گا، پھر اُس کے بعد خدا جانے کون آئے گا، کیا صحبت ہوگی؟

مجتہد العصر میر سرفراز حسین صاحب اور ذاکر الحسین میر افضل علی عرف میرن صاحب کو دعا۔

منگل کا دن ۲۳ جمادی الثانی ۱۲۷۹ھ

۱۶ دسمبر ۱۸۶۲ء پہر دن چڑھے ؎ غالبؔ

(۴۴)

برخوردار[۳]!

تمھارا خط پہنچا، مگر یہ غضب ہے کہ میں اُس کا جواب نہیں لکھ سکتا اور وہ جواب طلب ہے۔ جواب کیا لکھوں؟ قواعد عمل داری کے برہم ہو گئے۔ نئے نئے دستور ہیں۔ شہرت ہوتی

کہ لاٹ صاحب آتے ہیں۔ فروری کو انبالے پہنچیں گے۔ اہلِ دہلی کی ملازمت وہاں ہوگی۔ اب یہ آوازہ بلند ہے کہ فروری میں کلکتے سے چلیں گے۔ بنارس، الہ آباد، اکبرآباد ہوتے ہوئے مارچ کو انبالے پہنچیں گے۔ الور، جے پور، کوٹہ یہ تین راجا آگرے پہنچ گئے۔ وہاں میر فرش کی طرح بے کار دھرے ہوئے ہیں۔ الور کے راجا گویا یوسف ہیں، اُن کے خریدار دوڑتے پھرتے ہیں۔ کوئی شکرم، کوئی کرانچی ڈھونڈھ رہا ہے، کوئی پیادہ چل نکلا۔ کسی نے مانگے کا ٹٹو بہم پہنچایا۔ یہ سب قصے ایک طرف، اب سنتا ہوں کہ راجستھان کے اجنٹ نے سب رئیسوں کو لکھا ہے کہ لاٹ صاحب تمھیں بلاتے نہیں جس کا جی چاہے آؤ، جس کا جی نہ چاہے نہ آؤ۔ اس تحریر کو دیکھ کر جو وعدہ گاہ پر جا پہنچے، وہ پشیماں ہیں جو راہ میں ہیں وہ وہیں ٹھٹک رہے ہیں، نہ آگے بڑھتے ہیں، نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔ جو اپنے مقام سے نہ ہلے تھے، وہ اچھے رہے۔

یہاں دو تین مہاوٹیں برس گئی ہیں۔ گیہوں چنا اچھا ہوگا۔ ربیع کی امید پڑی:

انقہا پُر از ابرِ بہمن تہی

سفالینہ جامِ من از مے تہی

سیدھے ہاتھ پر ایک زخم، بائیں بازو پر ایک گھاؤ، سیدھی ران پر ایک پھوڑا۔ یہ حال میرا ہے۔ باقی خیروعافیت۔ میر سرفراز حسین صاحب اور میرن صاحب کو دعا پہنچے۔

جنوری ۱۸۶۳ء — غالب

(۴۵)

نورچشم، میر مہدی کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ کلیاتِ فارسی کا پہنچنا مجھ کو معلوم ہوا، میاں، اس میں اغلاط بہت ہیں۔ مبارک ہو تمھیں اور میر سرفراز حسین کو اور میرن صاحب کو اور بھائی، خدا کرے، مجھ کو بھی۔ لو صاحب، اجنٹ بہادر راجستھان کا حکم الور کے اجنٹ کو آیا کہ تم پہلی ستمبر کو راج کے کاغذ، جو تمھارے پاس ہیں اور راج کا اسباب، جو تمھارے تحت میں ہے، وہ سب راجا صاحب کو دو اور تم الگ ہو جاؤ۔ ستمبر کی بیسویں کو ہم الور آئیں گے۔ راجا صاحب کو مسند پر

بٹھائیں گے۔ خلعت شاہی انھیں پہنائیں گے :

ستمبر ستم بُردو آورد داد

شنبہ ۲۲ اگست ۱۸۶۳ء از غالب

(۴۶)

آیئے جناب میر مہدی صاحب دہلوی، بہت دنوں میں آئے۔ کہاں تھے؟ بارے آپ کا مزاج خوش ہے؟ میر سرفراز حسین صاحب اچھی طرح ہیں۔ میرن صاحب خوش ہیں :

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

پہلے یہ سمجھو کہ قسم کیا چیز ہے؟ قد اس کا کتنا لمبا ہے؟ ہاتھ پاؤں کیسے ہیں؟ رنگ کیسا ہے؟ جب یہ نہ بتا سکو گے تو جانو گے کہ قسم جسم و جسمانیات میں سے نہیں۔ ایک اعتبارِ محض ہے۔ وجود اُس کا صرف تعقل میں ہے۔ سیمرغ کا سا اُس کا وجود ہے۔ یعنی کہنے کو ہے، دیکھنے کو نہیں۔ پس شاعر کہتا ہے کہ جب ہم آپ اپنی قسم ہوگئے تو گویا اس صورت میں ہمارا ہونا، ہمارے نہ ہونے کی دلیل ہے:

می خواہم از خدا و نمی خواہم از خدا دیدن حبیب را و ندیدن رقیب را

لف و نشر مرتب ہے۔ می خواہم از خدا، دیدنِ حبیب را۔ نمی خواہم از خدا، نہ دیدنِ رقیب را۔ خوار و زار و خستہ و سوگوار معنی تو اس میں موجود ہیں، مگر بول چال ٹکسال باہر ہے۔ ایک جملے کا جملہ مقدر چھوڑ دیا ہے اور پھر اس بھونڈی طرح سے کہ جس کو "المعنی فی بطن الشاعر" کہتے ہیں۔ یہ شعر اساتذہ مسلم الثبوت میں سے کسی کا نہیں ہے۔ کوئی صاحب ہوں گے کہ انھوں نے لوگوں کو حیران کرنے کے واسطے یہ شعر کہہ دیا اور کسی استاد کا نام لے دیا کہ یہ اُن کا ہے۔

تذکیر و تانیث کا کوئی قاعدہ منضبط نہیں کہ جس پر حکم کیا جائے۔ جو جس کے کانوں کو لگے، جس کو جس کا دل قبول کرے، اس طرح کہے۔ "رتھ" میرے نزدیک مذکر ہے۔ یعنی رتھ آیا لیکن جمع میں کیا کروں گا۔ ناچار مونث بولنا پڑے گا۔ یعنی "رتھیں آئیں" خبر مونث ہے بہ اتفاق "نگر" کاغذ اخبار

اس کو خود سمجھ لو کہ تمھارا دل کیا قبول کرتا ہے۔ میں تو مذکر کہوں گا، یعنی "اخبار آیا" "پیر ہوئی یا ہوا؟" یہ منطق عوام کا ہے۔ ہمیں اس سے کچھ کام نہیں۔ ہم کہیں گے کہ "دوشنبہ ہوا" "پیر کا دن ہوا" "نری پیر ہوئی" یا "پیر ہوا" ہم کیوں بولیں گے؟ "بلبل" میرے نزدیک مونث ہے۔ جمع اس کی "بلبلیں"۔ "طوطی بولتا ہے" "بلبل بولتی ہے"۔

بھائی! اس امر میں مفتی و مجتہد بن نہیں سکتا۔ اپنا عندیہ لکھتا ہوں، جو چاہے مانے، جو چاہے نہ مانے۔

سہ شنبہ ۸ دسمبر ۱۸۶۳ء　　　　نجات کا طالب۔ غالب

(۴۷)

قرۃ العینین، میر مہدی و میر سرفراز حسین، مجھ سے ناخوش اور گلہ مند ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ دیکھو ہمیں خط نہیں لکھتا:

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ ماجرا کیا ہے

ماجرا یہ ہے کہ تمھارا ابھی تو کوئی خط نہیں آیا، میں جس کا جواب لکھتا۔ میرن صاحب سے تمھاری خیر و عافیت پوچھی اور کہہ دینا کہ میری دعا لکھ بھیجنا۔ بس اب اتنا ہی دم باقی ہے۔ کل میرن صاحب آئے۔ پوچھا کہ الور سے کوئی خط آیا۔ فرمایا کہ اس ہفتے میں کوئی خط میں نے نہیں پایا۔ کیا کہوں کہ کیا حال ہے۔ پیش ازیں اپنا یہ شعر پڑھا کرتا تھا:

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی　　یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

اب اس زمزمے کا بھی محل نہ رہا۔ یعنی سعیِ بے حاصل کی لذت خاک میں مل گئی — اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

سہ شنبہ ۱۸ شعبان ۱۲۸۱ھ
۱۷ جنوری ۱۸۶۵ء　　　　مرگِ ناگاہ کا طالب۔ غالب

(۴۸)

برخوردار نورچشم میر مہدی کو بعد دعائے حیات وصحت کے معلوم ہو۔ بھائی، تم نے بخار کو کیوں آنے دیا؟ تپ کو کیوں چڑھنے دیا؟ کیا بخار میرن صاحب کی صورت میں آیا تھا؟ جو تم مانع نہ آئے۔ کیا تپ، ابن[1] بن کر آئی تھی، جو اُس کو روکتے ہوئے شرمائے؟ حکیم اشرف علی ابھی گئے ہیں۔ کہتے تھے کہ میں نے نسخہ لکھ کر آج ڈاک میں بھیج دیا ہے۔ چونکہ یہ خط بھی آج روانہ ہوتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ دونوں خط ایک دن بلکہ ایک وقت پہنچیں۔ دل تمھارے واسطے بہت کڑھتا ہے۔ حق تعالیٰ تم کو جلد شفا دے اور تمھاری تندرستی کی خبر مجھ کو سنائے۔

سنو میاں سرفراز حسین[2]، ہزار برس میں تم نے مجھ کو ایک خط لکھا، وہ بھی اس طرح کا کہ جیسا جلال اسیر کہتا ہے:

به غیر در شکر آب ست و رو بما دارد

پڑھتا ہوں اُس خط کو اور ڈھونڈھتا ہوں کہ میرے واسطے کون سی بات ہے؟ مجھ کو کیا پیام ہے؟ کچھ نہیں۔ شاید دوسرے صفحے میں کچھ ہو۔ ادھر خاتمہ بالخیر ہے۔ یارب سرنامہ میرے نام کا۔ آغازِ تحریر میں القاب میرا۔ پھر سارے خط میں میرن صاحب کا جھگڑا، یہ کیا سیر ہے؟ میں ایسے خط کا جواب کیوں لکھوں؟ میری بلا لکھے۔ اب جو تم خط لکھو گے اور اُس میں اپنے بھائی کی خیر و عافیت رقم کرو گے اور میرن صاحب کا نام اور اُن کے لیے سلام تک بھی اُس میں نہ ہوگا تو میں اُس کا جواب آنکھوں سے لکھوں گا۔

اور ہاں میاں، پھر تم نے میر اشرف علی کو کیا لکھا کہ ہم نے سنا ہے کہ چچا نے اُس کا مرنا سنا ہوگا؟ اُس غریب کا قول یہ ہے کہ میری دونوں بہنیں اور پانچ بھانجیاں پانی پت میں ہیں۔ کیا چچا کو نہ معلوم ہوگا کہ کون سی لڑکی مری؟ کاش اُس کے باپ کا نام لکھتے تاکہ میں جانتا کہ کون سی بھانجی مری ہے۔ اب میں کس کا نام لے کر رووٗں، اور کس کی فاتحہ دلواؤں؟ اس امر میں حق بجانب اُس مظلوم کے ہے۔ توضیح بہ قید نام لکھو۔

(۴۹)

برخوردار کامگار، میر مہدی دہلوی، اردو بازار کے مولوی، صاحب لولاے ولاے مرتضوی پر علَمِ عباس ابن علی کا سایہ۔ راجا صاحب کے سلوک کا حال ہم پہلے ہی سن چکے تھے۔ اَلحمدُ لِلّٰہِ عَلیٰ کُلِّ حالٍ دیکھیے، اب معاودت کب کرتے ہیں۔ موافق اپنے وعدے کے ہم کو کیوں کر طلب کرتے ہیں۔ کلکتے جاتے وقت فرما گئے ہیں کہ میں آکر اسدؔ کو بلاؤں گا۔ البتہ اگر وہ بلائیں گے تو میں کیوں کر نہ جاؤں گا۔ ظاہرا ہمارے تمھارے واسطے زمانۂ انتہاے مصیبت اور وقتِ پیش آمد دولت ہے۔ اب مجھ کو میرن صاحب کی خوشامد کرنی پڑے گی۔ وہ مقرب بنیں گے، اگر میری قسمت لڑے گی تم میری کامیابی کا سامان کر رکھنا۔ میرن صاحب کو مجھ پر مہربان کر رکھنا بھائی! یہ جو میرن صاحب یا امیرن صاحب ہیں حضور کے بڑے مصاحب ہیں۔ جس گروہ میں سے جس کو چاہیں حضور سے ملوا دیں۔ فرقۂ شعرا میں سے جس کو جو کچھ چاہیں دلوا دیں، اُن کو اور مجتہد العصر کو میری دعا کہنا۔

نجات کا طالب۔ غالبؔ

(۵۰)

میری جان!

وہ پارسی قدیم جو ہوشنگ و جمشید و کیخسرو کے عہد میں مروّج تھی، اُس میں "خُر" بہ خاے مضموم "نور قاہر" کو کہتے ہیں اور چونکہ پارسیوں کی دید و دانست میں بعد خدا کے آفتاب سے زیادہ کوئی بزرگ نہیں ہے، اسی واسطے آفتاب کو "خُر" لکھا اور "شید" کا لفظ بڑھا دیا۔ "شید" بہ شین مکسور و یاے معروف بر وزنِ "عید" "روشنی" کو کہتے ہیں یعنی یہ اُس "نور قاہر ایزدی" کی روشنی ہے۔ "خُر" اور "شید" یہ دونوں اسم "آفتاب" کے ٹھہرے۔ جب عرب و عجم مل گئے تو اکابر عرب نے کہ وہ منبع علوم ہوئے، واسطے دفع التباس کے "خُر" میں واو معدولہ بڑھا کر "خور" لکھنا شروع کیا۔ ہر آینہ متاخرین نے اس قاعدے کو پسند کیا اور منظور کیا اور

فی الحقیقت یہ قاعدہ بہت مستحسن ہے۔ فقیر جہاں حرف بے اضافہ لفظ "شید" لکھتا ہے، بموافق قانون عقلائے عرب بہ واو معدولہ لکھتا ہے یعنی "خور" اور جہاں بہ اضافہ لفظ "شید" لکھتا ہے،

وہاں بہ[2] پیروی بزرگان پارسی سر بہ سر لفظ "خور" کو بے واو لکھتا ہے یعنی "خرشید"۔ "خُر"[3] کا قافیہ "دُر" اور "بر" کے ساتھ جائز اور روا ہے، خود میں نے دو چار جگہ باندھا ہوگا۔ وہاں میں بے واو کیوں لکھوں؟ رہا "خورشید" چاہو بے واو لکھو، چاہو مع الواو لکھو۔ میں بے واو لکھتا ہوں مگر مع الواو کو غلط نہیں جانتا اور "خُر" کو کبھی بے واو نہ لکھوں گا۔ قافیہ ہو یا نہ ہو، یعنی نظم میں وسط شعر میں آپڑے یا نثر کی عبارت میں واقع ہو "خور" لکھوں گا۔ یہ بات بھی تم کو معلوم رہے کہ جس طرح "خر" ترجمہ "قاہر" کا ہے اسی طرح "جم" ترجمہ "قادر" کا ہے کہ بہ اضافۂ لفظ "شید" اسم شہنشاہ وقت قرار پایا ہے۔

مجتہد العصر و میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے۔ سچ کہیے[6] تمھیں وہاں کوئی مجتہد العصر نہ کہتا ہوگا، نہ کہو، تم کو کیا؟ میں نے کہا، تم نے مان لیا اب کوئی کہے یا نہ کہے۔

میاں بدر الدین سے ایک مہر کھدوا دوں گا:

جناب مجتہد العصر سرفراز حسین

بس تم یہ مہر خطوں پر، محضروں پر، تمسکوں پر کرنی شروع کرنا، سب کے سب تم کو مجتہد العصر کہنے لگیں گے۔

حکیم میر اشرف علی کو اور اُن کے فرزند کو دعا پہنچے۔

میرن صاحب کو دعا پہنچے۔ بھائی میرن، اب وہ خس کا پردہ کھول ڈالا۔ صافیاں جھجر پر پیٹتا ہوں، دم بہ دم بھگوتا ہوں۔ وہ لو کہاں جو پردے سے لپٹ کر صافی کو لگے اور پانی کو ٹھنڈا کرے؟ وہ پانی جو میر مہدی اور تم اور حکیم جی پیا کیے ہو۔ اب کہاں! برف پندرہ دن کی اور باقی ہے۔ آیندہ خدا رزاق ہے۔

میاں داد خاں سیاح

(۱)

برخوردار کامگار، سعادت نشاں، منشی میاں داد خاں سیاح طال عمرہ۔

درویش گوشہ نشیں غالبِ حزیں کی دعاے درویشانہ سے کامیاب و بہرہ مند ہوں۔ لکھنؤ کی ویرانی پر دل جلتا ہے مگر تم کو یاد رہے کہ وہاں بعد اِس فساد کے ایک کون ہوگا، یعنی راہیں وسیع ہو جائیں گی، بازار اچھے نکل آئیں گے، جو دیکھے گا، وہ داد دے گا اور دلّی کے فساد کے بعد کون نہیں ہے، یہاں فساد در فساد چلا جائے گا۔ شہر کی صورت سواے اس بازار کے جو قلعے کے لاہوری دروازے سے شہر کے لاہوری دروازے تک ہے، سراسر بگڑ گئی اور بگڑتی جاتی ہے۔

دیوان کا چھاپا کیسا؟ وہ شخص نا آشنا، موسوم بہ عظیم الدین جس نے مجھ سے دیوان منگا بھیجا، آدمی نہیں ہے، بھوت ہے، پلید ہے، غول ہے، قصہ مختصر، سخت نامعقول ہے۔ مجھ کو اُس کے طور پر انطباعِ دیوان نامطبوع ہے۔ اب میں اُس سے دیوان مانگ رہا ہوں اور وہ نہیں دیتا۔ خدا کرے ہاتھ آجائے، تم دعا مانگو۔ زیادہ کیا لکھوں؟

دوشنبہ ۱۱ جون سنہ ۱۸۶۰ء

غالب

(۲)

برخوردار!

تمھارا خط پہنچا۔ لکھنؤ کا کیا کہنا ہے! وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اللہ اللہ! وہ سرکار امیر گر تھی، جو بے سروپا وہاں پہنچا، امیر بن گیا۔ اُس باغ کی یہ فصلِ خزاں ہے۔

میں بہت خوشی سے تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ اردو کا دیوان غاصبِ ناانصاف سے ہاتھ آگیا اور میں نے نورِ چشم منشی شیونراین کو بھیج دیا۔ یقینِ کلی ہے کہ وہ چھاپیں گے۔ جہاں تم ہوگے، ایک نسخہ تم کو پہنچ جائے گا۔

طریقۂ سعادت مندی یہ ہے کہ ہم کو اپنی خیر و عافیت کا طالب جان کر جہاں جاؤ، وہاں سے خط لکھتے رہو اور اپنے مسکن کا پتا ہم پر ظاہر کرتے رہو۔ ہم تم سے راضی ہیں اور چوں کہ تمھاری خدمت اچھی طرح نہیں کی، شرمندہ بھی ہیں۔

مرقومۂ شنبہ روز عید مطابق ۳۰ جون ۱۸۶۰ء — راقم۔ اسد اللہ خاں

(۳)

بھائی!

تمھاری جان کی اور اپنے ایمان کی قسم کہ میں فنِ تاریخ گوئی و معمّا سے بیگانۂ محض ہوں۔ اردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سنی ہوگی۔ فارسی دیوان میں دو چار تاریخیں ہیں۔ اُن کا حال یہ ہے کہ مادہ اوروں کا ہے اور اشعار میرے ہیں۔ تم سمجھے کہ میں کیا کہتا ہوں؟ حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا ہے، جب کوئی مادہ بناؤں گا، حساب درست نہ پاؤں گا۔ دو ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوتی تو مادۂ تاریخ وہ مجھے ڈھونڈھ لادیتے، موزوں میں کرتا اور اگر آپ میں نے مادے کی فکر کی ہے اور یہی حسابِ جمل منظور رکھا ہے تو ایسے ایسے تعمیے و تخرجے آ گئے ہیں کہ وہ تاریخ ہنسی کے قابل ہوگئی ہے۔ کلکتے میں قاضی القضاۃ سراج الدین علی خاں مرحوم کی قبر پر مسجد بنی ہے۔ اُن کے بھتیجے مولوی

ولایت حسین خاں نے استدعائے تاریخ کی، میں نے لکھی۔ چناں چہ وہ فارسی دیوان میں موجود ہے:

مفتیِ عقل از پےِ تاریخِ ایں بنا
ایما بسوے من زرہِ احترام کرد
گفتم بوے بدیہہ "خوشا خانۂ خدا"
شد خشمگیں دمے کہ نظر در کلام کرد
"خاشاک" رفت و "پاے ادب" در شکنجہ ریخت
ایہام را بہ تخرجہ معنی تمام کرد

واسطے خدا کے غور کرو "خوشا خانۂ خدا" مادہ، پھر اُس میں سے "خاشاک" کے عدد دور کرو۔ نوسوا کیس کا تخرجہ، پھر بھی دو اور زیادہ رہے۔ "پاے ادب" توڑا۔ بھلا یہ کوئی تاریخ ہے مگر ہاں حساب کے قاعدے سے باہر کچھ معنی سگالی کے طور پر میرا ایجاد ہے اور وہ لطف رکھتا ہے۔ ایک شخص ۱۲۴۸ھ میں مرا اُس کی تاریخ میں نے لکھی:

ز سالِ واقعۂ میرزا میتا بیگ
مآت راست شمار ائمہ امجاد
صحیفہ ہاے سماوی مبیّن از عشرات
حدیقہ ہاے بہشتی مشخص از آحاد

ائمہ بارہ یعنی "بارہ سو" پھر کتبِ سماوی "چار" دہا کے چار یعنی چالیس، بہشت آٹھ چالیس اور آٹھ اڑتالیس، بارہ سو اڑتالیس۔

دوسری تاریخ بارہ سو ستر کی:

از بروجِ سپہر جوے مآت
عشرات از کواکبِ سیار

بڑ ج یارہ، سات ڈھا کے ستر۔

یہ جو لکھتے ہو کہ سید غلام بابا کسی بحر میں نہیں آتا، کیوں نہیں آتا ہے:

جب کہ سید غلام بابا نے
مسندِ عیش پر جگہ پائی
ایسی رونق ہوئی برات کی رات
کہ کواکب ہوئے تماشائی

دوسری بحر سنو:

ہزار شکر کہ سید غلام بابا نے
فرازِ مسندِ عیش و طرب جگہ پائی
زمیں پہ ایسا تماشا ہوا برات کی رات
کہ آسماں پہ کواکب بنے تماشائی

اس بحر میں سماتا ہوا کوئی مادہ بہم پہنچاؤ، تاریخ کہ لو۔ وہ دوست جو مادہ ڈھونڈھ دیتے تھے، وہ جنت کو سدھارے، میں جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں معذور اور مجبور ہوں۔

سہ شنبہ ۱۱ محرم سنہ ۱۲۷۷ھ
۳۱ جولائی سنہ ۱۸۶۰ء غالب

(۴)

سعادت و اقبال نشان، منشی میاں داد خاں سے میں بہت شرمندہ ہوں کہ اُن کے خطوط کا جواب نہیں لکھا۔ غزلوں کے مسودے گم ہو گئے۔ اس شرمندگی سے پاسخ نگار نہ ہوا۔ اب یہ سطریں جو لکھتا ہوں، اُس خط کے جواب میں ہیں، جو بنارس سے آیا ہے۔

بھائی! بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے۔ ایک مثنوی میں نے اُس کی تعریف میں لکھی ہے اور چراغ دیر اُس کا نام رکھا ہے، وہ فارسی دیوان میں موجود ہے، اُس کو دیکھنا۔

اشرف حسین خاں صاحب میرے دوست ہیں۔ فتنہ و فساد کے زمانے سے بہت پہلے اُن کا خط اور کچھ اُن کا کلام میرے پاس آیا ہے۔ تم اُن کو میرا سلام کہنا اور میں تم سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ جس طرح تم نے لکھنؤ سے بنارس تک کے سفر کی سرگذشت لکھی ہے، اسی طرح آیندہ بھی لکھتے رہو گے۔ میں سیر و سیاحت کو بہت دوست رکھتا ہوں :

اگر بہ دل نہ خلد ہرچہ از نظر گذرد
زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گذرد

خیر، اگر سیر و سیاحت میسر نہیں، نہ سہی "ذکر العیش نصف العیش" پر قناعت کی۔ میاں داد خاں سیاح کی سرگذشتِ سیر و سفر ہی سہی۔

غزل تمھاری رہنے دیتا ہوں، اُس کے دیکھنے کی ابھی فرصت نہیں ہے۔ جیسا تم نے وعدہ کیا ہے، جب اور غزلیں بھیجو گے، اُن کے ساتھ اس کو بھی دیکھ لوں گا، بلکہ احتیاط مقتضی اس کا ہے کہ اُن غزلوں کے ساتھ اِس غزل کو بھی لکھ بھیجنا۔

ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی، گرانی، رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے، بڑا سفر دور دراز درپیش ہے۔ زادِ راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپُرسیدہ بخش دیا تو خیر، اور اگر باز پُرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے۔ دوزخِ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہاے کسی کا کیا اچھا شعر ہے :

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اللہ اللہ اللہ۔

صبح دوشنبہ ۳۱ دسمبر ۱۸۶۰ء — نجات کا طالب۔ غالب

(۵)

منشی صاحب!

تمھارے خط پہنچنے کی تم کو اطلاع دیتا ہوں اور مطالبِ مستفسرہ کا جواب لکھتا ہوں۔

اور اپنے دوستِ روحانی مرزا رجب علی بیگ سرور کو سلام کہتا ہوں، کہ دیجے گا بلکہ یہ رقعہ دکھا دیجے گا۔

بعض لوگ "آن بان" بولتے ہیں۔ مگر فقیر کے نزدیک "آن تان" صحیح ہے اور یہی فصیح ہے۔ "پر" بہ معنی "لیکن" لفظ مشہور ہے اور "پہ" اُس کا مخفف ہے۔ اِس میں شاید کسی کو کلام نہ ہو۔ کوئی اور لکھے یا نہ لکھے، میرے اردو کے دیوان میں سو دو سو جگہ یہ لفظ آیا ہوگا۔

مجھ کو بنگالے سے آئے بتیس تینتیس برس ہوئے۔ بہت احباب مر گئے۔ بہت متفرق ہو گئے۔ اب ایسا وہاں کوئی نہیں، جس سے ارسال رسائل کی رسم و راہ ہو۔

صاحب! وہ شعر جس کو تم نے پوچھا ہے یہ ہے:

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی

دو شعر اس غزل کے اور یاد آگئے ہیں وہ دوسرے صفحے پر لکھتا ہوں:

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

دیکھو یہ "پر" کا مخفف "پہ" ہے، بہ معنی لیکن۔

بنارس کا کیا کہنا ہے۔ ایسا شہر کہاں پیدا ہوتا ہے۔ انتہائے جوانی میں میرا وہاں جانا ہوا۔ اگر اُس موسم میں جوان ہوتا تو وہیں رہ جاتا اور ادھر کو نہ آتا۔

عبادت خانۂ ناقوسیان است
ہمانا کعبۂ ہندوستان است

جس بحر میں کوئی اسم یا کوئی لفظ نہ آسکے، اس کی تدبیر فردوسی و خاقانی سے بھی نہ ہوگی۔

میں کیا کروں گا؟ نام تمھارا آسکتا ہے لیکن "الف" دبتا رہتا ہے۔ خدا کے واسطے اس کی تدبیر سرور صاحب سے بھی ضرور پوچھنا۔

سہ شنبہ ۱۲ فروری سنہ ۱۸۶۱ء

نجات کا طالب۔ غالب

(۶)

منشی صاحب، سعادت و اقبال نشاں، سیف الحق میاں داد خاں سیاح کو دعا۔

صاحب وہم اور چیز ہے اور احتیاط اور چیز ہے۔ کارپردازانِ ڈاک میرے خطوط کے ٹکٹ کبھی نہ دبائیں گے اور میرے خطوط کبھی نہ تلف ہوں گے۔ آدھ آنے کی جگہ دو بست کا ایک آنہ کیوں کھوؤں؟

"گلشن" بعض کے نزدیک مؤنث اور بعض کے نزدیک مذکر ہے۔ "قلم" "دہی" "خلعت" ان کا یہی حال ہے۔ کوئی مؤنث کوئی مذکر بولتا ہے۔ میرے نزدیک "دہی" اور "خلعت" مذکر ہے۔ اور "قلم" مشترک۔ چاہو مذکر کہو، چاہو مؤنث۔ "گلشن" البتہ مذکر مناسب ہے۔ "رکھتہ ہے" بھائی! جہاں الف دبتا ہے، میرے کلیجے میں ایک تیر لگتا ہے۔ "رکھتا ہے گلشن" بھی یہ الف دبتا ہوا دیکھ کر میں نے "رکھتی ہے" بنا دیا۔ مگر "گلشن" مذکر مناسب ہے۔ "پھلکی" یا "پھلکا" تنہا بے معنی محض ہے۔ "ہلکی پھلکی" "ہلکا پھلکا" یوں آئے تو درست، ورنہ لغو۔ اور یہ جو "پھلکا" پتلی چپاتی کو کہتے ہیں، یہ دوسرا لغت ہے۔ "پھلکے" کبھی کوئی نہ بولے گا۔ "پانی وانی" "حقہ وقہ" یوں کہیں گے۔ "نرا" "وانی" اور نرا "وقہ" نہ کہیں گے۔ "ہلکا پھلکا" "ہلکی پھلکی" کہیں گے سبک چیز کو۔ نرا "پھلکا" یا نری "پھلکی" نہ کہیں گے۔ تذکیر و تانیث کے باب میں مرزا رجب علی بیگ سے مشورہ کر لیا کرو اور دیتے ہوئے حروف بھی ان سے پوچھ لیا کرو۔

جنوری یا فروری سنہ ۱۸۶۱ء

غالب

(۷)

بھائی!

ہم نے تم کو یہ نہیں کہا کہ تم مرزا رجب علی بیگ کے شاگرد ہو جاؤ اور اپنا کلام اُن کو دکھاؤ۔ ہم نے یہ کہا ہے کہ تذکیر و تانیث کو اُن سے پوچھ لیا کرو۔ دکھن بنگالے کے رہنے والوں کو اس امرِ خاص میں دلّی، لکھنؤ کے رہنے والوں کا تتبع ضرور ہے۔

ایک قاعدہ تم کو معلوم رہے: "عین" کا حرف فارسی میں نہیں آتا۔ جس لغت میں "عین" ہو اُس کو سمجھنا کہ عربی ہے۔ بعد معلوم ہونے اس قاعدے کے، یہ سمجھو کہ "غربال" غین نقطہ دار مکسور اور رائے قرشت اور بائے موحدہ اور لام یہ لغت فارسی ہے۔ ہندی اس کی "چھلنی" اور مرادف اس کی "پرویزن" یعنی فارسی میں "چھلنی" کو "غربال" اور "پرویزن" کہتے ہیں اور "چھلنی" ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کو کوئی نہ جانے۔ رہا "عُریال" یا "عِریال"، عین سعفص اور یائے تحتانی سے فصیح و غیر فصیح کیا بلکہ غلطِ محض و محض غلط ہے۔ ہاں، اگر عربی میں "چھلنی" کو "عریال" کہتے ہوں تو فارسی "غُربال" اور عربی "عریال"، مگر میں ایسا گمان کرتا ہوں کہ "غربال" کا عربی میں کچھ اور اسم ہوگا "عریال" نہ کہتے ہوں گے۔ اب تم سنو، فنِ لغت میں ایک امر ہے کہ اُس کو تصحیف کہتے ہیں یعنی لفظ کی صورت ایک ہو اور نقطوں میں فرق، جیسا کہ سعدی "بوستان" میں کہتا ہے:

مرا بوسہ گفتا بہ تصحیف — دہ
کہ درویش را توشہ از بوسہ بہ

"توشہ" و "بوسہ" و "نوشہ"، یہ تین لفظ مصحّفِ ہم دگر ہیں۔ حال آں کہ معانی میں وہ فرق کہ جیسا زمین و آسمان میں "توشہ" ترجمہ "زاد" کا "بوسہ" ترجمہ "قبلہ" کا "نوشہ" اسم "دولہ" کا۔ صاحبانِ فرہنگ میں "برہانِ قاطع" والا تصحیف میں بہت مبتلا ہے۔ "گزر" اور "زکرز" "خربزہ" اور "خربزہ" کہتا ہے کہ "سدا" بہ سینِ سعفص، لفظ فارسی ہے۔ بہ معنی "آواز" اور "صدا" بہ صاد تعریب ہے۔ جو لغات "تے" میں لکھے ہیں، انھیں لغات کو "طوے" میں لکھتا ہے۔ حالاں کہ جس طرح "عین" فارسی میں نہیں ہے "طوے" بھی نہیں ہے مثلاً "تشت" لغت فارسی الاصل ہے۔ املا اس کی "طوے" سے غلط ہے۔ "برہانِ قاطع" والا اس کو

"تے" سے بھی لایا ہے اور "طوے" سے بھی۔ محققین جانتے ہیں کہ "صدا" بہ معنی آواز لغت عربی الاصل ہے۔ نہ معرب اور "سدا" سین سے ہرگز فارسی میں آواز کو نہیں کہتے۔ ہاں اردو کے محاورے میں بہ معنی "ہمیشہ" کے مستعمل ہے۔ قصہ کوتاہ، "غربال" بہ معنی "چھلنی" کے لفظ فارسی الاصل صحیح اور فصیح ہے اور "غُربال" اگر کسی اور فرہنگِ عربی میں مثل "قاموس" اور "صراح" وغیرہ کے بہ معنی "چھلنی" کے نکلے تو اُس کو مانو، ورنہ یہ "برہانِ قاطع" والے کی خرافات میں سے ہے۔

۲۷ فروری ۱۸۶۱ء نجات کا طالب۔ غالب

(۸)

صاحب!

کل آپ کا خط آیا، میرا دھیان لگا ہوا تھا کہ آیا میاں سیاح کہاں ہیں اور مجھ کو کیوں بھول گئے ہیں؟ پہلا خط تمھارا جس کا حوالہ اس خط میں دیتے ہو، میں نے نہیں پایا۔ ورنہ کیا امکان تھا کہ جواب نہ لکھتا۔

جناب منشی میر امیر علی صاحب سے مجھ سے شاید ملاقات نہیں لیکن ان کے محامد و مکارم سنتا ہوں۔ جناب مولوی اظہار حسین صاحب سے البتہ اسی شہر میں دو ملاقاتیں ہوئی ہیں، لیکن میں نے اُن کو فقیر دوست اور درویش نواز نہ پایا۔ اغنیا کے واسطے اچھے ہیں۔ ہائے مولوی محمد محسن اور مولوی عبدالکریم، اس عہد میں اگر اُن بزرگوں میں سے ایک ہوتا تو میں کیوں اپنی قسمت کو روتا۔ وقت گزر جاتا ہے بات رہ جاتی ہے۔

ہاں، خاں صاحب، آپ جو کلکتے پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اُس نے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جزیرے میں اُس کا کیا حال ہے؟ گزارا کس طرح ہوتا ہے؟

جمعہ ۴ ماہ اکتوبر ۱۸۶۱ء غالب

(۹)

صاحب!

آج تمھارے کئی خطوں کا جواب لکھتا ہوں۔ مولوی کرامت علی صاحب میرے شفیق ہیں جس زمانے میں وہ دلّی آئے تھے، میری اُن کی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ وہ میرے دوست ہیں، شاگرد نہیں اور ہرگز قصیدہ انھوں نے میری مدح میں نہیں لکھا۔ آغا عبدالرزاق شیرازی نے گویا میری خستگی اور تہمت زدگی کا انتقام لیا۔ بہرحال میں تمھارا احسان مند ہوں، اگر تم وہاں نہ ہوتے تو میری اور میر منشی کی صفائی نہ ہوتی۔

اِن دنوں ضعفِ دماغ، دورانِ سر میں ایسا مبتلا ہوں کہ والیِ رام پور کا بھی بہت سا کلام یوں ہی دھرا ہوا ہے۔ دیکھنے کی بھی نوبت نہیں آئی۔ تمھاری بھیجی ہوئی غزلیں سب محفوظ دھری ہوئی ہیں۔ خاطر جمع رکھو۔ جب نواب صاحب کی غزلیں دیکھوں گا تو یہ بھی دیکھی جائیں گی۔

جب حال یہ ہو کہ اصلاح نہ دے سکوں تو فکرِ تاریخ کیا کروں؟ اگر میرا حال درست ہوتا تو جناب مولوی عبدالغفور خاں صاحب نسّاخ کے دیوان کی تاریخ ضرور لکھتا اور اس خدمت گزاری کو اپنی سعادت سمجھتا۔ آپ جناب مولوی صاحب سے میرا سلام کہیں اور یہ میرا رقعہ اُن کو دکھا دیں۔

چہارشنبہ ۲۰ نومبر ۱۸۶۱ء   نجات کا طالب - غالب

(۱۰)

جنابِ منشی صاحب!

آپ کا خط مع خطِ مہری لفٹنٹ گورنر آگرہ کہ وہ میرا بھیجا ہوا تھا، پہنچا۔ اُس کے بھیجنے کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ جب گورنمنٹ اعلےٰ نے مجھ کو خط لکھنا موقوف کیا تو لفٹنٹ گورنروں کے اگلے زمانے کے خطوط سے میرا کیا دل خوش ہوگا۔ ایسے ایسے پچاس ساٹھ خط میرے پاس موجود ہیں مجھ کو تو چھ آنے کے پیسوں کا افسوس ہے جو تم نے بابت محصول دیے۔

مرقومہ ۱۰ فروری ۱۸۶۳ء   راقم اسداللہ

(۱۱)

آیئے بیٹھیے، مولانا سیاح، سلام علیکم۔ مزاج مبارک یسورت کا پہنچنا بہ ہر صورت مبارک ہو۔ بھائی میرا دل بہت خوش ہوا کہ تم اپنے وطن پہنچے لیکن تم کو چین کہاں ؟ خدا جانے کے ہفتے یا کے مہینے ٹھہروگے اور پھر سیاحت کو نکلو گے۔ جی میں کہو گے آؤ اب دکن کی سیر کریں حیدرآباد اورنگ آباد دونوں شہر اچھے ہیں ان کو دیکھیں۔

مرزا معین الدین حسین خاں اور مرزا محمد حسین خاں، یہ دونوں بیٹے ہیں نواب قدرت اللہ بیگ خاں کے اور قدرت اللہ بیگ خاں ابن عم تھے، نواب احمد بخش خاں کے اور معین الدین حسین خاں کی بہن منسوب ہے بھائی ضیاء الدین خاں سے۔

یہاں کوئی امر نیا نہیں واقع ہوا۔ وہی حالات و اطوار ہیں جو دیکھ گئے ہو۔ مسجد جامع کے باب میں کچھ پرسشیں لاہور سے آئی تھیں۔ یہاں سے اُن کے جواب گئے ہیں۔ یقین ہے کہ واگزار کا حکم آ جائے اور مسلمانوں کو مل جائے۔ ہنوز بہ دستور پہرہ بیٹھا ہوا ہے اور کوئی جانے نہیں پاتا۔

والسلام مع الاکرام

صبح سہ شنبہ ۲ ذیقعدہ ۱۲۷۸ھ

۲۰ مئی ۱۸۶۲ء۔ مئی معاً

غالب

(۱۲)

صاحب!

میرا سلام۔ تمھارا خط پہنچا۔ دونوں غزلیں دیکھیں۔ خوش ہوا۔ فقیر کا شیوہ خوشامد نہیں، اور فنِ شعر میں اگر اس شیوے کی رعایت کی جاوے تو شاگرد ناقص رہ جاتا ہے۔ یاد کرو کبھی کوئی غزل تمھاری اس طرح کی نہیں ہوئی کہ جس میں اصلاح نہ ہوئی ہو خصوصاً روزمرہ اردو میں دونوں غزلیں لفظاً اور معناً بے عیب ہیں کہیں اصلاح کی حاجت نہیں۔ آفریں!

صد ہزار آفریں!

میر غلام بابا صاحب واقعی ایسے ہی ہیں جیسا تم لکھتے ہو۔ سیاحت میں دس ہزار آدمی تمھاری نظر سے گزرا ہوگا۔ اُس گروہ کثیر میں جو تم ایک شخص کے مداح ہو تو بے شک وہ شخص ہزاروں میں ایک ہے، لاریب فیہ۔

کیا فرمایش کروں اور کیا تم سے منگاؤں؟ وہاں کون سی چیز ہے کہ یہاں نہیں۔ آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں، انگور سے کم عزیز نہیں، لیکن بمبئی اور سورت سے یہاں پہنچنے کی کیا صورت؟ مالدے کا آم یہاں پیوندی اور ولایتی کر کے مشہور ہے۔ اچھا ہوتا ہے۔ کمال یہ کہ وہاں بہت اچھا ہوگا۔ سورت سے دلّی آم بھیجنے، محض تکلف ہے۔ روپیے کے آم، اور چار روپیے محصول ڈاک اور پھر سو میں سے شاید دس پہنچیں۔ میرے سر کی قسم، کبھی ایسا ارادہ نہ کرنا۔ یہاں دیسی انواع واقسام کے بہت پاکیزہ اور لذیذ اور خوشبو افراط سے ہیں، پیوندی آم بھی بہت ہیں۔ رام پور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آموں میں سے اکثر بہ سبیلِ ارمغان بھیجتے رہتے ہیں۔ لے لو! آج بریلی سے ایک بھینگی ایک دوست کی بھیجی ہوئی آئی۔ دو ٹوکرے، ہر ٹوکرے میں سو آم، کلو داروغہ نے میرے سامنے وہ ٹوکرے کھولے۔ دو سو میں سے تراسی آم اچھے نکلے اور ایک سو سترّ آم بالکل سڑے ہوئے۔

اوائل جون ماہِ حال میں ایک ہفتہ مینھ برس کر پھر اب وہی آگ برس رہی ہے اور لُو چل رہی ہے۔

سہ شنبہ ۱۷ جون ۱۸۶۲ء

(۱۳)

صاحب!

میں تم سے شرمندہ ہوں۔ پہلا خط تمھارا مع قصیدہ پہنچا۔ میں قصیدہ کسی کتاب میں رکھ کر بھول گیا۔ اب دوسرا خط دیکھ کر قصیدہ یاد آیا۔ ہر چند ڈھونڈا نہ پایا۔ بڑی بات یہ ہے

کہ اس قدر مجھ کو یاد ہے کہ اُسی وقت میں نے اُن اشعار کو سراسر دیکھ لیا تھا۔ اشعار سب ہموار۔ تھے، تم اندیشہ نہ کرو اور قصیدہ نذر گزارنو اور مع الخیر وطن کو جاؤ لیکن بھائی وطن پہنچ کر ضرور مجھ کو خط لکھنا اور اپنے گھر کا پتا لکھنا تا کہ میں اُس نشان سے تم کو خط بھیجوں۔

نواب میر غلام بابا خاں صاحب کو فقیر کی طرف سے سلام کہنا۔ فقط۔

صبح سہ شنبہ ۱۸ نومبر ۱۸۶۲ء

(۱۴)

منشی صاحب، سعادت و اقبال نشان۔

شکوہ تمہارا میرے سر آنکھوں پر، مگر کوئی خط تمہارا جواب طلب نہ تھا۔ اشعار کی اصلاح سے میں نے ہاتھ اُٹھایا۔ کیا کروں، ایک برس سے عوارضِ فسادِ خون میں مبتلا ہوں۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہوگیا ہے۔ طاقت نے جواب دیا۔ دن رات لیٹا رہتا ہوں۔ کھانا کھاتے کے وقت پلنگ پر سے اتر بیٹھتا ہوں۔ کھانا کھا کر ہاتھ دھو کر پھر پڑ رہتا ہوں۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے۔ اتر کے پیشاب کیا جاتا ہے۔ بیت الخلا جانا ایک مصیبت ہے۔ تشت چوکی سہی مگر کئی قدم جانا، پھر آنا، کیا ایسا آسان ہے۔ ایک کم ستّر برس کی عمر ہوئی۔ اب نجات چاہتا ہوں۔ بہت جیا، کہاں تک جیوں گا۔ اب تم دوسرے صفحے کو پڑھو جناب نواب سید غلام بابا صاحب کی خدمت میں میرا اسلام کہنا اور ولادتِ فرزند کی مبارک باد دینا اور یہ قطعہ تاریخ نذر کرنا۔

قطعہ

میر بابا یافت فرزندے کہ ماہِ چاردہ
برفرازِ لوحِ گردوں گردۂ تمثالِ اوست
فرخی بینی و یابی بہرہ از ناز و طرب
از سرِ ناز و طرب فرزند فرخ سالِ اوست

۱۲۸۰ھ "ناز" کے نون کے "پچاس" اور "طرب" کی "طوے" کے نو "فرزند فرخ"

پر بڑھائے ہوں گے۔

روز پنجشنبہ ۶ اگست ۱۸۶۳ء غالب

(۱۵)

خاں صاحب،

سعادت و اقبال نشان، میاں داد خاں سیاحؔ کو فقیر گوشہ نشین کا سلام پہنچے۔ تمھارا کوئی خط سوائے اس خط کے، جس کا میں جواب لکھتا ہوں، ہرگز نہیں پہنچا۔ بہت دن سے مجھ کو خیال تھا کہ مولانا سیاحؔ نے مجھ کو یاد نہیں کیا۔ کل ناگاہ تمھارا خط پہنچا، آج اُس کا جواب لکھتا ہوں۔

مُہر، میں تو کھودنے کا نہیں، جو اس قدر عذر چاہتے ہو، کھدوا دینے میں کیا تکلیف اور کیا زحمت۔ میں احباب کا خادم ہوں۔ میر غلام بابا خاں صاحب سے میرا سلام کہیے اور وہ نگین مع نقشہ بے تکلف بھیج دیجیے۔ آپ کے حکم کی تعمیل اور اُس نگین کی درستی ہو جاوے گی، خاطر عاطر جمع رہے، زیادہ کیا لکھوں؟

اجی سیاحؔ صاحب! ہمارا دھیان تم میں لگا رہتا ہے کبھی کبھی خط لکھتے رہا کرو۔ میں ایسا گمان کرتا ہوں کہ اگر میر غلام بابا خاں صاحب کو مُہر کھدوانی نہ ہوتی اور وہ تم سے نہ کہتے تو تم ہرگز مجھ کو خط نہ لکھتے۔ یہ تمھارا خط گویا میر غلام بابا خاں کے حسب الحکم تھا۔ جی میں آیا تھا کہ انھی کو اس کا جواب لکھوں اور اُن کے نام کا خط بھیجوں مگر پھر سوچا کہ تم آزردہ ہو جاؤ گے تمھیں کو خط لکھا۔ بھائی یہ طریقہ فراموش کاری کا اچھا نہیں، گاہ گاہ خط لکھا کرو۔ والسلام۔

سہ شنبہ یکم مارچ ۱۸۶۴ء[۲] نجات کا طالب۔ غالب

(۱۶)

صاحب!

یہ سر پیٹنے کی جگہ ہے کہ تمھارا کوئی خط ڈاک میں ضائع نہیں ہوتا اور میرا کوئی خط تم کو نہیں پہنچتا۔ سنو، چھوٹے صاحب کا خط آیا۔ اُس میں قطعے کا شکر اور اجزائے کتاب[۱] کے بھیجنے کی تاکید۔

میں نے اُس کے جواب میں لکھا کہ اُس کتاب کا چھاپا یہاں ہی شروع ہو گیا۔ اِنشاءُ اللہ تعالیٰ بعد انطباع ایک مجلد آپ کے واسطے اور ایک مجلد منشی میاں داد خاں کے واسطے بہ سبیلِ ڈاک پارسل بھیجوں گا۔ اب تم نواب صاحب سے میرا سلام کہو اور یہ اپنے نام کا خط اُن کو پڑھا دو اور ایک پتا تم کو دیتا ہوں۔ نواب صاحب کا جو خط طلبِ کتاب کے باب میں آیا تھا، اُس میں مندرج تھا کہ اب میں سورت کو جاتا ہوں۔ تم اجزاے کتاب کا پارسل اس پتے سے سورت کو بھیجنا۔ بھائی، میں نے اُسی پتے سے خط بھیجا تھا۔ نہ پہنچے تو میرا کیا گناہ۔ پیڈ خط گاہ گاہ تلف بھی ہو جاتا ہے۔ نظر اس بات پر، یہ خط تم کو بیرنگ بھیجتا ہوں تاکہ ضائع نہ ہونے کا احتمال قوی رہے۔

صبح شنبہ ۱۴ ربیع الثانی ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۷ ستمبر (سال حال) ۱۸۶۴ء غالب

(۱۷)

منشی صاحب!

یہ کیا اتفاق ہے کہ میری بات کوئی نہیں سمجھتا:

کس زبانِ مرا نمی فہمد
بہ عزیزاں چہ التماس کنم

یاد کرو اصل مقدمہ یہ تھا کہ میں "قاطع برہان" کو دوبارہ چھاپا چاہتا ہوں، نواب صاحب مدد دیں، یعنی سو دو سو جلدیں خرید لیں۔ حضرت نے ایک گھڑی عنایت فرمائی۔ بھلا یہ میرے کس کام کی؟ چار دن سوچا کیا کہ پھیر دوں، پھر سوچا کہ بُرا مانیں گے۔ آخر کو گھڑی رکھ لی اور یہ خیال کیا کہ کتاب کے انطباع کے بعد سو ڈیڑھ سو جلدیں بھیج دوں گا۔ اسی خط کے ساتھ نواب صاحب کے نام کا خط گھڑی کی رسید کا پہنچتا ہے اور یہ بھی تم کو معلوم رہے کہ گھڑی کی کنجی نہیں آئی۔ ظاہرا سہو سے وہیں رہ گئی ہو گی۔

ہاں صاحب، تیس جلدیں "لطائفِ غیبی" کی دو پارسلوں میں آگے بھیجی ہیں جس کی قیمت

دس روپیے مجھ کو پہنچی۔ فی الحال ایک جلد اور اپنی طرف سے بھیجی ہے۔ رسید جلد لکھو۔

۳ دسمبر ۱۸۶۴ء غالب

(۱۸)

سعادت و اقبال نشان، سیف الحق منشی میاں داد خاں سیاح کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔ خط میں آپ نے بہت سے مطالب لکھے، مگر تیس کتابوں کے دو پارسلوں کی رسید نہیں لکھی۔ یہ ایک پارسل جو بعد دو پارسلوں کے بھیجا گیا ہے، اُس میں وہی "لطائفِ غیبی" ہے جس کو میں نے اپنے مطالعے میں رکھ کر صحیح کیا ہے۔ اس کے بھیجنے سے مدعا یہ کہ تم اُن تیس رسالوں کو اس کے مطابق صحیح کر لو اور اگر چھوٹے صاحب نے رکھ لیا ہے تو اُن سے مستعار لے کر اپنی سب کتابیں صحیح کر لو اور وہ نسخہ اُن کی نذر کر دو۔

صاحب! میں نے اپنے صرفِ زر سے "لطائفِ غیبی" کی جلدیں نہیں چھپوائیں۔ مالکِ مطبع نے اپنی بکری کو چھاپیں۔ بیس میں نے مول لیں۔ تیس تم کو دلوادیں، بیس بھائی ضیاء الدین خاں نے لیں۔ دس مصطفیٰ خاں نے لیں۔ باقی کا حال مجھے نہیں معلوم۔

دیکھو سیف الحق! شیخ سعدی کا قول کیا سچا ہے۔

اگر دنیا نہ باشد دردمندم
وگر باشد، بہ مہرش پائے بندم
بلائے زیں جہاں آشوب تر نیست
کہ رنجِ خاطر است، ارہست ور نیست

جہاں دولت نہیں وہاں مصیبت ہے۔ جہاں دولت ہے وہاں خصومت ہے۔ میں تو میر غلام بابا خاں کا دوست ہوں، اُن کی فتح کی دعا مانگتا ہوں۔ آپ اتنی مہربانی کریں کہ یہ حالات جو واقع ہوا کریں، وہ مجھ کو لکھا کریں

"غربیلہ" کی ہندی "نخرہ" ہے۔ فارسی میں "غربیلہ" بولتے ہیں۔

پنجم شعبان ۱۲۸۱ھ مطابق ۳ جنوری ۱۸۶۵ء نجات کا طالب۔ غالب

(۱۹)

منشی صاحب سعادت و اقبال نشاں سیف الحق میاں داد خاں سلمکم اللہ تعالیٰ۔

فقیر کی طرف سے سلام و دعا قبول کریں۔ چھوٹے صاحب کی تصویر کی رسید میں بھائی محمد حسین خاں سے کہا گیا تھا کہ تم تصویر کے پہنچنے کی اطلاع دے دینا سو اب تمھاری تحریر سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اطلاع دی ہے۔ حال تصویر کا یہ کہ میں نے اُسے سر پر رکھا، آنکھوں سے لگایا، گویا چھوٹے صاحب کو دیکھا لیکن اس کا سبب نہ معلوم ہوا کہ نواب صاحب نے ہم سے بات نہ کی۔ خیر دیدار تو میسر ہوا۔ گفتار بھی اگر خدا چاہے گا تو سن لیں گے۔ دیکھو منشی صاحب آئینے کی تصویر کی صنعت کو سب پسند کرتے ہیں مگر فقیر اس کا معتقد نہیں۔ اب دیکھو حضرت کی تصویر میں کہنیوں تک ہاتھ کی تصویر ہے، آگے پہنچے اور پنجے کا پتا نہیں۔ مکالمہ یک طرف مصافحے کی بھی حسرت رہ گئی۔ اِس وقت جداگانہ خط لکھنے کی فرصت نہیں۔ نواب صاحب سے میرا بہت بہت سلام اور اشتیاق کہنا۔ بلکہ یہ خط اُن کو ضرور دینا کہ وہ پڑھ لیں۔ میں سادات کا نیازمند اور علی کا غلام ہوں:

بندۂ شاہ شمائیم و ثنا خوانِ شما

۱۷ ذیقعدہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۳ اپریل ۱۸۶۵ء　　　نجات کا طالب۔ غالب

(۲۰)

صاحب!

تمھارا مہربانی نامہ کہ گویا الفاظ اُس کے سراسر نواب میر غلام بابا خاں صاحب کی زبانی تھے پہنچا۔ جواب لکھتا ہوں اور پرسش کا شکر بجا لاتا ہوں ایک قرن بارہ برس سے فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور اپنے اشعار میرے پاس بھیجتے تھے اور سو روپیہ مہینا ماہ بہ ماہ بہ سبیلِ ہنڈوی بھجواتے تھے۔[۲] اس مغفور کی اندازہ دانی دیکھیے کہ مجھ سے کبھی اُس روپیے کی رسید نہیں لی۔ اپنے خط میں ہنڈوی بھیجا کرتے، میں خط کا جواب لکھ بھیجتا۔ اس ماہانہ کے

علاوہ کبھی دو سو کبھی ڈھائی سو بھیجتے رہتے۔ فتنہ و فساد کے دنوں میں قلعہ کی آمد مفقود، انگریزی پنشن مسدود۔ یہ بزرگوار وجہِ مقرری ماہ بہ ماہ اور فتوح گاہ بہ گاہ بھیجتا رہا۔ تب میری اور میرے متوسلوں کی زیست ہوئی۔ رئیسِ حال کو خدا بہ دولت و اقبال ابداً مو بداً سلامت رکھے، وجہِ مقرری کی ہنڈوی ہر مہینے بر حسبِ دستورِ قدیم اپنے خط میں بھیجے جاتا ہے۔ فتوح کی رسم دیکھیے جاری رہے یا نہیں۔

میرے پاس روپیہ کہاں جو "قاطعِ برہان" کو دوبارہ چھپواؤں؟ پہلے بھی نواب مغفور نے دو سو روپیے بھیج دیے تھے، تب پہلا مسودہ صاف ہو کر چھپوایا گیا تھا۔ اب بھی وعدہ کیا تھا کہ اپریل کی وجہِ مقرری کے ساتھ دو سو پہنچیں گے، وہ آخر اپریل ۱۸۶۵ء حال میں مر گئے۔ اپریل کا روپیہ رئیسِ حال سے میں نے پایا۔ مصرفِ کتاب کا روپیہ نہ آیا۔ یاد دلاؤں گا مگر اُس مرحوم کا وعدہ سر رشتۂ دفتر سے نہ تھا جو از روے دفتر اُس کی تصدیق ہو۔ بہ ہر حال فکر میں ہوں اگر اسباب نے مساعدت کی ہو المراد ورنہ:

آنچہ ما در کار داریم اکثرے در کار نیست

منشی صاحب، اِس خط کو ضروری جان کر بیرنگ بھیجتا ہوں۔

۳۰ جولائی ۱۸۶۵ء نجات کا طالب۔ غالب

(۲۱)

منشی صاحب، سعادت و اقبال نشاں، منشی میاں داد خاں سیاح، سیف الحق سلمکم اللہ تعالیٰ۔

دعا اور سلام اور شکر اور سپاس۔ تمھارا خط مرقومہ تیس اگست نزسونؔ بہ روز جمعہ آٹھ ستمبر ۱۸۶۵ء کو پہنچا۔ کل دسویں ستمبر ماہِ حال کو سو روپیے مندرجہ اُس کے، ایک صراف سے وصول ہو گئے۔ چھوٹے صاحب نے بڑی جواں مردی اور بڑی ہمت کی۔ اس صرف میں میرا کام ہوا اور اُن کا نام ہوا۔ اللہ اللہ۔ اب بھی ہندوستان میں ایسے لوگ ہیں کہ نہ میں نے اُن کو دیکھا نہ انھوں نے

مجھ کو دیکھا، نہ میرا کوئی حق اُن پر ثابت، نہ اُن کو کوئی خدمت مجھ سے لینی منظور۔ خیر، فقیر ہوں جب تک جیوں گا دُعا دوں گا۔ تمام عمر ممنون اور شرمندہ رہوں گا۔ تمھارا بھی احسان مانوں گا۔ اب دو ایک دن میں کاغذ آجائے تو اُس کا انطباع شروع ہو جائے۔ تم نواب صاحب کو میرا سلام کہو اور یہ خط دکھا دو اور عرض کرو کہ آج تک کسی بھائی یا کسی دوست کے روپیہ پیسے کا احسان مند نہیں ہوا تھا۔ اب احسان بھی اُٹھایا تو اپنے آقا یعنی علی مرتضیٰ علیہ السلام کے فرزند کا۔

وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملاّے مکتب دار کا خبط ہے، رحیم بیگ اُس کا نام، میرٹھ کا رہنے والا، کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ با وجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔ اُس کی تحریر میں نے دیکھی، تم کو بھی بھیجوں گا۔ مگر ایک بڑے مزے کی بات ہے کہ اُس میں بیشتر وہ باتیں ہیں، جن کو "لطائفِ غیبی" میں رد کر چکے ہو، بہرحال اُس کے جواب کی فکر نہ کرنا۔ والسلام والاکرام۔

دوشنبہ ۱۱ ستمبر ۱۸۶۵ء نجات کا طالب۔ غالبؔ

(۲۲)

منشی صاحب، سعادت و اقبال نشاں، سیف الحق میاں داد خاں، تم سلامت رہو۔ تمھارے خط کے صفحۂ سادہ پر یہ سطریں رقم کرتا ہوں تاکہ تم اپنے خط کے پہنچنے پر اطلاع پاؤ۔ "نامۂ غالبؔ" صاحبِ مطبع نے اپنی بکری کے واسطے نہیں چھاپی، جو میں مول لے کر بھیجوں اور تم سے اُس کی قیمت مانگ لوں۔ میں نے آپ تین سو جلد چھپوائی، دوستوں کو دُور و نزدیک بانٹ دی۔ آج یکشنبہ ہے، پارسل روانہ نہ ہوگا۔ جتنے یہ نسخے اب میرے پاس باقی ہیں، کل تمھیں بھیج دوں گا۔

ہاں صاحب، سو روپے کا نوٹ پہنچا اور روپیہ وصول ہوا۔ کاپی آج شروع ہو گئی۔ جس دن نوٹ پہنچا، اُس کے دوسرے دن روپیہ مل گیا۔ تیسرے دن میں نے تم کو تمھارے رجسٹری دار خط کا جواب لکھ بھیجا۔ یقین ہے کہ میرا خط پہنچ گیا ہوگا اور تم نے بموجب میری خواہش

کے نواب صاحب کو دکھا دیا ہوگا۔ کل حضرت کا بھی ایک خط آیا ہے، اُس کا جواب آج تمھارے خط کے ساتھ ارسال ہوتا ہے۔

بندہ پرور، سچ کہتے ہو رحیم بیگ کا وطنِ اصلی سردھنہ اور فی الحال میرٹھ میں مقیم اور معلّمی اُس کا پیشہ ہے اور آٹھ دس برس سے اندھا۔ نظم و نثر میں مولوی امام بخش صہبائی کا شاگرد، اور فارسی شعر کہتا ہے۔

یک شنبہ، ۱۷ ستمبر ۱۸۶۵ء   راقم۔ غالب علی شاہ

(۲۲۳)

صاحب!

میں خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ تم اپنے وطن گئے اور عزیزانِ وطن کو دیکھ کر خوش ہوئے، اور مع الخیر والعافیت اپنے محسن و مربی کی خدمت میں پھر آ پہنچے۔ نواب صاحب سے میرا بہت بہت سلام کہنا اور کہنا کہ اس خط میں سلام صرف وفورِ اشتیاق سے لکھا ہے، محبت نامہ جداگانہ جلد بھیجوں گا۔

اجی ہاں میاں سیف الحق، رام پور سے آکر تین سو جلدیں "درفش کاویانی" کی تیار پائیں۔ نواب میر غلام بابا خاں صاحب سے حصہ برادرانہ کیا، ڈیڑھ سو جلد کا پشتارہ بنایا، اس پر ٹاٹ لپٹوایا، ڈاک گھر بھجوایا، مسترد آیا۔ سرکاری ڈاک والوں نے ہرگز اُس کا بھیجنا نہ قبول کیا۔ ٹھیکے والے، پمفلٹ پاکٹ والے، ریل والے متفق اللفظ اُس کے ارسال سے انکار کرتے ہیں۔ تم یہ رقعہ حضرت کو پڑھواؤ اور اس باب میں جو وہ فرمائیں، وہ مجھ کو لکھو، مدعا یہ ہے کہ کسی طرح یہ پشتارہ وہاں تک پہنچ جائے۔ اِس خط کا جواب جس قدر جلد لکھو گے مجھ پر زیادہ احسان کرو گے۔

سہ شنبہ ۲۳ جنوری ۱۸۶۶ء   نجات کا طالب۔ غالب

(۲۴)

منشی صاحب، سعادت و اقبال نشان، سیف الحق میاں داد خاں کو فقیر اسد اللہ کا سلام۔

کل سہ شنبہ بیس فروری صبح کے وقت چھے پارسل چھتیس "درفش کاویانی" کے نواب میر غلام بابا خاں صاحب کی خدمت میں ارسال کیے۔ کل ہی شام کے وقت آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ حال معلوم ہوا۔ خیر، اب اور نہ بھیجوں گا۔

صاحب! یہ تم نے پانچ روپیے کے ٹکٹ کیوں بھیجے۔ میں نہ کتاب فروش، نہ دلال، یہ حرکت مجھے پسند نہ آئی اور تم نے بہت بُرا کیا۔ حضرت سولہ جلدیں "لطائفِ غیبی" کی بھیج کر اُس کے پان سات دن کے بعد بیس "نامۂ غالب" کا پارسل ارسال کیا ہے۔ "لطائف" کی رسید تم نے بھیج دی یقین ہے کہ "نامۂ غالب" کا پارسل بھی پہنچ جائے گا، گھبراؤ نہیں۔ نواب صاحب کی خدمت میں میرا سلام اور اشتیاقِ ملاقات عرض کرنا۔

۲۱ فروری ۱۸۶۶ء نجات کا طالب۔ غالب

(۲۵)

اقبال نشاں، سیف الحق کو دعا پہنچے۔ پانچ اشتہار اخبار کی خریداری کے اور تین اشتہار کتاب کی خریداری کے، آپ کے پاس پہنچتے ہیں۔ چھوٹے صاحب کو ملاحظہ کروائیے اور اطراف و جوانب دُور و نزدیک بھیجیے۔ جو صاحب کتاب اور اخبار دونوں کے خریدار ہوں، وہ دونوں کی خریداری کی اطلاع کا خط میر فخر الدین مہتمم اکمل المطابع کے نام لکھیں اور وہ خط میرے پاس بھیج دیں۔ جو صاحب فقط اخبار کے خریدار ہوں وہ اُس کے خریدنے کی اطلاع کا خط، جو صاحب فقط کتاب کے خریدار ہوں، وہ اُس کی اطلاع کا خط لکھیں۔

۲۲ مارچ ۱۸۶۶ء غالب

(۲۶)

مولانا سیف الحق!

اب تو کوئی خط تمھارا نوٹ اور ہنڈوی اور ٹکٹ سے خالی نہیں ہوتا۔ بھلا یہ تو فرمائیے

کہ یہ ڈھائی روپیے کس بابت کے اور کس جنس کی قیمت کے ہیں۔ اگلے پانچ روپیے پر میں بے مزا ہوا تھا، یہ ڈھائی اور طرہ ہوئے۔ بہ ہر حال اُن کا حال لکھو کہ کیسے ہیں اور کاہے کے ہیں۔ اِس رقعہ کا جواب جلد لکھو۔ ٹوپیاں بعد عید بھیجی جائیں گی۔

۲۳ اپریل سنہ ۱۸۶۶ء عنایت کا طالب ۔ غالب

(۲۷)

بھائی سیف الحق!

تمھارا خط پہنچا۔ قاضی صاحب بڑودہ کو معاف رکھو۔ اگر کوئی وجہ اپنے پر، اُن کے عتاب کی پاتا تو اُن سے عذر کرتا اور اپنا گناہ معاف کرواتا۔ جب سبب ملال کا ظاہر نہیں تو میں کیا کروں ؟ تم بُرا نہ مانو۔ کس واسطے کہ اگر میں بُرا ہوں تو اُس نے سچ کہا اور اگر میں اچھا ہوں اور اُس نے بُرا کہا تو اُس کو خدا کے حوالے کرو۔

غالبؔ بُرا نہ مان جو دشمن بُرا کہیں
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

صاحب، کیوں اِس بڑھاپے میں تصویر کے پردے میں کھچا کھچا پھروں ؟ گوشہ نشین آدمی، عکس کی تصویر اتارنے والے کو کہاں ڈھونڈوں ؟ دیکھو ایک جگہ میری تصویر بادشاہ کے دربار میں کھچی ہوئی ہے، اگر ہاتھ آجاوے گی تو وہ ورق بھیج دوں گا۔

اجی، وہ تو میں نے نواب صاحب کو ہنسی سے ایک بات لکھی تھی، دوستانہ اختلاط تھا، کہ کبھی میں بہرا ہوں، گانا کیا سنوں گا۔ بوڑھا ہوں، ناچ کیا دیکھوں ؟ غذا چھے ماشے آٹا، کھانا کیا کھاؤں ؟ بمبئی، سورت میں انگریزی شرابیں اچھی ہوتی ہیں، اگر وہاں آتا اور شریک محفل ہوتا تو پی لیتا۔

۵ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء نجات کا طالب ۔ غالب

(۲۸)

منشی صاحب!

وہی جہاں، وہی زمین، وہی آسمان، وہی سورت بمبئی، وہی دلی، وہی نواب میر غلام بابا خاں، وہی سیف الحق سیاح۔ وہی غالب نیم جاں۔ انگریزی ڈاک جاری، ہرکاروں کو ریل کی سواری۔

ربیع الاوّل میں تمھارا خط آیا۔ ربیع الثانی، جمادی الاول، جمادی الثانی، رجب، آج شعبان کی چھبیس ہے۔ صبح کے وقت یہ خط لکھ رہا ہوں۔ آٹھ بج گئے ہیں۔ اس وقت تک نہ کوئی تمھارا خط آیا، نہ کوئی نواب صاحب کا عنایت نامہ۔ واسطے خدا کے میرے اس خط کا جواب جلد لکھو اور اُس خط میں ترکِ نامہ و پیام کا سبب لکھو۔

آج ہی کے دن ایک پارسل چھے ٹوپیوں کا ارسال کرتا ہوں۔ خدا کرے پارسل پہنچ جائے اور ٹوپیاں تمھارے پسند آئیں۔

نواب صاحب کی خدمت میں میرا سلام پہنچانا اور عتاب کی وجہ دریافت کرکے لکھنا۔

۳ جنوری ۱۸۶۷ء نجات کا طالب — غالب

خط بیرنگ ہے اور پارسل پیڈ

(۲۹)

صاحب!

تمھارے خط کے پہنچنے سے کمال خوشی ہوئی۔ ٹوپیاں اگرچہ تمھارے سر پر ٹھیک نہ آئیں، لیکن ضائع نہ گئیں۔ میرے شفیق اور تمھارے مربی کے صرف میں آئیں۔ تم کو اور ٹوپیاں بھیجوں گا۔

مصوّر سے سخت عاجز ہوں۔ وعدہ ہی وعدہ ہے، وفا کا نام نہیں۔

"کلیات میر تقی" کا انتخاب تمھارے خط کے پہنچنے سے دو دن پہلے میر فخر الدین نے ارسال کردیا۔ ٹکٹ اُن کے حوالے کردیے۔

حضرت بہتان لگانے کی خو کس سے سیکھے ہو؟ میرے پاس کوئی غزل تمھاری نہیں ہے۔

نواب صاحب کو سلام کہنا اور میری زبانی کہنا کہ ٹوپیوں کو میرا ارمغان سمجھنا، سیف الحق کی نذر تصور نہ کرنا۔

۲۵ جنوری ۱۸۶۷ء نجات کا طالب - غالب

(۳۰)

منشی صاحب شفیق، بدل مہرباں، عزیز تر از جاں، سیف الحق میاں داد خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔

پرسوں نواب صاحب کا خط اور کل تمھارا خط آیا۔ صاحب ٹوپیوں کی حقیقت یہ ہے کہ تم نے "لطائفِ غیبی" کی پندرہ جلدیں سات روپیے آٹھ آنے دام بھیج کر منگوائیں۔ پھر دو روپیے کے ٹکٹ بھیج کر ٹوپیاں منگائیں۔ میں نے تمھارے بھیجے ہوئے روپیوں کی ٹوپیاں خرید کر کے تم کو بھیج دیں۔ چاہو تم پہنو، چاہو چھوٹے صاحب کی نذر کرو۔

یہ جو میں نے "سیف الحق" خطاب دیا ہے، اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ تم میرے ہاتھ ہو، تم میرے بازو ہو، میرے نطق کی تلوار تمھارے ہاتھ سے چلتی رہے گی۔ "لطائفِ غیبی" نے اعدا کی دھجیاں اُڑا دیں!

ایک نئی بات سنو، محمد مرزا خاں میرے سببی بھائی کا نواسا ہے۔ اُس نے ایک اخبار نکالا ہے۔ مسمیٰ بہ "اشرف الاخبار" اُس کا ایک لفافہ تم کو بھیجتا ہوں۔ اس کو پڑھ کر معلوم کر لو گے کہ تمھارا ایک اعتراض قتیل کے کلام پہ چھاپا گیا ہے؟ اس ارسال و اعلام سے صرف اطلاع منظور ہے۔ ہاں ایک بات یہ بھی ہے کہ چھوٹے صاحب کی بھی نظر سے گزر جائے اور اُس سرکار میں یہ اخبار خرید کیا جائے اور تم اُن کی طرف سے حکمِ خریداری ابتدائے جنوری ۱۸۶۷ء سے بہ نام محمد مرزا خاں لکھو اور وہ خط اُس پتے سے دلّی کو روانہ کرو، جو اُن کے اخبار کے آخر میں لکھا ہے۔

حیران ہوں کہ چھوٹے صاحب کے خط کا کیا جواب لکھوں۔ انھوں نے مجھے شرمندہ کیا، اپنے

کو چھوٹا اور مجھ کو بزرگ لکھا۔ سید تو سب مسلمانوں کے بزرگ ہوتے ہیں۔ میں تو مسلمانوں میں بھی ایک ذلیل، علیل، فقیر، حقیر آدمی ہوں۔ یہ اُن کی بزرگی، اُن کی خوبی، اُن کی مہربانی۔ حق تعالیٰ اُن کو سلامت رکھے اور ان مقدمات میں من کلّ الوجوہ اُن کو فتح و ظفر نصیب ہو۔ میرا اسلام کہنا اور یہ عبارت پڑھا دینا۔

ہاں صاحب، برادر صاحب بہ جان برابر مرزا معین الدین حسین خاں بہادر کو میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ بھائی میرا جی دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔ پہلے برخوردار شہاب الدین خاں سے صلاح پوچھو، وہ اجازت دے تو فوراً ریل بیل کرتے چلے آؤ۔

سہ شنبہ ۷ شوال ۱۲۸۳ھ

۱۲ فروری ۱۸۶۷ء دیدار کا طالب۔ غالب

(۳۱)

بھائی!

تم جیتے رہو اور مراتب عالی کو پہنچو۔ لو ایک ہنسی کی بات سنو، تمہارا خط منشی کنہیا لال کے نام کا میرے پاس آیا۔ ہر چند میں نے خیال کیا، اس نام کا کوئی آشنا مجھے یاد نہ آیا۔ یہ نادانی اُن کی کہ مجھ سے کہہ نہ دیا کہ میرے نام کا خط آئے تو میرے پاس بھیج دینا۔ بے خبری میں جو خط آیا، میں نہ نام سے واقف، نہ مقام سے واقف، خط پھیر نہ دوں تو کیا کروں؟ خط کے واپس کرنے کے بعد ایک دن آپ بھائی مرزا محمد حسین خاں کے ساتھ میرے پاس آئے اور تعارفِ قدیم یاد دلایا۔ دیکھنا میاں کیا خوب بیان ہے، فرماتے ہیں کہ: "میں غدر سے پہلے دو تین بار تیرے پاس حاضر ہوا ہوں۔" انصاف کرو، دو تین ملاقاتیں اور دس گیارہ برس کی بات، میں نسیاں کا پتلا، میرا قصور کیا؟ بہ ہر حال یہ شریف ہیں اور عمدہ روزگار کیے ہوئے ہیں۔

صاحب! میں نے "اودھ اخبار" میں دیکھا کہ چھوٹے صاحب مقدمہ جیتے، اور بمبئی کے صاحبوں میں اُن کی افزایشِ جاہ و جلال و تعظیم و توقیر کمال ہوئی۔ میں تو تہنیت میں خط لکھوں گا

مگر رشک آتا ہے کہ بہ حوالہ "اودھ اخبار" لکھوں اور بہ حوالہ سیف الحق نہ لکھوں۔

زیادہ زیادہ۔

۳۱ مارچ ۱۸۶۷ء اسداللہ خاں غالب

(۳۲)

منشی صاحب!

سعادت و اقبال نشاں، عزیز تر از جاں، سیف الحق میاں داد خاں سیاح کو غالب کی دعا پہنچے۔ پرسوں ایک خط تمھارا اور ایک خط چھوٹے صاحب کا پہنچا۔ تمھارے خط میں پچاس پچاس روپیے کے دو نوٹ پہنچے۔ سو روپیے وصول ہو گئے۔ آج تم کو اطلاع اور نواب صاحب کو شکریہ لکھ کر روانہ کرتا ہوں۔

بھائی! تم نے اخبارِ اطراف و جوانب میں میرا حال دیکھا ہوگا۔ میں اب محض نکما ہو گیا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے پچاس جگہ سے اشعار واسطے اصلاح کے آئے ہوئے بکس میں دھرے ہیں۔ از آں جملہ تین صاحبوں کے نام تم کو لکھتا ہوں۔ میر ابراہیم علی خاں صاحب، میر عالم علی خاں صاحب، نواب عباس علی خاں، رئیسِ حال رام پور کے حقیقی ماموں، غرض کہ اُنھیں اوراق میں تمھارے کاغذ بھی دھرے ہوئے ہیں۔ جس دن ذرا افاقت پاؤں گا تو اُن سب کاغذ کو دیکھوں گا۔

۲۳ اپریل ۱۸۶۷ء

(۳۳)

بھائی!

تمھارا خط کل پہنچا۔ آج جواب لکھتا ہوں۔ پہلے یہ پوچھتا ہوں کہ میری طرف سے جو اعتذار چھپا ہے، وہ تمھاری نظر سے گزرا ہے یا نہیں؟ نہ گزرا ہو تو "اکمل الاخبار" ماہِ شوال کے چاروں ہفتے کے دو ورقے دیکھ لو، ایک ہفتے میں نکل آئے گا۔

واقعی اعتراض کے جواب ایک مولوی نے لکھے ہیں۔ اس ہفتے کے "اکمل الاخبار" میں دیکھ لو۔ جو تم سے کلام کرے، اُسی انداز سے تم بھی کلام کرو۔

۲۹ اپریل ۱۸۶۷ء

نجات کا طالب - غالبؔ

(۳۴)

منشی صاحب! سعادت و اقبال نشاں، سیف الحق، منشی میاں داد خاں سیاح کو غالبِ ناتواں نیم جاں کی دعا پہنچے۔

بھائی! میرا حال اِسی سے جانو کہ اب میں خط نہیں لکھ سکتا۔ آگے لیٹے لیٹے لکھتا تھا۔ اب رعشہ و ضعفِ بصارت کے سبب سے وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ جب حال یہ ہے تو کہو، صاحب، میں اشعار کو اصلاح کیوں کر دوں؟ اور پھر اس موسم میں کہ گرمی سے سر کا بھیجا پگھلا جاتا ہے، دھوپ کے دیکھنے کی تاب نہیں۔ رات کو صحن میں سوتا ہوں۔ صبح کو دو آدمی ہاتھوں پر لے کر دالان میں لے آتے ہیں۔ ایک کوٹھری ہے اندھیری، اُس میں ڈال دیتے ہیں، تمام دن اُس گوشۂ تاریک میں پڑا رہتا ہوں۔ شام کو پھر دو آدمی بہ دستور لے جا کر پلنگ پر صحن میں ڈال دیتے ہیں۔ تمھاری غزلیں، میر ابراہیم علی خاں بہادر کی غزلیں، میر عالم علی خاں کی غزلیں، حکیم میر احمد حسن صاحب کی غزلیں اور کیا کہوں کس کس کی غزلیں، یہ سب ایک جگہ دھری ہوئی ہیں۔ اگر کوئی دن زندگی اور ہے اور یہ گرمی خیر سے گزر گئی تو سب غزلوں کو دیکھوں گا۔

تصویر کا حال یہ ہے کہ مصوّر صاحب، میرے دوست میرے چہرے کی تصویر اتار کر لے گئے۔ اس کو تین تین مہینے ہوئے، آج تک بدن کا نقشہ کھینچنے کو نہیں آئے۔ میں نے گوارا کیا آئینے پر نقشہ اتروانا بھی، ایک دوست اس کام کو کرتے ہیں۔ عید کے دن وہ آئے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ بھائی میری شبیہ کھینچ دو۔ وعدہ کیا تھا کہ کل تو نہیں پرسوں اسباب کھینچنے کا لے کر آؤں گا۔ شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم، صفر یہ پانچواں مہینا ہے آج تک نہیں آئے۔

آغا غلام حسین خاں صاحب کا قطعہ پہنچا۔ اُس میں کچھ تو شعر اصلاح طلب بھی تھے اب اصلاح دے کون؟ میں تو اپنی مصیبت میں گرفتار۔ بارے، ایک میرا شاگردِ رشید منشی ہرگوپال تفتہ بہ سواری ریل میرے دیکھنے کو آیا تھا، اُس کو موقع و محل بتا دیا۔ جو میں کہتا گیا، اُسی طرح وہ بناتا گیا۔ وہ قطعے کا کاغذ بعد اصلاح کے "اکمل المطابع" میں بھیج دیا۔ ہفتۂ آیندہ میں تم بھی دیکھ لوگے۔

۱۱ جون ۱۸۶۷ء مرگِ ناگاہ کا طالب ۔ غالب

(۳۵)

نورِ چشمِ اقبال نشان سیف الحق، میاں داد خاں سیاح کو غالبِ نیم جاں کی دعا پہنچے۔

واقعی تمھارے دو خط آئے ہیں۔ آگے میں لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا۔ اب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہاتھ میں رعشہ، آنکھوں میں ضعفِ بصر، کوئی متصدی میرا نوکر نہیں۔ دوست آشنا کوئی آجاتا ہے تو اُس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔

بھائی! میں تو اب کوئی دن کا مہمان ہوں اور اخبار والے میرا کیا حال جانیں؟ ہاں "اکمل الاخبار" اور "اشرف الاخبار" والے کہ یہ یہاں کے رہنے والے ہیں اور مجھ سے ملتے رہتے ہیں، سو اُن کے اخبار میں میں نے اپنا حال مفصل چھپوا دیا ہے اور اس میں میں نے عذر چاہا، خطوں کے جواب سے اور اشعار کی اصلاح سے۔ اُس پر کسی نے عمل نہ کیا۔ اب تک ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار واسطے اصلاحوں کے چلے آتے ہیں اور میں شرمندہ ہوتا ہوں۔ بوڑھا، اپاہج، پورا بہرا، آدھا اندھا، دن رات پڑا رہتا ہوں۔ حاجتی پلنگ کے تلے دھری رہتی ہے۔ تشت چوکی پلنگ کے پاس لگا رہتا ہے۔ سو تشت چوکی پر تیسرے چوتھے دن اتفاق جانے کا ہوتا ہے اور حاجتی کی حاجت بہ سبب سُرعتِ بول کے، گھنٹہ بھر میں پانچ چھے بار ہوتی ہے۔

تصویر کھینچنے والا جو ہندوستانی ایک دوست تھا، وہ شہر سے چلا گیا۔ ایک انگریز ہے

وہ کھینچتا ہے۔ مجھ میں اتنا دم کہاں کہ کوٹھے پر سے اتروں۔ پالکی میں بیٹھوں اور اُس کے گھر جاؤں اور گھنٹے دو گھنٹے کرسی پر بیٹھوں اور تصویر کھچوا کر جیتا جاگتا اپنے گھر پھر آؤں۔

اب تم از راہِ مہربانی میر ابراہیم علی خاں بہادر اور حکیم سید احمد حسن صاحب کو اور جب بمبئی سے آجائیں تو نواب غلام بابا خاں کو یہ خط پڑھوا دینا۔

تمھارے ہاں لڑکے کا پیدا ہونا اور اُس کا مرجانا معلوم ہو کر مجھ کو بڑا غم ہوا۔ بھائی اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ چوہتر برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوئے، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی، اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہیں ہوئی۔ تم ابھی جوان ہو۔ حق تعالیٰ تمھیں صبر اور نعم البدل دے۔ والسلام۔

۲۵ اگست ۱۸۶۷ء غالب

چودھری عبدالغفور سرور

(۱)

میرے کرم فرما، میرے شفیق!

شعر[۱]:

شرط اسلام بود ورزش ایماں بالغیب
اے تو غائب زنظر مہرِ تو ایمانِ منست

آپ کے اس خط کا جواب، بعد لکھنے اس شعر کے مختصر اس التماس پر ہے کہ میری طرف سے تحریرِ جوابِ خط میں کبھی تقصیر نہ ہوگی لیکن اغلبؔ و اکثر ابتدا بہ تحریر نہ ہوگی۔

یہ خط ناچار از روے اضطرار واپس بھیجتا ہوں۔ واسطے خدا کے، میرے پیرومرشد[۲] کے ارشادات کو ایک اور کاغذ پر اپنے ہاتھ سے نقل کر کر جلد بھیجیے تاکہ مجھ بدنصیب کو معلوم ہو کہ حضرت نے کیا لکھا ہے؟

جناب چودھری غلام[۳] رسول صاحب کی خدمت میں سلام نیاز۔ اُستاد شیخ[۴] عطا حسین صاحب کی جناب میں سلام۔

قبل مارچ ۱۸۵۸ء[۵]

(۲)

چودھری صاحب شفیق مکرم کی خدمت میں بعد ارسالِ سلامِ مسنون عرض کرتا ہوں
کہ آپ نے ذرہ پروری اور درویش نوازی کی ورنہ میں سزاوارِ ستایش نہیں ہوں۔ ایک
سپاہی زادہ، ہیچ مداں اور پھر دل افسردہ و رواں فرسودہ، ہاں ایک طبعِ موزوں اور
فارسی زبان سے لگاؤ رکھتا ہوں اور یہ بھی یاد رہے کہ فارسی کی ترکیبِ الفاظ اور فارسی
اشعار کے معنی کے پرداز میں میرا قول اکثر خلافِ جمہور پایئے گا اور حق بہ جانب میرے ہوگا۔
پہلے میں حضرت سے پوچھتا ہوں کہ یہ صاحب، جو شرحیں لکھتے ہیں، کیا یہ سب ایزدی
سروش ہیں اور ان کا کلام وحی ہے؟ اپنے اپنے قیاس سے معنی پیدا کرتے ہیں۔ یہ میں
نہیں کہتا کہ ہر جگہ اِن کا قیاس غلط ہے مگر یہ بھی کوئی کہہ نہیں سکتا کہ جو کچھ یہ فرماتے
ہیں، وہ صحیح ہے۔ اسی چھاپے میں کہ جس کا آپ حوالہ دیتے ہیں "بمنکہ باشم عقل کُل[۱] الخ" اس
شعر کی شرح کو ملاحظہ کیجے۔ عبارت وہ تعقید سے لبریز کہ مقصود شارح کا سمجھا بھی نہیں
جاتا اور جب غور و تامل کے بعد سمجھ لیجے تو وہ معنی ہرگز لائق اس کے نہیں ہیں کہ فکرِ سلیم اُس
کو قبول کرے۔ پھر: "احسان تو بشگافتہ[۲] الخ" اس مصرعے کی توجیہہ کتنی بے مزہ اور بے نفع
ہے؟ عرفی کو کہاں سے لاؤں جو اُس سے پوچھوں کہ بھائی تو نے اس شعر کے کیا معنی رکھے
ہیں؟ قصہ کوتاہ:

قطعہ[۳]

دیواں گری محبتِ تو
کامروز مسلم است مارا
بیگانہ زتاج کرد تارک
آوارہ زکفش کرد پارا

جیسا کہ دوسرے شعر کے مفہوم کو شارح کہتا ہے کہ دیوانگی میں یہ حالت بعید نہیں،
ایسا ہی اگر کوئی کہے کہ منصب دیوانی سے یہ بات بعید ہے تو پھر شارح کیا جواب

دے گا؟ ہاں یہ کہے گا کہ غلبۂ محبت میں پاسِ وضع نہ رہا اور دیوان جی صاحب کچہری سے ننگے سر اور ننگے پاؤں نکل بھاگے۔ ہم نے مانا مگر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ "دیوانگی" کیوں نہ لکھیں کہ دوسرے شعر کے معنی بے تکلف منطبق ہو جائیں اور توجیہات درمیان نہ آئیں۔ فقیر کے نزدیک "دیوانگیِ محبت" تو صحیح اور بے تکلف ہے اور "دیوانگی و محبت" تو غلط محض اور "دیوانگریِ محبت" تو تکلفِ محض۔ دیوانگی اور محبت دو صفتیں کیوں جمع کریں۔ غور کیجے، عطف کی واو یہ چاہتی ہے کہ یہ شخص پہلے سے دیوانہ تھا اور پھر اُسی حالت میں اُس کو محبت پیدا ہوئی۔ دیوانگی میں تاج و کفش بے جا تھے۔ محبت پیدا ہونے کے بعد یہ حالت طاری ہوئی۔ کیا بے مزہ توجیہہ ہے۔ "ہاں" "دیوانگیِ محبت" یعنی وہ جنون جو فرطِ محبت میں بہم پہنچا، اُس نے اس احوال کو پہنچایا۔ فقیر "دیوانگیِ محبت" کہے گا اور دیوانگی و محبت کہنے کو منع کرے گا اور "دیوانگریِ محبت" کہنے کو نہ مانع آئے گا نہ تسلیم کرے گا۔ زیادہ اس سے کیا عرض کروں۔ یاد آوری اور مہر گستری کا شکر بجا لاتا ہوں اور بس۔

اب یہاں سے روئے سخن حضرت پیر و مرشد صاحب عالم کی طرف ہے۔ اپنے مخدوم و مطاع حضرت صاحب کی خدمت میں بندگی عرض کرتا ہوں اور حیران ہوں کہ اور کیا کہوں۔ یہ مدعا چودھری صاحب کی تحریر سے معلوم ہو گیا تھا، اُس کا جواب لکھا گیا۔ حضرت کے دستخطِ خاص کی لکھی ہوئی عبارت سے جو سمجھتا ہوں اُس کا جواب لکھتا ہوں اور جو کچھ مجھ سے نہیں پڑھا گیا وہ تعویذِ بازو کر رکھتا ہوں۔ اگر بہ فرضِ محال کبھی ملاقات ہو گی تو آپ سے دریافت کر کے پاسخ گزار ہوں گا۔

ہاں، حضرت سچ ہے، میر ابن حسن خاں میرے دوست ہیں اور مرزا عباس میرا بھانجا۔ فتنہ و فساد کے زمانے میں بلگرام میں رہا اور اب وہ فرخ آباد میں ڈپٹی کلکٹر ہے۔

آپ کی اور بھائی منشی نبی بخش صاحب کی ملاقات سے میرا دل بہت خوش ہوا۔ یاد

رہے سخن فہمی اس بزرگوار کا حق ہے۔ اب آگرے میں بیکار اور پنشن کے امیدوار ہیں:

تا ہر چہ گفتی از تو مکرّر شنودمی

"شدی" کی رعایت سے کہ وہ بہ یاے مجہول ہے 'بہ معنی می شد' اکثر صاحب "گفتی" کو بھی بہ یاے مجہول پڑھتے ہیں تاکہ "میگفت" کے معنی پیدا ہوں۔ اس صورت میں خطاب سے بہ طرف غیبت کے رجوع کرتے ہیں اور "گفتی" بہ یاے معروف سے صیغۂ واحد حاضر ہے۔ ازمنہ میں سے اشعار زمانہ ماضی رکھتا ہے اور "شدن" اور "شود" یہ سب استقبال کے مقتضی ہیں اور معروف "گفتی" ماضی ہے۔ پس اگر "گفتی" بہ یاے معروف کہیے تو اوپر کے مصرعے میں "بدے" کہنا ہوگا۔ "بودے" کا مخفف۔ خلاصہ یہ کہ اگر وہاں "بدے" کہیے تو یہاں "گفتی" بہ یاے معروف بے تکلف درست اور بہ یاے مجہول غلط ہے اور اگر وہاں "شدے" کہیے تو یہاں "گفتے" بہ یاے مجہول کہیے۔ غیبت اور خطاب کا تفرقہ مٹا دیجے۔ "گفتے" بہ یاے مجہول میں خطاب حاضر مقدر رہتا ہے اور "تو" کا لفظ جو قریب ہے، وہ اس معنی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ نظائر اس کے فارس میں بہت ہیں۔

رباعی کے باب کی پرسش ہرگز نہ رہے، نہیں کہی زیادہ حدّ ادب۔

مارچ یا اپریل ۱۸۵۵ء

(۳)

بندہ پرور!

مہربانی نامہ آیا۔ سر پہ رکھا، آنکھوں سے لگایا۔ فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبیعت کی ہے، پھر تتبّع کلام اہل زبان لیکن نہ اشعار قتیل و واقف و شعراے ہندوستان، کہ یہ اشعار سواے اس کے کہ اُن کی موزونی طبع کا نتیجہ کہیے اور کسی تعریف کے شایاں نہیں ہیں۔ نہ ترکیب فارسی، نہ معنی نازک۔ ہاں الفاظ فرسودہ عامیانہ جو اطفال دبستان جانتے ہیں اور جو متصدی نثر میں درج کرتے ہیں، وہ الفاظ فارسی یہ

لوگ نظم میں خرچ کرتے ہیں۔ جب رودکی و عنصری و خاقانی و رشید وطواط اور اُن کے امثال و نظائر کا کلام باستیفا دیکھا جائے اور اِن کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہنچے اور ذہن اعوجاج کی طرف نہ لے جائے، تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے۔

"منکہ باشم" اس کی جو شرح چھاپے میں لکھی ہے اُس کو ملاحظہ کیجیے اور معنی میرے خاطر نشان کیجیے تو میں سلام کروں۔

پہلے نظر یہاں لڑنی چاہیے کہ "از اوجِ بیان انداختہ" کا فاعل کون ہے اور مفعول کون ہے؟ اگر "عقل کل" کو "انداختہ" کا مفعول اور "منکہ" کے کاف کو کدامیہ ٹھہراؤ گے تو بے شبہ "انداختہ" کے فاعل دو ٹھہریں گے: ایک "ناوک اندازِ ادب" اور ایک "مرغِ اوصافِ تو" ایک فعل اور دو فاعل، یہ کیا طریق اور کیسی تحقیق ہے؟

اب فقیر سے اس کے معنی سنیے: "من انداختہ" کا مفعول "را" مقدر "منکہ" کا کاف توصیفی "ناوک اندازِ ادب" "ادب آموز" یعنی استاد" مرغِ توصیفِ تو" فاعل۔ مجھ کو کہ "عقل کل" کا استاد ہوں، تیرے مرغِ توصیف نے اوجِ بیان سے گرا دیا "عقل کل" تک کہ وہ علویوں میں اعلیٰ ہے۔ اس کا ناوک پہنچ سکتا تھا، مگر "مرغِ اوصاف" اس مقام پر ہے کہ جہاں اس ناوک انداز کو ناوک پہنچانے کی گنجایش نہیں۔ اوجِ بیان سے گرنا، عاجز آجانا ہے، قدرت وہ کہ "عقل کل" سے بھی زیادہ اور عجز یہ کہ اوجِ بیان سے گر گیا۔ کیا اچھا مبالغہ ہے۔ مرغِ اوصاف کی بلندی کا اور کیا خوب مضمون ہے اظہارِ عجز کا۔ باوجود دعوے قدرت۔ مصرع:

ایثار تو بر دوختہ چشم و دہنِ آز

اس کے تو معنی وہی ہیں جو چھاپے میں لکھے ہیں۔ مصرعِ ثانی کی شرح میں گمراہ ہو گیا:

احسان تو ہر قطرۂ دریا بشگافت

تاہم بقیدِ حساب نیامد۔ یہ ہیچمداں اس معنی کے معنی نہیں سمجھا۔ سیدھی بات ہے مگر خیال میں جب آئیں گے کہ اساتذہ کے مسلّمات معلوم ہوں۔ کمال ایثار و عطا میں مروارید و یاقوت و بجرد

معدن کی کم تحقیق آتی ہے۔ لعل و دُر کا معدوم ہو جانا اور بحر و کان کا خالی رہ جانا نئی طرح سے باندھا ہے۔ چناں چہ میں نے کسی زمانے میں اسی زمین میں ایک قصیدہ لکھ کر وزیرالدولہ والیِ ٹونک کو بھیجا تھا۔ اس میں کے دو شعر آپ کو لکھتا ہوں۔ نظم:

ناموس نگہہ داشتی از جود بہ گیتی
جز پردگیانِ حرمِ معدن و یم را
وقت است کہ ایں قوم بہ ہر کوچہ و بازار
پرسند ز ہم منشارِ رسوائی ہم را

"پردگیانِ حرم معدن و یم" لعل و گوہر وہ جو کثرتِ ایثار سے کوچہ و بازار میں خاک آلودہ پڑے ہوئے ہیں۔ وہ باہمدگر دردمندانہ یہ گفتگو کرتے ہیں کہ اس شخص نے سب کی حرمتیں رکھ لیں اور سب کی آبروئیں بچائیں۔ ہم کو اس قدر بے حرمت و ذلیل کیوں کر رکھا ہے؟

قطرۂ دریا کا حساب کے واسطے چیرنا بے حساب ہے۔ مقولہ عرفی کا یہ ہے کہ: جتنے موتی دریا میں ہاتھ آئے وہ بخش دیے اور بخشش کا ذوق باقی رہا۔ چونکہ قطرے میں بالقوہ استعداد موتی ہو جانے کی ہے تو اس احتمال سے ہر قطرۂ دریا کو چیر ڈالا کہ اگر موتی ہاتھ آویں تو وہ سائلوں کو دیے جاویں۔ پہلے مصرع میں حرص کا سیر کر دینا، موافق مسلمات شعرا کی، ممتنع اور اس کا وقوع میں آنا۔ اغراق، دوسرے مصرعے میں یہ احتمال استعداد بالقوہ قطرے کو چیر ڈالنا اور پھر اس طرح کہ ہر قطرے کو، یہ اغراق سے گزر کر تبلیغ و غلو ہے۔

یہاں سے خطاب حضرت صاحبِ عالم کی طرف ہے۔ مخدوم و مکرم و مطاع معظم، قبلۂ دیدہ و دل کہ جو میرے اور اپنے ملنے کو از قسم فرضِ محال نہیں مانتے ہیں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو، جیسا وہ جانتے ہیں۔ تقصیر معاف ہو۔ اگر دنیا میں ظہورِ ہر امر بہ حسبِ مساعدتِ اسباب ہے تو اس تمنا کا حصول مانندِ اعادۂ شباب ہے۔ کوئی وجہ نہیں پاتا آپ کے یہاں تشریف لانے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی میرے وہاں آنے کی۔ اگرچہ حیزِ امکان سے باہر نہیں، مگر وقوع میں تامل ہے۔

اب جو بھائی منشی نبی بخش صاحب کو خط لکھوں گا تو آپ کا سلام ضرور لکھ دوں گا۔ آپ نے احباب ابعاض کی خیر و عافیت عموماً لکھی، بالتخصیص حضرت شاہ عالم صاحب کا سلام نہ لکھا، کیا وہ وہاں نہیں ہیں؟ اگر اور کہیں ہیں تو اُن کا حال مجھ کو لکھیے اور اگر وہاں ہیں تو میرا سلام اُن کو کہیے۔

رباعی کے باب میں بیان مختصر یہ ہے کہ اس کا ایک وزن معین ہے۔ عرب میں دستور نہ تھا، شعرائے عجم نے بحرِ ہزج میں سے نکالا ہے۔ مفعول مفاعلن فعولن۔ ہزج مسدس اخرب مقبوض مقصور، اس وزن پر فعلن بڑھا دیا ہے۔ "مفعول مفاعلن فعولن فعلن" زحافات اس میں بعض کے نزدیک اٹھارہ اور بعض کے نزدیک چوبیس ہیں اور وہ سب جائز و روا ہیں اور اس بحر کا نام "بحرِ رباعی" ہے۔ رباعی یہ ہے کہ سوائے اس بحر کے اور بحر میں نہیں کہی جاتی اور یہ جو مطلع اور حسنِ مطلع کو رباعی کہتے ہیں، اِس راہ سے کہ مصرعے چار ہیں، کہو، ورنہ رباعی نہیں ہے، نظم ہے۔ قدما کو بیشتر اس کا التزام تھا کہ ہر مصرعے میں قافیہ رکھتے تھے۔ خاقانی بہ رعایتِ صنعتِ ذوقافیتین کہتا ہے۔ شعر:

من بودم و آں نگار روحانی روے
افگندہ دراں دو زلفِ چوگانی گوے
خلقی بہ در ایستادہ خاقانی جوے
من در حرمِ وصال سبحانی گوے

میں پان سات برس سے بہرا ہو گیا ہوں۔ ایک رباعی چار قافیے کی۔ اِس مضمونِ خاص کی میں نے لکھی ہے۔ بے رعایتِ صنعتِ ذوقافیتین۔ رباعی:

دارم دل شاد و دیدۂ بینائے
وز کری گوشم نہ بود پروائے
خوبست کہ نشنوم نہ ہر خود رائے
گلبانگ انا ربکم الاعلائے

فقیر اس باب میں متعصب ہے اور وزن کی دو بیت تین قافیے والی کو رباعی نہ کہے گا۔ نثر عاری : نہ قافیہ نہ وزن۔ نثر مسجع : قافیہ موجود، وزن مفقود، مگر اس میں ترجیع کی رعایت ضرور ہے یعنی فقرے تین کے الفاظ مماثل اور ملائم ہم دگر ہوں اور اگر یہ بات نہ ہوگی اور صرف قافیہ ہوگا تو اُس کو مقفّٰی کہیں گے نہ مسجع۔ نثر مرجز وہ ہے کہ وزن ہو اور قافیہ نہ ہو۔ جب آپ لالہ قتیل کے گھڑے ہوئے فقرے دیکھ چکے ہیں تو مجھ کو فقرہ تراشی کی تکلیف کیوں دیتے ہیں۔ زمانۂ گذشتہ میں بھائی ضیاء الدین خاں صاحب نیّر تخلص ایک مختصر سا دیوان حضرت نظامی کا مجھ کو دکھانے لائے تھے۔ اُس میں نثر مرجز تھی۔ میں اُس دن نواب مصطفیٰ خاں حسرتی شیفتہ کو خط لکھا چاہتا تھا، اُسی وضع پر خط لکھا اور وہ خط پنج آہنگ میں ہے۔ مگر میں نے اُس طرز میں بہ مقتضائے شوخیِ طبع یہ بات کی ہے کہ ایک جگہ جو فقرے مقفّٰی ہو گئے ہیں اور وہ لفظ مجھ کو پسند آئے ہیں تو میں نے اُس کو یوں ہی رہنے دیا ہے۔ اس کو دستور میں قصور نہ کیجیے گا۔ وہ رقعہ یہ ہے۔ رقعہ :

ہاں، خواجۂ بے پروا، من بندہ کہ غمناکم و زغصہ جگر چاکم، خواہم سخنے گفتن، آں روز کہ می رفتند، آں نامہ فرستادند، کز دیدن آں خوں شد، دل تا جگر از اندوہ گفتم چہ کنم غالب؟ چوں کار دگرگوں شد۔ می بایدم اینک رفت، تا عذر سخن خواہم۔ چوں گرد و غبارے بود، رفتن نتوانستم۔ آں روز بشام آمد، لا، بلکہ سیہ تر شد، سر ماندہ بہ بالین بر، چوں غمزدگان خفتم، ہے ہے چہ تواں گفت؟ آں خستہ کہ غم خوارش، بر زخم نمک ریزد، و ز دیدۂ بیدارش، شورابہ رواں باشد، چوں از افق شرقی، خورشید درخشندہ، ناگاہ سرے بر زد، آتش بہ جہاں در زد، مرغ سحری پر زد۔ رفتم بہ جگر کاوی و آں رازِ نہانی را، از دل بزباں دادم، در صورتِ تنہائی، بے پردہ چو ہم رازاں، نے آمد و ہم دم شد، چندانکہ دم اندر نے، از مہر دمیدم من، چوں من بہ نوا آمد، واں نالہ کہ بر لب بود، از باطن نے سر زد، آں دم کہ نفس با نے زین گونہ کشاکش کرد۔ یک کاغذ نہ نوشتہ بود است

به دستم در، چوں ناله نمودی داشت، زاں شعله که دودی داشت، بر صفحه نشان ها
ماند۔ گفتم، مگر ایں صفحه غم نامهٔ رازستی، فهرست نیاز استی؟ باید که فرو پیچم، وانگه
به نشاں مندی، اے خواجه رواں سازم، کوتاه کنم گفتن آں نامه که من گفتم حجاب
در والا بردند، و رواں کردند، هر چند در اندیشه پیدا است که خوش باشد،
با خواجگی استغنا، با ایں همه خوش نبود، پوزش نه پذیرفتن۔ دیروز سحرگاهاں، روشن
گهر آں نیر کش روح و رواں دانم، بل خوش ترازاں دانم، دیوان نظامی را آورد
به سوے من، زیں گونه نوا با بود، در پردهٔ گفتارش، کز ذوق به هنجارش، ایں
زمزمه سر کردم، والا گهر اکبر خاں خوانند سلام از من۔

اپریل یا مئی ۱۸۵۵ء[۲]

(۴)

بندہ پرور!

آپ کا تفقد نامہ محررہ پندرہ نومبر آج پنجشنبہ کے دن اٹھارہ نومبر کو یہاں پہنچا۔ مارہرہ کا خط دلّی چوتھے دن آیا۔ پر دلّی کا خط مارہرہ دیر میں کیوں پہنچتا ہے؟ تو، تمھاری خوشی، اب کے یہ خط بیرنگ بھیجتا ہوں مگر مجھ کو اطلاع دیجے گا کہ یہ کس دن پہنچا؟

گیارہ مئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا۔ میں نے اسی دن سے گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا۔ بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگذشت لکھنی شروع کی۔ جو سُنا گیا وہ بھی ضمیمۂ سرگذشت کرتا گیا۔ مگر بہ طریق لزوم ما لا یلزم اس کا التزام کیا ہے کہ بہ زبانِ فارسیِ قدیم جو "دساتیر" کی زبان ہے اُس میں یہ نسخہ لکھا جائے اور سوائے اسما کے، کہ وہ نہیں بدلے جاتے، کوئی لغت عربی اُس میں نہ آوے۔ چنانچہ ایک نسخہ آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں مگر یہ نذر ہے، جناب قبلہ و کعبہ حضرت صاحب عالم صاحب کی اور چوں کہ وہ آپ کے بزرگ ہیں، بجرأت نہ کر سکا کہ آپ کی نذر کروں اور سیر میں اُن کو مشترک رکھوں۔ نذرانی

کی ہے اور فیض پائے آپ کے مطالعے سے۔

بہہات یہ کاتب اساتذہ کے کلام کو کیا بگاڑ دیتے ہیں، گویا مسخ کر دیتے ہیں۔ اُن سے بعید نہیں، لیکن تم سے اور حضرت صاحب سے بعید ہے کہ سہو کاتب کا نہ سمجھ لیا۔

من آں دریاے آشوبم کہ از تاثیر خاصیت

دو کافوں کا علی التواتر آنا دوسری بات ہے۔ "دریاے آشوب" کیا ٹکسال باہر لفظ ہے، استعارہ بالکنایہ صحیح، مگر یہ محل نہیں ہے۔ یہاں تو "دریا" چاہیے۔ بے شائبۂ استعارہ و کنایہ۔ عیاذاً باللہ۔ عرفی اگر ایک بڑا قدح بھنگ کا یا ایک بوتل شراب کی پیے ہوتا، تو بھی یوں نہ لکھتا۔ اُس غریب کا مصرع یوں ہے:

من آں دریا پُر آشوبم کہ از تاثیرِ خاصیت

"دریا" موصوف "پر آشوب" صفت۔ دوسرے مصرع کا کاف صفت کی تفسیر۔

اب روے سخن حضرت صاحب عالم صاحب کی طرف ہے[۲]۔ امیدوار ہوں کہ میرے ہم عمر مرشد، میرے ہم فن مخدوم، میری تقصیر معاف کریں۔ اگرچہ تریسٹھ برس کی عمر میں بہرا ہو گیا ہوں، پر بینائی میں فتور نہیں، عینک سے اعانت چاہنی منظور نہیں۔ باوجود حدّتِ بصر بہ سبب نقصِ فہم کے، حضرت کی دستخطی عبارت مجھ سے پڑھی نہیں جاتی۔ آگے جو دو بار میں نے جواب لکھا ہے، صرف قرائن ملحوظ رکھے ہیں ورنہ عبارت بہ استیفا مجھ سے نہیں پڑھی گئی۔ آخر چودھری صاحب تو آپ کے معتقدوں میں بہ منزلہ عزیزوں کے ہیں۔ جو آپ فرمایا کریں، وہ انھی الفاظ کو لکھ دیا کریں۔ اب اس سب عبارت کا جواب جب لکھوں گا کہ کتاب کی رسید اور اس مطالب کا اعادہ تحریر بہ دستخط چودھری صاحب میرے پاس آجائے گا۔

زیادہ حدِّ ادب

پنجشنبہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء

❁

(۵)

جنابِ چودھری صاحب!

آپ کا عنایت نامہ اس وقت پہنچا اور یہ وقت صبح کا ہے، دن بدھ کا، ربیع الثانی کی چوبیسویں اور دسمبر کی پہلی۔ کتاب کے پارسل کی رسید معلوم ہوئی۔ حکیم عبدالرحیم خاں کوئی نامی اور نامور آدمی نہیں ہیں۔ یہاں کے قاضی زادوں میں سے ایک شخص ہیں۔ اب طبابت کرنے لگے ہیں۔ میرے بھی آشنا ہیں، مگر صرف سلام علیک، زیادہ ربط نہیں ہے، سو اُن کا حال مجھ کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں؟

آگے حضرت صاحب کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ جو کچھ لکھیں بہ قلم چودھری صاحب لکھا جائے۔ حضرت نے نہ مانا اور پھر عبارت بہ دستخطِ خاص لکھی۔ واللہ باللہ، نہ مجھ سے نہ اور کسی سے پڑھی گئی۔ ناچار آپ کا خط پھر آپ کو بھیجتا ہوں۔ حضرت سے کچھ نہ فرمائیے گا مگر اس عبارت کو اپنے ہاتھ سے نقل کر کے مجھ کو بھجوائیے گا۔ ضرور اور جلد۔

شفیق مکرم جناب چودھری غلام رسول صاحب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

یکم دسمبر ۱۸۵۵ء

(۶)

جنابِ چودھری صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں اور شکر احسان بجا لاتا ہوں اور "حاشا"، اور حاشا للہ کے جواب کو حوالہ اُن سطور پر رکھتا ہوں کہ جو اَب جناب حضرت صاحب کے ارشاد کے جواب میں لکھوں گا۔ آپ کو اتنا لکھنا اور کافی ہے کہ اپنے عمِ والا قدر جناب چودھری غلام رسول صاحب کو فقیر کا سلام نیاز پہنچائیے اور جناب شیخ عطا حسین صاحب عطاؔ کو بھی میرا سلام کہیے۔

اب خطاب جناب حضرت صاحب عالم صاحب کی طرف ہے

پیر و مرشد!

قلم کا کام زبان سے لینا یعنی تحریر کے مطالب کو پڑھنا اور پڑھا دینا آسان ہے اور

زبان کا کام قلم سے لینا دشوار ہے۔ یعنی جو کچھ کہنا چاہیے اُس کو کیوں کر لکھا چاہیے۔ وہ بات کہاں کہ کچھ میں نے عرض کیا، کچھ آپ نے فرمایا، وہ چار باتوں میں جھگڑے نے انجام پایا۔ خیر[1]، دولتِ ہم زبانی کہاں میسّر؟ آپ کے حکم بجا لانے کو اپنا شرف جانتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ نظامی اب ایسا ہوا کہ جب تک فریدآباد کا کھتری دلوالی سنگھ ثم متخلص بہ قتیلؔ جس کو حضرت نے مرحوم لکھا ہے، اُس کی تصدیق نہ کرے، تب تک اُس کا کلام قابلِ استناد نہ ہو۔ قتیلؔ کو اساتذۂ سلف کے کلام سے قطعاً آشنائی نہیں۔ اُس کے علمِ فارسی کا مآخذ اُن لوگوں کی تقریر ہے کہ جو نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالکِ غربی[2] کی طرف سے لکھنؤ میں آئے اور ہنگامہ آرا ہوئے۔ بیشتر اُن میں سادو (کذا) کشمیری یا کابلی و قندھاری و مکرانی۔ احیاناً کوئی عامۂ اہلِ ایران سے بھی ہو۔ مانا کہ عظماے ایران میں سے بھی کوئی ہوگا۔ تقریر اور ہے تحریر اور ہے۔ اگر تقریر بعینہٖ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ وطواط اور شرف الدین علی یزدی اور حسین واعظ کاشفی اور طاہر وحید، یہ سب نثر میں کیوں خونِ جگر کھایا کرتے۔ اُسی طرح کی نثریں جو لالہ دلوالی سنگھ قتیلؔ متوفی نے بہ تقلیدِ اہلِ ایران لکھی ہیں، کیوں نہ رقم فرمایا کرتے؟ یہ شخص مدعی ہے کہ "کدہ" کا لفظ سواے پانچ چار اسم کے اور اسم کے ساتھ ترکیب نہیں پاتا۔ پس "آرزوکدہ" اور "دیوکدہ" اور "نشترکدہ" اور امثال اس کے جو ہزار جگہ اہلِ زبان کے کلام میں آیا ہے، وہ نادرست ہے۔ میں اور آپ بیٹھیں اور اس کے خرافات پڑھے جائیں اور جو میں عرض کروں، اُس پر حضرت غور فرمائیں، تب معلوم ہو کہ یہ کتنا لغو اور فارسی دانی سے کتنا بیگانہ ہے۔ آمدم بر سرِ مدعا نثر مرجّز اُس کو کہتے ہیں: کہ وزن ہو اور قافیہ نہ ہو، مقابل مقفّی کے، کہ قافیہ ہو اور وزن نہ ہو اور یہاں یہ بھی سمجھا چاہیے کہ وزن میں قید منظور نہیں، مثلاً حضرت نظامی علیہ الرحمۃ کی نثر کا وزن یہ ہے: مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن، حضرت ظہوری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: "رایتش سروبن گلشن فتح، خنجرش ماہیِ دریاے ظفر"، یہ نثر مرجّز ہے۔ وزن اس کا: فعلاتن فعلاتن فعلن، کاتبوں نے

مقفیٰ کرنے کے واسطے صورت بدل دی ہے اور کچھ تصرف کیا ہے کہ نثر نہ مرجز رہی نہ مقفیٰ بنی۔ چنانچہ اساتذۂ فن "لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا"، اِس آیت سراسر ہدایت کو نثر موجز کہتے ہیں، اور اس کا وزن ہے: فاعلاتن فاعلاتن فاعلن۔ "ویرزقہ من حیث لایحتسب"۔ اس کا وزن: فولن فولن فولن فعول۔ بندے کی تحقیقات یہی ہے کہ نثر تین قسم پر ہے مقفیٰ: قافیہ ہے اور وزن نہیں، مرجز: وزن ہے اور قافیہ نہیں۔ عاری: نہ وزن ہے نہ قافیہ۔ مسجع ہی مقفیٰ ہے کہ دونوں فقروں میں الفاظ ملائم اور مناسب ہم دگر ہوں۔ نظم میں یہ صنعت آپڑے تو اُس کو مرصع کہتے ہیں اور نثر اس صنعت پر مشتمل ہو تو اُس کو مسجع کہتے ہیں۔ اس قاعدے کو نہ عبدالرزاق بدل سکتا ہے، نہ صاحب قلزم ہفتگانہ، نہ یہ قطرۂ بے سروپا۔ حاشا وحاشَ للہ، کلام اہلِ عرب میں اُسی طرح ہے جس طرح آپ فرماتے ہیں مگر پارسیوں نے از راہِ تصرف بہ معنیٰ "زنہار" قرار دیا ہے یعنی تاکید۔ اگر منفی پر آئے تو نفی کی تاکید اور مثبت پر آئے تو اثبات کی تاکید۔ میں کسی کلمے کا استعمال نہیں کرتا۔ جب تک اہلِ زبان کے کلام میں نہیں دیکھتا۔ عیشی بے چارہ لائق اس کے نہیں کہ مستند علیہ ٹھہرے، مگر یہ لفظ غلط نہیں لکھا ہے اُس غریب نے۔ حضرت قبلہ فارسیوں کے تصرفات اگر دیکھیے تو حیران رہ جائیے۔ مجھ کو اس وقت کہاں یاد ہے اور کتاب کے نام تو کوئی ورق بھی لکھا ہوا میرے پاس نہیں۔ حاشا کا کوئی شعر موکد نفی اگر یاد آجائے گا تو آپ کو لکھا جائے گا۔

شعر:

ہرزہ مشتاب و پئے جادہ شناساں بردار
اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

یہ مثنوی جس میں یہ مصرع ہے:

حاشَ للہ کہ بد نمی گویم

کلکتے میں میں نے لکھی ہے۔ پانچ ہزار آدمی فراہم تھے اور جو اعتراض مجھ پر کیے تھے اُس میں سے ایک اعتراض یہ تھا کہ "ہمہ عالم" غلط ہے۔ یعنی "ہمہ" کا لفظ "عالم" کے لفظ کے ساتھ ربط نہیں

پا سکتا۔ قتیل کا حکم یوں ہے۔ عرض کیا گیا کہ حافظ کہتا ہے :

"ہمہ عالم" گواہ عصمت اوست

سعدی کہتا ہے :

عاشقم برہمہ عالم کہ ہمہ عالم از اوست

غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ یہ مثنوی وہاں لکھی گئی اور ایک ایک نقل مولوی کرم حسین بلگرامی اور مولوی عبدالقادر رام پوری اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور اُن کے امثال اور نظائر کے پاس بھیجی گئی۔ اگر یہ لوگ جگہ پاتے تو میری کھال اُدھیڑ ڈالتے۔ اب ایک نسخہ ہے۔ "ابطالِ ضرورت" اگرچہ صاحب اُس کا ہندی ہے بلکہ ہندو ہے، مگر قابل اچھا ہے۔ دیکھیے اساتذہ کیا کیا تصرف نمایاں کر گئے ہیں۔

میں نے آج تک اُردو میں "انتظاری" بہ معنی "انتظار" نہ آپ لکھا، نہ اپنے شاگردوں کو لکھنے دیا۔ اساتذہ مسلم الثبوت کے ہاں فارسی میں موجود ہے۔ حاشا ایسا نہیں کہ اُس میں فارسی والوں کو تامل ہو۔

زیادہ حدِ ادب۔

مارچ ۱۸۵۹ء

(۷)

جناب چودھری صاحب آپ کو بعد ابلاغِ سلام آپ کے خط کے پہنچنے سے آگہی دیتا ہوں اور یہ بھی آپ کو معلوم رہے کہ آپ کے چچا صاحب کے خط کا جواب اس سے آگے بھیج چکا ہوں اور اُس میں اُن کو اور آپ کو شادی کی تہنیت لکھ چکا ہوں۔ میں نہیں آسکا۔ یہاں پنسن کا مقدمہ پیش ہے۔ کبھی صاحب کمشنر بہادر کے پاس، کبھی صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کے پاس جانا ہوتا ہے۔ خود نہ جاؤں تو یہ خیال رہتا ہے کہ خدا جانے کس وقت بلا بھیجیں یا کس وقت کوئی پرسش آجائے۔ بائیس مہینے سے وہ رزق کہ جو مقوم جسم اور مفرحِ روح تھا، مسدود ہے۔

کیا کھاؤں اور کیوں کر جیوں۔ للہ الحمد کہ گنہگار نہیں ٹھہرا۔ پنشن پاؤں گا مگر وہ پنشن گورمنٹ کے پولیٹیکل کے سررشتہ سے مقرر کی ہوئی ہے، سو دہلی کے ایجنٹی کا دفتر فرد فرد لٹ گیا۔ کوئی کاغذ باقی نہیں رہا۔ اب یہ شہر پنجاب احاطے میں مل گیا۔ پنجاب کا نواب لفٹنٹ گورنر بہادر یہاں کا صدر ٹھہرا۔ اُس دفتر میں میری ریاست کا، میری معاش کا، میری عزت کا نام و نشان نہیں ہے۔ ایسے ایسے پیچ پڑ گئے ہیں، کچھ نکل گئے ہیں، کچھ باقی رہے ہیں۔ یہ بھی نکل جائیں گے۔ مصرع :

کارہا آساں شود اما بہ صبر

یہاں سے روئے سخن صاحب عالم کی طرف ہے۔ جناب رفعت مآب مولائی و مرشدی تسلیم قبول کریں اور اس تحریر سے، جو آپ میرے پاس پہنچی ہے، مجھ کو شاداں اور اپنے بخت اور قسمت پر نازاں تصور فرماویں۔ سب سمجھا اور سب مطالب کا جواب لکھتا ہوں۔ پہلے اپنا ایک شعر، کمال گستاخی کو کار فرما کر، لکھتا ہوں اور یہ نہیں لکھتا کہ یہ شعر میں نے کیوں لکھا ہے۔ شعر یہ ہے، شعر:

مرا بہ غیر ز یک جنس در شمار آورد
فغاں، کہ نیست ز پروانہ فرق تا مگسش

بہر حال حضرت کو یہ معلوم رہے کہ میں اہلِ زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں۔ جب تک قدمایا متاخرین میں مثل صائب و کلیم و اسیر و حزیں کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا، اُس کو نظم اور نثر میں نہیں لکھتا۔ جن لوگوں کے محقق ہونے پر اتفاق ہے جمہور کو، اُن کا حال کیا گزارش کروں۔ ایک اُن میں صاحب "برہانِ قاطع" ہے۔ اب ان دنوں میں "برہانِ قاطع" کو دیکھ رہا ہوں اور اُس کے فہم کی غلطیاں نکال رہا ہوں۔ اگر زیست باقی ہے تو ان نکات کو جمع کر کے اُس نسخے کا نام "قاطع برہان" رکھوں گا۔ مصرع :

کجا بود منزل کجا تاختم

شعر فردوسی میں "انگبین و شہد" اور شعر استاد میں "حرص و آز" واقعی بادی النظر میں زائد معلوم ہوتا ہے۔ "شیرِ ناب" بہتر ہے۔ لیکن "حرص و آز" کو کیا کیجیے گا؟

میں عرض کرتا ہوں کہ وہاں بھی "خشم و آز" ہے۔ ہرگز "حرص و آز" نہیں ہے۔ حکما او صوفیہ

قوتِ غضبی اور قوتِ شہوی کی تعدیل میں محنتیں کرتے ہیں۔ قوتِ غضبی کی اصلاح سے فضیلت شجاعت اور قوتِ شہوی کی اصلاح سے فضیلتِ عفت حاصل ہے اور یہ مسئلہ علمِ اخلاق میں مبرہن ہے۔ "دو بندہ من حرص و آز" بے معنیٰ، محقق استاد کو بدنام کرنا۔ ایک اسم سے دو مسمیٰ تراشے۔ واحدِ حقیقی کا تثنیہ اس سے علاوہ۔ مردِ عارف حکیم نے قوتِ شہوی کی اصلاح کا ذکر کیا اور قوتِ غضبی کا مذکور بھی نہ کیا۔ میں نے "خود خشم و آز" دیکھا ہے اور یہی بجا ہے۔ "شہد" کی جگہ "شیر" اور "حرص" کی جگہ "خشم" درست۔ میری رائے، آپ کی رائے کے مطابق، مگر "گوگرد سرخ" اور "بیل سفید" میں ساکت ہوں۔ یہ تقریر کہ "گوگرد سرخ" "کمیاب" اور "لعل سپید" "نایاب" ہے، میرے دلنشیں نہ ہوئی۔ "کبریتِ احمر" اور "کیمیا" اور "عنقا" ان سب کا ایک حکم ہے۔ بنظر اس قاعدے پر "لعل سپید" بہتر ہے اور "کبریتِ احمر" اور "بیل سپید" بے جوڑ ہے: جیسے امیر خسرو کی انملیاں۔

ایک قاعدہ اور عرض کرتا ہے: "کم" کا لفظ اہلِ فارس کی منطق میں کہیں افادۂ معنیٰ سلب کلی بھی کرتا ہے، جیسے "کم آزار" یعنی "نیازارندہ" نہ یہ کہ "کم آزارندہ" "کم ہمتا" یعنی "بے ہمتا" بلکہ "اندک" کا لفظ بھی اس طرح آتا ہے، جیسا کہ میرا خداوندِ نعمت نظامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتا ہے۔ شعر:

بس و بیش چوں آفتابم یکیست
فروغم فراواں، فریب اندکیست

یعنی فریب بالکل نہیں، نہ یہ کہ کچھ ہے، پس "کمیاب" اور "نایاب" ایک چیز ہے۔ نظامی نے "لعل سپید" کہا ہے، کسی صاحبِ طبع نے اس کو غلط سمجھ کر "بیل سپید" بنا دیا ہے۔ "انگبین" و "شہدِ ناب" شاید مثلِ غم و اندوہ و مسرت و فرحت ہو یا نہ ہو "شیرِ ناب" ہی ہو بلکہ "شیرِ ناب" بہتر ہے لیکن "حرص و آز" تو کسی طرح درست نہیں۔ عارف کا دعویٰ ناقص اور لغو رہا جاتا ہے۔ اگر یہ قباحت لازم نہ آتی تو بھی ہم حرص و آز کو مسلّم نہ رکھتے۔ کس واسطے کہ غلام کا شبہ بہ کمال وضوح غم و اندوہ و عدل و داد کا نظیر نہیں ہو سکتا۔ ہاں انگبین و شہد کے جواز میں ہم مضائقہ نہ کریں گے

مگر "شیرناب" کو اُس سے اچھا سمجھیں گے۔ شہد میوے کی حلاوت کے واسطے اور شیر افزائیشِ لطافت کے واسطے "حاشا" و "حاشا للہ" کا جواب آغازِ تحریر میں لکھ چکا۔ آپ کی اس نظیر لکھنے سے اس کے جواز پر میرا یقین نہ بڑھا۔ "لوکشف الغطاء ما ازددت یقینا" نثرِ مرجز کے باب میں پیر و مرشد کو اتنا تامل کیوں ہے؟ یہ جو نثریں آپ نے لکھی ہیں، سوائے اُس نثر کے کہ جس کو آگے لکھوں گا، یہ تو سب مسجع ہیں۔ یعنی پہلے فقرے کا ہر لفظ وزن میں موافق ہو دوسرے فقرے کے لفظ سے۔ اگر نظم میں یہ صنعت آپڑے تو نظم کو مرصع کہیں گے اور نثر میں واقع ہو تو نثر کو مسجع کہیں گے۔ جو حضرت کہ اس نثر کو مرجز کہتے ہیں، وہ نثرِ مسجع کی مثال ہم کو دیں۔ زنہار، زنہار یہ نثر مرجز نہیں، مسجع ہے۔ ہاں، یہ نثر مرجز ہے:

صاحبا، مشفقا، شفیقِ دلی، زید الطافکم الی الابد۔ بعد تبلیغ بندگی و نیاز، بر ضمیر منیر روشن باد۔ اگر وہ نثر جس کو میں نے مسجع کہا ہے مرجز ہے تو اس کم بخت نثر کا کیا نام ہے؟ نہیں وہ مسجع ہے اور یہ مرجز ہے۔ میں تو بہت مختصر مفید لکھ چکا ہوں، آپ نہ مانیں تو کیا کروں؟ وزن نہ ہو، قافیہ ہو، وہ مقفیٰ۔ وزن ہو قافیہ نہ ہو، وہ مرجز ہے۔ الفاظِ فقرتین وزن میں برابر ہوں وہ مسجع، اس صنعت کو بیشتر نثرِ مقفیٰ میں صرف کرتے ہیں اور چاہو قافیے کا التزام نہ کرو، بہ ہر رنگ اقسام ثلثۂ نثر یہی ہے۔ حضرت نے نثرِ مسجع کو مرجز کہا ہے، جواب وہی ہے کہ اگر مرجز یہ ہے تو مسجع کس نثر کو کہتے ہیں؟ اس سے زیادہ نہ مجھ کو علم نہ یارائے کلام۔

قتیل لکھنوی اور غیاث الدین ملائے مکتبی رام پوری کی شی قسمت کہاں سے لاویں کہ تم جیسا شخص میرا معتقد ہو اور میرے قول کو معتمد سمجھے؟

بعد خط کی اتمام تحریر کے، خیال آیا کہ شاید کسی بات کا جواب رہ نہ گیا ہو، میں نے آپ کے خط کو دیکھا اور ایک بات "دستور شگرف" کی عبارت میں نظر آئی: "مرجز کلامیست منثور کہ وزن دارد و سجع ندارد"۔ اس تعریف کو دیکھیے اور نمونے کی نثر کو دیکھیے۔ وہ موزوں کہاں ہے جو "وزن دارد" اُس پہ صادق آئے؟ وزن بہ معنی تقطیعِ شعر، سو مفقود

سجع ندارد۔ خدا جانے یہ بزرگ سجع کس کو کہتا ہے؟ سجع ہم وزن ہونا دو لفظوں کا فقرتین میں یا مصرعین میں، سو اس نثر میں موجود ہے۔ موجود کو مفقود اور مفقود کو موجود لکھا ہے اور پھر کلام اُس کا مقبول ہے۔ اللہ اللہ اللہ۔ ملّا غیاث الدین لکھتا ہے: "پس مرجز نثرے باشد کہ کلمات فقرتین اکثر جاہا ہمہ ہم وزن باشند در تقابلِ یک دگر۔ بدونِ رعایت سجع۔" خدا کے واسطے، سجع تو اسی کو کہتے ہیں کہ کلماتِ فقرتین یا مصرعین ہم وزن یک دگر ہوں۔ سو اس نثر میں موجود ہے کہ "بدونِ رعایت سجع" کے کیا معنی؟ مگر یہ دونوں صاحب وزن کو برابر ہونا کلمات کا سمجھتے ہیں اور سجع تقطیعِ شعر کو کہتے ہیں۔ اس عقیدے کی رکاکت اظہر من الشمس ہے۔

صاحبِ "دستور شگرف" کا کلام نص اور مولوی غیاث الدین کا کلام حدیث نہیں ہے۔ آپ ہی غور فرمائیے اور انصاف کیجیے۔

مارچ ۱۸۵۹ء[۳]

(۸)

چودھری صاحب مشفق مکرم کو میرا سلام۔ آپ کا خط، کہ سوائے چند سطر کے، جو تم نے لکھی تھیں، سراسر حضرت صاحب کا دستخطی تھا، پہنچا۔ سبحان اللہ حضرت کو کس قدر محبت ہے تمھارے ساتھ، تمھاری ناسازیِ مزاج کا کیسا ملال اور تمھارے نہ دیکھنے کا کیسا رنج ہے؟ سچ یوں ہے کہ تم خوبانِ روزگار میں سے ہو۔ توقیعِ قبولِ اہلِ نظر کا حاصل ہونا آسان نہیں ہے۔ سلامت رہو، خوش رہو، مختصر مصرع:

کار تست یہ جہاں جملہ چناں یاد کہ خواہی

اب روئے سخن حضرت صاحب عالم کی طرف ہے۔ خدمتِ خدامِ مخدومِ خادم نواز میں بعد تسلیم معروض ہے۔ تفقد نامۂ نامی میں صورتِ عز و شرف نظر آئی۔ اللہ اللہ۔ تم نے میری نظر میں میری آبرو بڑھائی۔ حضرت کی قدر دانی کی کیا بات ہے، آپ کا التفات موجبِ مباہات ہے۔ یہ بات بہ طریقِ طیِ لسان زبان پر آئی ہے، ورنہ قدر دانی کیسی، یہ قدر افزائی ہے۔

نظیری علیہ الرحمۃ کا شعر ایک کاغذ پر لکھ کر میرے گلے میں ڈال دیجیے اور زمرۂ شعرا میں سے مجھ کو نکال دیجے۔ شعر یہ ہے :

جوہرِ بینشِ من در تہہِ زنگار بماند
آں کہ آئینۂ من ساخت نہ پرداخت دریغ

دعوے اور چیز ہے اور کمال اور ہے، علم عربی اور شے ہے اور فارسی کی حقیقت حال اور ہے۔ جلالائے طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ نے شیدائے ہندی کو ایک رقعہ لکھا ہے۔ عبارت اس وقت یاد نہیں آتی مگر یہ مضمون اُس کا ہے کہ ایک دن مولانائے عرفی علیہ الرحمۃ اور ابوالفضل میں مباحثہ ہوا۔ شیخ نے عرفی سے کہا کہ : "ہم نے تحقیق کو بہ سرحد افراط پہنچا دیا اور فارسی میں خوب کمال پیدا کیا۔" عرفی نے کہا کہ "اس کو کیا کرو گے کہ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا اپنے گھر کی بڑھیوں سے اور لونڈیوں سے جو بات سُنی فارسی میں سُنی۔" شیخ گفت : "ما فارسی را از انوری و خاقانی فرا گرفتہ ایم و شما از پیرزالان آموختہ اید۔" عرفی فرمود : "انوری و خاقانی نیز از پیرزناں آموختہ باشند۔" ختم۔

غالب کہتا ہے کہ ہندوستان کے سخن وروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ کے سوا کوئی اُستاد مسلم الثبوت نہیں ہوا۔ خسرو، کیخسروِ قلمرو سخن طرازی ہے یا ہم چشم نظامی گنجوی و ہم طرح سعدی شیرازی ہے۔ خیر فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور ہے۔ کلام اُس کا پسندیدۂ جمہور ہے۔ دیکھو عبدالقادر بدایونی کیا لکھتا ہے : زہے سیاہی خالیز، آرزو، فقیر اور شیدا اور بہار وغیرہم انھیں میں آگئے ناصر علی اور بیدل اور غنیمت۔ ان کی فارسی کیا؟ ہر ایک کا کلام بہ نظرِ انصاف دیکھیے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ منت اور تمکین اور واقف اور قتیل یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجے۔ ان حضرات میں عالم علومِ عربیہ کے شخص ہیں، خیر ہوں۔ فاضل کہلائیں ۔ کلام میں اُن کے مزہ کہاں؟ ایرانیوں کی سی ادا کہاں؟ فارسی کی قاعدہ دانی میں اگر کلام ہے، اُس میں پیروی قیاس ایک بلائے عام ہے۔ وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سوجگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے۔ بایں ہمہ وہ

بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے، منہ کی کھاتا ہے۔ مولوی احسان اللہ ممتاز کو صنائعِ لفظی میں دستگاہ اچھی تھی، اس شیوہ و روش کو خوب برت گئے، فارسی وہ کیا جانیں؟ قاضی محمد صادق اختر عالم ہوں گے۔ شاعری سے اُن کو کیا علاقہ؟ ایک بات حضرت کو اور معلوم رہے کہ ہندی فارسی والوں نے کمال کو وہم میں منحصر رکھا ہے۔ کالپی کے نواب زادوں میں سے ایک صاحب قتیل کے شاگرد تھے۔ میں نے ایک رقعہ قتیل کا اُن کے نام کا دیکھا ہے کہ قتیل اُن کو لکھتا ہے کہ "جامہ گذاشتن" بہ معنی "مردن" مسلّم۔ لیکن بہت احتیاط کیا کرو۔ موقع دیکھ لیا کرو جب لکھا کرو۔ میں کہتا ہوں کہ احتیاط کیا اور موقع کیا؟ "فلاں مرد، بہاں جامہ گذاشت" پھر وہ کہتا ہے کہ "کدہ" کے ساتھ سوائے پانچ سات لفظ کے اور لفظ کو ترکیب نہ دو۔ پھر فرماتا ہے کہ "ہمہ" کے لفظ کو جمع کے ساتھ لاؤ۔ مفرد سے نہ ملاؤ۔"

نقل : میں نے "دستنبو" میں لکھا ہے کہ "ہمہ کس داند" ایک شخص نے کہ وہ بھی مولوی کہلاتا ہے۔ میری غیبت میں کہا کہ "ہمہ کس داند" کیا ترکیب ہے؟ ایک لڑکا میرا شاگرد وہاں موجود تھا۔ اُس نے کہا کہ یہ ترکیب بعینہٖ صائبؔ کی ہے۔ جیسا کہ وہ کہتا ہے۔ شعر :

ہمہ کس طالبِ آں سروِ رواں است ایں جا
آبِ حیواں نفسِ سوختگاں است ایں جا

اُس نے کہا کہ تمھارا استاد حاش للہ کو ما قبل کلمۂ منفی لایا ہے اور یہ جائز نہیں۔ مصرع :

حاش للہ کہ بد نمی گویم

میرے شاگرد نے کہا کہ یہ ترکیب انوری کی ہے :

حاش للہ نہ مرا بلکہ ملک را نہ بود
باسگِ کوے تو ایں زہرہ و یارا و مجال

مولوی ہدایت علی تمکینؔ کا آج تک میں نے نام نہیں سنا تھا۔ چھپے ہوئے رستم ہیں صائبؔ اگرچہ اصفہانی نژاد تھا مگر وارد شاہ جہاں آباد تھا۔ "انتقام کشیدن و انتقام گرفتن"

دونوں بول گیا۔ مولوی صاحب پچ فارسی بولتے ہیں۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ ۔

"کلیم" بروزن "فعیل" صیغۂ اسم فاعل ہے۔ مثل کریم ورحیم وبشیر وسمیع وبصیر وکلیم۔ اسمائے الٰہی ہیں۔ "کلیم" اگر بہ معنی ہم کلام لیجے تو اسم الٰہی اس کو کیوں قرار دیجے۔ حضرت کا مصرع:

ہست کلامے زکلامِ کلیم

مخدوش البتہ ہے۔ یعنی "یا کلمہ" از کلام کلیم یا کلامے از کلماتِ کلیم چاہیے۔ کلامے از کلام، مفرد میں سے مفرد کو نکالا چاہیے، گو جائز نہ ہو: "گو باش" "و گو باشد" ہرگز محلِ تردد نہیں، اوہام و وساوس قواعد میں پیش نہیں جاتے: "اے کریمے کہ از خزانۂ غیب"، ہرگز یائے معروف نہیں ہے یائے مجہول ہے۔ یائے معروف یہاں نامقبول ہے:

خدائے کہ بالا و پست آفرید

ایسا خدا، ایسا کریم اس تحتانی کو یائے وحدت کہو، یائے توصیف کہو، یائے تعظیم کہو، جس طرح کہو یائے مجہول آئے گی۔

مارچ یا اپریل ۱۸۵۹ء

(۹)

جناب چودھری صاحب کی یادآوری اور مہر گستری کا شکر بجا لاتا ہوں۔ آپ کا خط مع قصیدہ و مثنوی پہنچا۔ مثنوی کو جداگانہ بہ طریق پم فلٹ پاکٹ بھیجتا ہوں اور یہ خط جداگانہ ارسال کرتا ہوں۔ لفافہ اس کا بھی آپ کے نام کا ہے۔

آپ کے خواب کا ماجرا اور صبح کو ادھر کا قصد اور پھر اپنے چچا صاحب کے کہنے سے نظر تابستاں پر، اس عزم کا ملتوی رکھنا معلوم ہوا۔ آپ کے چچا صاحب نے کرامت کی کہ جو آپ کو منع کیا۔ ڈاک کی سواری پر اگر آپ اس شہر میں میرے مکان تک آجاتے تو ممکن تھا مگر رہنا شہر میں بے حصولِ اجازتِ حاکم احتمالِ ضرر رکھتا ہے، اگر نہ خبر ہو، تو نہ ہو اور اگر خبر ہو جائے تو البتہ قباحت ہے۔ زنہار کبھی یہ گمان نہ کیجے گا کہ دلّی کی عملداری میرٹھ اور آگرے

اور بلادِ شرقیہ کی مثل ہے۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے۔ نہ قانون نہ آئین جس حاکم کی جو رائے میں آوے وہ ویسا ہی کرے۔ بہرحال مصرع :

اے واے ز محرومی دیدار دگر ہیچ

اِنْشَاءَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ دو تین مہینے میں یہاں بھی صورت امن و امان کی ہوجائے گی مگر میری آرزو بہ استیفا اُس صورت میں بھی بَر نہ آئے گی۔ میں یہ تاکے ہوئے ہوں کہ میری اور تمھاری ملاقات اس طرح ہو کہ ہم تم ہوں اور حضرت صاحب عالم صاحب ہوں اور باہم حرف و حکایت کریں۔ اگر زمانہ میری خواہش کے موافق نقش قبول کرتا ہے تو میں مارہرہ کو آتا ہوں۔ حضرت پیر و مرشد کا اشتیاق اور اسی جلسے میں تمھارے دیدار کا شوق ایسا نہیں ہے کہ مجھ کو آرام سے بیٹھا رہنے دے گا۔

صاحب! یہ مثنوی تو میرے واسطے ایک مرثیہ ہوگئی ہے ہے اس بزرگوار کے جگر میں کیا کیا گھاؤ پڑے ہوں گے، تب یہ تراوش خونابہ ظہور میں آئی ہوگی۔ مزہ یہ ہے کہ عنوان بیان سے حق بجانب انھی کے معلوم ہوتا ہے۔ چوں کہ اصل کار میری نظر میں نہیں اور حقیقتِ حال مجھ پر مجہول ہے۔ اس واسطے انجام و آغاز، اندازہ و اندازنہ کچھ نہیں سمجھا۔ حک و اصلاح کو آپ بہ نظرِ اصلاح ملاحظہ فرمائیں۔ میں نے بہ حسبِ دستور اپنے ہر جگہ منشاے اصلاح لکھ دیا ہے۔ شیخ صاحب سے میرا اسلام کہیے گا اور کہیے گا کہ کیا کروں، دور ہوں، معذور ہوں، مدد نہیں کر سکتا۔ اعانت کے مراسم تقدیم کو نہیں پہنچا سکتا۔ خدا تمھارا نگہبان رہے۔

والسلام

مئی یا جون ۱۸۵۹ء

(۱۰)

شفیقِ مکرم، مظہر لطف و کرم، جناب چودھری صاحب کی خدمت میں بعد سلام یہ عرض کرتا ہوں کہ آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ میرا رنج و تشویش مٹایا۔ میری خدمت مقبول ہوئی۔ خوشی حصول

ہوئی۔

میر امداد علی شاہ کو میری دعا کہنا۔ اُن کا باپ میرا بڑا یار تھا۔ میری طرف سے خاطر جمع کر دیجیے گا کہ اب سبیل اچھی نکل آئی ہے۔ چودھری صاحب کے ذریعے سے[۲] جو کچھ مجھ کو بھیجنا ہوگا، بھجواؤں گا۔

جناب چودھری صاحب، آج کا میرا خط کاسۂ گدائی ہے یعنی تم سے کچھ مانگتا ہوں تفصیل یہ کہ مولوی محمد باقر دہلوی کے مطبع میں سے ایک اخبار ہر مہینے میں چار بار نکلا کرتا تھا مسمی بہ "دہلی اردو اخبار"، بعض اشخاص سنینِ ماضیہ[۳] کے اخبار جمع کر رکھا کرتے ہیں، اگر احیاناً آپ کے یہاں یا کسی آپ کے دوست کے یہاں[۴] جمع ہوتے چلے آئے ہوں تو اکتوبر ۱۸۳۷ء سے دو چار مہینے کے آگے کے اوراق دیکھے جائیں، جس میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر اور میاں ذوق کے دو سکّے اُن کے نام کے کہہ کر نذر کرنے کا ذکر مندرج ہو۔ بے تکلف وہ اخبار چھاپے کا اصل بجنسہٖ میرے پاس بھیج دیجیے۔ آپ کو معلوم رہے کہ اکتوبر کی ساتویں آٹھویں تاریخ ۱۸۳۷ء میں یہ تخت پر بیٹھے ہیں اور ذوق نے اُسی مہینے میں، یا دو ایک مہینے کے بعد سکّے کہہ کر گزرانے ہیں۔ احتیاطاً پانچ چار مہینے تک کے اخبار دیکھ لیے جائیں۔ یہاں تک[۶] میری طرف سے ابرام ہے کہ اگر یہ[۷] مثل کسی اور شہر میں کوئی آپ کا دوست جامع ہو اور آپ کو اُس پر علم ہو تو وہاں سے منگوا کر بھیجیے۔

والسلام مع الاکرام

جون ۱۸۵۹ء[۸]

(۱۱)

شفیق میرے، عنایت فرما میرے[۹]!

تمھاری مہربانی کا شکر بجا لاتا ہوں۔ نہایت سعی یہ تھی کہ آپ کی طرف[۱۰] سے ظہور میں آئی۔ میں نے کلکتے میں مہتمم مطبعِ "جام جہاں نما" کو لکھ بھیجا ہے اور ترکِ سعی کیا ہے آپ بھی

اب فکر نہ کیجیے، اگر کہیں سے آپ کے پاس آجائے تو مجھ کو بھیج دیجیے۔ میرے پاس آئے گا تو میں تم کو اطلاع دے دوں گا۔

عنایت الٰہی کا کون شخص مشتاق نہ ہوگا، اس کی پرسش زائد۔ میں خدمت گزاری کو حاضر ہوں، وہ جب چاہیں اپنا کلام بھیج دیں۔ میرا سلام اور یہ پیام کہہ دیجیے گا۔

صاحب! تم نے ہمارے پیر و مرشد کو ہم پر خفا کر دیا۔ بھلا وہ خط نہ لکھیں، نہ لکھیں کبھی تم کو تو فرماویں کہ غالب کو میری دعا لکھ بھیجنا۔ بہ ہر حال میرا سلامِ نیاز عرض کیجیے اور اُن کے مزاجِ مبارک کی خیر و عافیت لکھیے اور یہ بھی لکھیے کہ اگر خدا نخواستہ وہ مجھ سے ناخوش ہیں تو ناخوشی کی وجہ کیا ہے؟

اپنے چچا صاحب کی خدمت میں سلامِ نیاز پہنچائیے گا اور مولانا عطا کو سلامِ شوق کہیے گا۔

جولائی یا اگست ۱۸۵۹ء[۲]

(۱۲)

میرے شفیقِ دلی چودھری عبدالغفور صاحب کو خدا سلامت رکھے۔ دیکھو میرے حواس کا اب یہ عالم ہو گیا ہے کہ تمھارے نام کی جگہ تمھارے چچا صاحب کا نام لکھتا تھا، اسی طرح سابق کے خط میں سرنامے پر لکھ گیا ہوں گا:[۱]

بہار پیشہ جوانے کہ غالبش نامند
کنوں بہ بیں کہ چہ خوں می چکد ز ہر نفسش

جو خطوط کہ آپ کے خطوط کے جواب میں آئے ہیں اُن کے بھیجنے کی کیا حاجت تھی؟ آپ کی سعی اور اپنی ناکامی پہلے سے میرے دل نشیں اور خاطر نشاں ہے۔ جیسا کہ کوئی اُستاد کہتا ہے:

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

وہ اخبار نہ کہیں سے ہاتھ آیا اور نہ آئے گا۔ میں اپنے خدا سے امیدوار ہوں کہ میرا کام بغیر اُس کے نکل جائے گا۔

بندہ پرور! میرا کلام، کیا نظم، کیا نثر، کیا اردو، کیا فارسی، کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو اُن کے لاکھوں روپیے کے گھر لُٹ گئے، جس میں ہزاروں روپیے کے کتاب خانے بھی گئے۔ اُس میں وہ مجموعہ ہائے پریشان بھی غارت ہوئے۔ میں خود اُس مثنوی کے واسطے خون درجگر ہوں۔ ہائے کیا چیز تھی۔

پارسل میں خطوط بھیجے محلِ اندیشہ ہے، خدا نے بچایا۔ چوں کہ اب وہ خط آپ کے کچھ کام کے نہ سمجھا۔ از راہِ احتیاط پارسل میں سے نکال لیے۔

جولائی یا اگست ۱۸۵۹ء[۲]

(۱۳)

میرے مشفق کو میرا اسلام پہنچے۔ دونوں مخمس بعد اصلاح پہنچتے ہیں۔ منشائے اصلاح سمجھ لیجیے: ''سید عالی نسب و سرورِ والا حسبی''۔ یہ افتتاحِ کلام اور ابتدائے خطاب کے درخور نہ تھا۔ مصرعِ ثالث اس کی جگہ رکھ دیا گیا۔

دوسرے بند کی تخمیس دو طرح پر ہے۔ دونوں بے عیب ہیں اور مزید لطف کسی میں نہیں۔ جن مصرعوں کو چاہو رہنے دو۔

''گذشت از افلاک'' و ''ز افلاک گذشت'' ایک فارسی رہا اور ایک ہندی۔ حضرت نے دونوں فارسی میں لکھے تھے۔ ندامت فعل پر مترتب ہوا کرتی ہے، ترجمہ اُس کا ''پشیمانی'' حضرت یوسف کو ندامت کیوں ہو؟ مگر ''خجالت'' اُس کا ترجمہ ہے ''شرمندگی''۔ آپ غور کیجیے کہ ''ندامت'' اور ''خجالت'' میں کتنا فرق ہے۔ جہاں آپ نے ''عرق ریز ندامت'' لکھا وہ محل ''خجالت'' کا تھا۔ آپ نے ''ندامت'' کیوں لکھا؟ بہ ہر حال وہ مصرع تو بدل گیا لیکن اطلاع ضرور تھی۔

"طرح" بہ فتحِ اول و سکونِ ثانی بہ معنی فریب ہے اور تصویر کے خاکے کو بھی کہتے ہیں اور بہ معنی آسایشِ دنیا بھی مجاز ہے۔ مرادف طرز و روش بھی "طُرح" ہے بفتحتین۔ اس کا تفرقہ منظور رہا کرے۔

"نسیم" تخلص اچھا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ "نسیم" مؤنث ہے، جواب اُس کا یہ ہے کہ "جرأت" اور "وحشت" اور ایسے بہت تخلص ہیں کہ وہ مؤنث ہیں۔ بہ ایں ہمہ اگر بدلا چاہیے تو اُس کا ہم وزن "سلام" "وسلیم" اور "خیال" بھی ہے، اس میں سے جو پسند آئے۔

آپ کے عمِ عالی مقدار اور آپ کے بزرگِ آموزگار کو میرا سلام پہنچے۔

یہاں سے روئے سخن حضرت پیر و مرشد صاحبِ عالم کی طرف ہے۔ پیر و مرشد کی خدمت میں سلام اور مرشد زادوں کی جناب میں دعائے طولِ عمر و دوامِ دولت پہنچا کر یہ عرض کرتا ہوں کہ واقعی حضرت شاہ عالم کا عنایت نامہ آیا تھا اور میں اُس کا جواب بھیج چکا ہوں۔ عجب ہے کہ حضرت کی تحریر میں جہاں اُن کے خط کا ذکر تھا وہاں میرے خط کا مذکور نہ تھا اور ان سطور کی تحریر کے بعد اپنے خط کا پہنچنا گمان نہیں کر سکتا۔ میں اُس میں اُن کو یہاں کا حال لکھ چکا ہوں۔

"پنج آہنگ" آپ نے لی، "دیوانِ فارسی" آپ کے پاس ہے۔ مگر یوں سمجھیے کہ یہ دونوں ناتمام ہیں اور اب کہیں سے اُن کا اتمام ممکن نہیں۔ خیر، جو کچھ ہے، غنیمت ہے۔ "دستنبو" میں نے نذر کی ہے۔ "مہرِ نیم روز" معلوم نہیں آپ کے پاس ہے یا نہیں۔ خلاصہ یہ کہ شعر کو مجھ سے اور مجھ کو شعر سے ہرگز نسبت باقی نہیں رہی۔ اس فتنہ و فساد کے بعد ایک قصیدہ یہ جو "دستنبو" میں ہے اور ایک قصیدہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی مدح میں اور ایک قصیدہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی مدح میں اور دو بیت کا ایک قطعہ اور ایک رباعی، اس نظم کے سوا اگر کچھ لکھا ہو تو مجھ سے قسم لیجیے:

قطعہ

بہ آدم زن بشیطاں طوقِ لعنت
سپردند از رہِ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوقِ آدم
گراں تر آمد از طوقِ عزازیل

رُباعی

دنیا ہیچ است و شادی و غم ہیچ است
ہنگامۂ سور و بزمِ ماتم ہیچ است
رو، دل بہ یکے دہ کہ دو عالم ہیچ است
ایں نیز فرو گزار کایں ہم ہیچ است

اس واماندگی کے دنوں میں چھاپے کی "برہانِ قاطع" میرے پاس تھی۔ اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزارہا لغت غلط، ہزارہا بیان لغو، عبارت پوچ، اشارات پادرہوا۔ میں نے سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور "قاطعِ برہان" اُس کا نام رکھا ہے۔ چھپوانے کا مقدور نہ تھا۔ مسودہ کاتب سے صاف کروالیا ہے۔ اگر کہو تو بہ سبیلِ مستعار بھیج دوں۔ تم اور چودھری صاحب اور جو اور سخن شناس اور منصف ہوں وہ اُس کو دیکھیں اور پھر میری کتاب میرے پاس پہنچ جائے۔

اگست یا ستمبر ۱۸۵۹ء ۳

(۱۴)

میرے شفیقِ دلی کو میرا اسلام پہنچے۔ کل "انشا" کا پارسل پہنچا اور آج خط۔ "انشا" کا نام "بہارستان" اور اب آپ کا تخلص "سرور"۔ "بہارستان" مضاف اور "سرور" مضاف الیہ، "بہارستانِ سرور" اچھا نام ہے۔

قطعے کا وعدہ نہیں کرتا۔ کس واسطے کہ اگر بے وعدہ پہنچ جائے گا تو لطف زیادہ دے گا اور اگر نہ پہنچے گا تو محلِ شکایت نہ ہوگا۔

رفعِ فتنہ و فساد اور بلاد میں مسلّم، یہاں کوئی طرح آسایش کی نہیں ہے۔ اہلِ دہلی عموماً بارے ٹھہر گئے۔ یہ داغ ان کی جبینِ حال سے مٹ نہیں سکتا۔ میں اموات میں ہوں۔ مردہ شعر کیا کہے گا؟ غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آوے؟ رہا قصیدہ، ممدوح کون ہے؟ ہائے انوریؔ گویا میری زبان سے کہتا ہے:

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح

اے دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل

گورمنٹ کے دربار میں ہمیشہ سے میری طرف سے قصیدہ نذر گزرتا ہے، اشرفیاں نہیں اور خلعت، ریاست دو دمانی کا سات پارچہ اور تین رقم جیغہ سرپیچ، مالائے مروارید مجھ کو ملا کرتا ہے۔ اب نواب گورنر جنرل بہادر یہاں آتے ہیں۔ دربار میں بلائے جانے کی توقع نہیں، پھر کس دل سے قصیدہ لکھوں؟ صناعتِ شعر اعضا و جوارح کا کام نہیں، دل چاہیے، دماغ چاہیے، ذوق چاہیے، اُمنگ چاہیے۔ یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں؟ معہٰذا کیوں کہوں؟ چونسٹھ برس کی عمر، ولولۂ شباب کہاں؟ رعایتِ فن، اُس کے اسباب کہاں؟ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ یہاں سے خطاب حضرت صاحبِ عالم کی طرف ہے۔

پیر و مرشد کو سلام نیاز پہنچے۔ "کف الخضیب" صورِ جنوبی میں سے ایک صورت ہے، اُس کے طلوع کا حال مجھ کو کچھ معلوم نہیں۔ اختر شناسانِ ہند کو اس کا کچھ حال معلوم نہیں اور اُن کی زبان میں اس کا نام بھی یقین ہے کہ نہ ہوگا۔ قبولِ دعا وقتِ طلوع منجملہ مضامینِ شعری ہے۔ جیسے کتاں کا پرتوِ ماہ میں پھٹ جانا اور زمرد سے افعی کا اندھا ہو جانا۔ آصف الدولہ نے افعی تلاش کر کر منگوایا اور قطعاتِ زمرد اُس کے محاذیِ چشم رکھے۔ کچھ اثر ظاہر نہ ہوا۔ ایران و روم و فرنگ سے انواع کپڑے منگوائے۔ چاندنی میں پھیلائے کوئی مسکا بھی نہیں۔

تحویلِ آفتاب بہ حمل کے باب میں موٹی بات یہ ہے کہ بائیس مارچ کو واقع ہوتی ہے، کبھی اکیس کبھی تیئیس بھی آپڑتی ہے، اس سے تجاوز نہیں رہا۔ طالع وقتِ تحویل درست کرنا بے کتبِ فن اور مبلغِ علم ممکن نہیں۔ میرے پاس یہ دونوں باتیں نہیں :

نہ دانم کہ گیتی چساں می رود
چہ نیک و چہ بد در جہاں می رود

میں تو اب روز و شب اس فکر میں ہوں کہ زندگی تو یوں گزری، اب دیکھیے موت کیسی ہو :

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

میرا ہی شعر ہے اور میرے ہی حسبِ حال ہے۔

سکّے کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرّا یا کوئی گراب۔ کس سے کہوں؟ کس کو گواہ لاؤں؟ یہ دونوں سکّے ایک وقت میں کہے گئے ہیں۔ یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوق نے یہ دو سکّے کہہ کر گزرانے، بادشاہ نے پسند کیے۔ مولوی محمد باقر، جو ذوق کے معتقدین میں تھے، انھوں نے "دلّی اردو اخبار" میں یہ دونوں سکّے چھاپے۔ اس سے علاوہ، اب وہ لوگ موجود ہیں کہ جنھوں نے اس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتے میں یہ سکّے سُنے ہیں اور اُن کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکّے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت ہوئے ہیں۔ میں نے ہر چند قلم روِ ہند میں "دلّی اردو اخبار" کا پرچہ ڈھونڈا، کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبّا مجھ پر رہا۔ پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ ہوا، چوں کہ موافق رضائے الٰہی کے ہے اُس کا گلہ کیا۔ شعر :

چوں جنبشِ سپہر بہ فرمانِ داورست
بیداد نبود آنچہ بما آسماں دہد

یہ تحریر بہ طریقِ حکایت ہے نہ بہ سبیلِ شکایت۔

"گویند" از ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ پرسش رفت کہ چہ حال داری؟ فرمود: کدام حال خواہد بود کسے را کہ خدا از وے فرض طلبد و پیمبر سنت وزن نان خواہد و ملک الموت جان قصہ مختصر اب زیست بہ امیدِ مرگ ہے۔

"قاطعِ برہان" چودھری صاحب کی نثر کے اجزا کے ساتھ بھیجا جائے گا، بہ مقابلہ "برہانِ قاطع" منطبعہ دیکھا جائے اور بے حیف و بے میل از راہِ انصاف دیکھا جائے۔ مرشد زادوں کو سلامِ مسنون اور دعائے افزونیٔ عمر و دولت پہنچے۔

اکتوبر یا نومبر ۱۸۵۹ء

(۱۵)

جنابِ عالی!

آج آپ کا تفقد نامہ، مرقومہ یازدہم شعبان مطابق پنجم مارچ بہ قیدِ روزِ دوشنبہ، پہنچا۔ پہلے تو ان تاریخوں کے حساب کے تطابق میں، میں الجھا۔ پھر خط کے جلد پہنچنے سے بہت خوش ہوا، ڈاک کیا ہے، خاک ہے۔ خیر، ادھر پڑھا اُدھر جواب لکھا۔ خدا کرے یہ میرا خط جلد پہنچے، ورنہ یہ آپ کو خیال ہوگا کہ غالبؔ نے ہمارے خط کا جواب نہ لکھا۔

حقیقت میری مجملاً یہ ہے کہ راہ و رسمِ مراسلتِ حکامِ عالی مقام سے یہ دستور جاری ہو گئی ہے۔ نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر غرب و شمال کو نسخۂ "دستنبو" بہ سبیلِ ڈاک بھیجا تھا۔ اُن کا خط فارسی مشعرِ تحسینِ عبارت و قبولِ صدقِ ارادت و مودت، بہ سبیلِ ڈاک آ گیا۔ پھر قصیدۂ بہاریہ تہنیت و مدحت میں بھیجا گیا، اُس کی بھی رسید آ گئی۔ وہی "خاں صاحب، بسیار مہربان دوستاں" القاب اور کاغذ افشانی۔ ازاں بعد ایک قصیدہ جناب رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹننٹ گورنر بہادر قلمروِ پنجاب کی مدح میں بہ توسطِ صاحب کمشنر بہادر دہلی گیا۔ اُس کے جواب میں بھی خوشنودی نامہ بہ توسطِ کمشنر بہادر کل مجھ کو آ گیا۔

پنسن ابھی تک مجھ کو نہیں ملا، جب ملے گا حضرت کو اطلاع دی جائے گی۔

پیر و مرشد عالم ہیں اور میں جاہل ہوں۔ اُن کے تسلیم نہ کرنے کو میں نے تسلیم کیا اور پھر تسلیم بجا لایا۔

اے حضرت جناب مخدوم مکرم چودھری غلام رسول صاحب کی خدمت میں انہی الفاظ میں رسم مبارکباد ادا کی گئی تھی، نہ عبارت آرائی، نہ طبع آزمائی۔ کچھ عجب نہیں کہ وہ خط بھی مئی و جون میں آپ کو پہنچ جائے۔ آپ کا بھی تو مارچ کا خط مجھ کو اب آخر اپریل میں پہنچا ہے۔

جناب شیخ صاحب! کیوں مجھ کو محجوب کرتے ہیں؟ اس باب میں اس سے زیادہ عرض نہیں کر سکتا کہ افادہ مشترک ہے۔ قصیدہ و مثنوی بھیج دیجیے، لطف اٹھاؤں گا اور جو کچھ میرے خیال میں آئے گا، بے تکلف عرض کر دوں گا۔ میرا اسلام کہیے اور مثنوی اور قصیدہ اُن سے لے کر جلد بھیج دیجیے۔

اپنے عم عالی مقدار کی خدمت میں میرا اسلام پہنچائیے اور کہیے کہ حضرت خلاصہ مکتوب سابق یہ ہے، الفاظ ہندی تھے۔ شاید کچھ تغیر بالمرادف ہو، تو ہو "یہ شادی بہ صد ہزار مسرت و نشاط آپ کو مبارک ہو اور اُن کی اولاد دیکھنی اور اسی طرح اُن کی شادی کرنی نصیب ہو۔

فیض علی خاں صاحب کو میرا اسلام پہنچے۔ میں بھی آپ کی ملاقات کا مشتاق اور آپ کا مداح رہوں گا۔

خط کا لفافہ اس خط میں ملفوف کر کے بھیجتا ہوں۔ یہ آج پہنچا اور آج ہی میں نے اس کا جواب لکھا، کاتب وہی ہے جو لفافہ ملفوفہ کا مکتوب الیہ ہے۔۔

اپریل ۱۸۶۰ء

(۱۶)

میرے مشفق!

آپ کا خط آیا اور اُس کے آنے نے تمھاری رنجش کا وسوسہ میرے دل سے مٹایا۔ ایک قاعدہ آپ کو بتاتا ہوں، اگر اُس کو منظور کیجے گا تو خطوط کے نہ پہنچنے کا احتمال اٹھ

جائے گا اور رجسٹری کا درد سر جاتا رہے گا۔ آدھ آنہ نہ سہی ایک آنہ سہی۔ آپ بھی خط بیرنگ بھیجا کیجے اور میں بھی بیرنگ بھیجا کروں۔ اسٹامپ پیڈ خطوط تلف بھی ہوتے ہیں۔ اس قاعدے کا جیسا کہ میں واضع ہوا ہوں، بادی بھی ہوا اور یہ خط بیرنگ بھیجا۔

پنسن جاری ہو گیا، تین برس کا چڑھا ہوا روپیہ مل گیا۔ بعد ادائے قرض ستاسی روپیے گیارہ آنے بچے۔ اب ماہ بہ ماہ روپیہ ملتا ہے مگر یہی تین مہینے ستمبر، اکتوبر، نومبر ملیں گے، دسمبر ۱۸۶۰ء سے تنخواہ ششش ماہی ہو جائے گی۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ چار روپیے سینکڑا سالانہ عموماً وضع ہوا کرے گا۔ اس حساب سے میرے حصے میں ڈھائی روپے مہینا آیا۔ باسٹھ روپے آٹھ آنے کے ساٹھ رہیں گے۔ کچھ رام پور سے ماہ بہ ماہ آتا ہے۔ یہ دونوں آمدنیں مل کر خوش و ناخوش گزارا ہوا جاتا ہے۔

یہاں شہر ڈھ رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار اور اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا، اب پتا بھی نہیں کہ کہاں تھے؟ صاحبانِ امکنہ اور دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دوکان کہاں تھی؟

برسات بھر مینہ نہیں برسا۔ آبِ تیشہ اور کلند کی طغیانی سے مکانات گر گئے۔ غلّہ گراں ہے، موت ارزاں ہے، میوے کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر، باجرہ بارہ سیر، گیہوں تیرہ سیر، چنے سولہ سیر، گھی ڈیڑھ سیر، ترکاری مہنگی۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ کوار کا مہینا جسے جاڑے کا دوار کہتے ہیں۔ پانی گرم، دھوپ تیز، روز لو چلتی ہے۔ جیٹھ اساڑھ کی سی گرمی پڑتی ہے۔

حضرت رفعت درجت جناب صاحب عالم کی خدمت میں دوستانہ سلام اور مریدانہ بندگی۔ بہ انکسار تمام عرض کرتا ہوں، حضرت کو کس راہ سے میرے آنے کا انتظار ہے؟ میں نے مرشد زادے کے خط میں کب اپنا عزم لکھا یا کسی نے آپ سے میری زبانی کہا کہ آپ روزِ روانگی کے تقرر سے اطلاع چاہتے ہیں۔ ہاں آپ کی قدم بوسی کی

تمنا اور انور الدولہ کے دیدار کی آرزو حد سے زیادہ ہے اور ایسا جانتا ہوں کہ یہ آرزو گور میں لے جاؤں گا۔

تنخواہ کے اجرا کا حال اور مستقبل میں اُس کے وصول کی صورت، اُن سطروں سے جو آغازِ مکتوب میں چودھری عبدالغفور صاحب کی خدمت میں لکھی گئی ہیں، مع رودادِ شہر معلوم کر لیجے گا۔

لالہ گوبند پرشاد صاحب ہنوز میرے پاس نہیں آئے ہیں۔ دنیادار نہیں۔ فقیر خاکسار ہوں، تواضع میری خُو ہے۔ انجاحِ مقاصدِ خلق میں حتی الوسع میں کمی کروں تو ایمان نصیب نہ ہو۔ اِنشاءَ اللہ العزیز، وہ فقیر سے راضی و خوشنود رہیں گے۔

جناب مستطاب حضرت محمد امیر صاحب کی خدمت میں بعد سلام نیاز یہ گذارش ہے کہ میرے پاس حضرت کا سلام پیام سوائے اب کی بار کے کبھی نہیں پہنچا۔ اب ان سطور کو اپنا ذریعۂ افتخار سمجھا اور نویدِ مقدمِ مبارک سے بہت خوش ہوا۔

یہ جو خانہ کوچی و گریز پائی اور بے اطمینانی کا آپ کو مجھ پر گمان اور اُس کا رنج ہے، یہ کسی نے خلافِ واقع آپ سے کہا ہے۔ میں مع زن و فرزند ہر وقت اِسی شہر میں قلزمِ خوں کا شناور رہا ہوں، دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا، نہ پکڑا گیا، نہ نکالا گیا، نہ قید ہوا، نہ مارا گیا۔ کیا عرض کروں کہ میرے خدا نے مجھ پر کیسی عنایت کی اور کیا نفسِ مطمئنہ بخشا۔ جان و مال و آبرو میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا۔ تنخواہ جس کو حضرت نے یومیہ لقب دیا ہے، اُس کا حال اوپر کی تحریر سے دریافت ہوگا۔ فقیر کو اپنا دوست و معتقد اور مشتاق تصور فرماتے رہیے گا۔ مرشد زادہ مرتضوی دودمان سید شاہ عالم کو سلام و دعا۔

ڈپٹی صاحب سے مجھ سے ملاقات کثرت سے نہیں ہے۔ اُن کو کثرتِ اشتغال سے فرصت نہیں، مجھ کو افراطِ ضعف سے طاقت نہیں، اگر بہ حسبِ اتفاق کہیں ملاقات ہو گئی تو آپ کا سلام کہہ دوں گا۔ آپ اپنے اخوانِ عالی شان کو میرا سلام پہنچا دیجے گا؛

بندہ شاہ، شمایم و ثنا خوانِ شما

ستمبر ۱۸۶۱ء

(۱۷)

میرے مشفق چودھری عبدالغفور صاحب اپنے خط اور قصیدہ بھیجنے کا مجھ کو شکر گزار اور قصیدۂ سابق کی اب تک اصلاح نہ پانے سے شرمسار تصور فرمائیں اور ان دونوں قصیدوں کے باہم پہنچنے کا انتظار کریں:

نوید وصلِ وِیَم می دہد ستارہ شناس
نہ کردہ ژرف نگاہی مگر در اخترِ من

تحقیق کہ اب روئے سخن جناب فیض نصاب جامع مدارج جمع الجمع، بزمِ وحدت کے فروزندہ شمع، مستغرقِ مشاہدۂ شاہدِ ذات، حضرت صاحب عالم صاحب قدسی صفات، کی طرف ہے اور یہ شعر افتتاحِ کلام ہے:

پہلے کچھ باتیں کہ بادی النظر میں خارج از مبحث معلوم ہوں گی، لکھی جاتی ہیں۔ میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا، اُس کی جاگیر کے عوض میری اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے۔ انھوں نے نہ دیے مگر تین ہزار روپے سال، اُس میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سال۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کولبرک صاحب بہادر رزیڈنٹ دہلی اور استرلنگ صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ رزیڈنٹ معزول ہو گئے، سکرتر بہ مرگِ ناگاہ مر گئے۔ بعد ایک زمانے کے پادشاہ دہلی نے پچاس روپے مہینا مقرر کیا، اُن کے ولی عہد نے چار سو روپے سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس کے بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ پادشاہِ اودھ کی سرکار سے بہ صلۂ مدح گستری پانسو روپے سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے۔ یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں، مگر سلطنت جاتی رہی

اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی، سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔

ایسے طالع[1] مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ اب میں جو والیِ دکن کی طرف رجوع کروں[1] یاد رہے کہ متوسط یا مرجائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اُس کی ضائع جائے گی اور والیِ شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اگر اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔ اے خداوندِ بندہ پرور، یہ سب باتیں وقوعی اور واقعی ہیں، اگر ان سے قطع نظر کر کے قصیدے کا قصد کروں، قصد تو میں[2] کر سکتا ہوں، تمام کون کرے گا؟ سوائے ایک ملکہ کے کہ وہ پچاس پچپن برس کی مشق کا نتیجہ ہے، کوئی قوت باقی نہیں رہی۔ کبھی جو سابق کی اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے مگر حیران رہتا ہوں کہ میں نے یہ نثر کیوں کر لکھی تھی اور کیوں کر یہ شعر کہے تھے: عبدالقادر بیدلؔ کا یہ مصرع گویا میری زبان سے ہے:

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

پایانِ عمر ہے، دل و دماغ جواب دے چکے ہیں۔ سو روپیے رام پور کے، ساٹھ روپیے پنسن کے روٹی کھانے کو بہت ہیں۔ گرانی اور ارزانی امورِ عامہ میں سے ہے۔ دنیا ... ہوم خوش و ناخوش چلے جاتے ہیں۔ قافلے کے قافلے آمادۂ رحیل ہیں۔ دیکھو منشی نبی بخش مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے۔ ماہِ گذشتہ میں گزر گئے۔ مجھ میں قصیدے کے لکھنے کی قوت کہاں؟ اگر ارادہ کروں تو فرصت کہاں؟ قصیدہ لکھوں، آپ کے پاس بھیجوں، آپ دکن کو بھیجیں۔ متوسط کب پیش کرنے کا موقع پائے؟ پیش کیے پر کیا پیش آئے؟ اِن مراحل کے طے ہونے تک میں کیوں کر[3] جیوں گا؟

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ۔ کَانَ اللّٰہُ وَلَمْ یَکُنْ مَعَہٗ شَیْئًا، وَاللّٰہُ اَلْآنَ کَمَا کَانَ۔

نومبر ۱۸۶۶ء[6]

(۱۸)

حضرت چودھری صاحب!

عنایت نامۂ سابق۔ بیت:

تھا تو خط، پر نہ تھا جواب طلب
کوئی اُس کا جواب کیا لکھتا

آج دوپہر کو یہ خط پہنچا، آج ہی آخر روز جواب لکھ کر، رکھ چھوڑتا ہوں، کل صبح کو بہ شرطِ حیات ڈاک میں بھجوا دوں گا۔ "قاطع برہان" کے مجلدات جو بموجب توقیعِ خریداری میری ملک ہیں وہ اول جولائی میں میرے پاس اور اُن میں سے دو مجلد آخر جولائی میں آپ کے پاس پہنچیں گے۔ ایک آپ رہنے دیں گے اور ایک پیر و مرشد کی نذر کریں گے۔ اِنشاءَ اللہُ العلیُّ العظیم۔ شعر:

حبّذا فیضِ تعلق، معجز کلکش نگر
گر رود صد سالہ رہ پیشِ نظر باشد ہماں

یہ شعر مولانا نورالدین ظہوری رحمۃ اللہ علیہ کا ممدوح کی خوشنویسی کی تعریف میں ہے۔ مبالغہ سرحدِ تبلیغ اور غلو کو پہنچ گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اُس کا لکھا ہوا قطعہ یا کوئی عبارت سو برس کی راہ پر سے آدمی کو نظر آتی ہے۔ وجہ اُس کی یہ کہ حرف بہت روشن اور صاف و جلی ہیں اور چوں کہ یہ امر بہ حسبِ عادت و عقل ممتنع ہے، اس رو سے اس کو معجزۂ قلم کہا اور چوں کہ معجزہ خرقِ عادت ہے اور خرقِ عادت ایک امر ہے مسلماتِ جمہور میں سے۔ پس منکر کو گنجایشِ انکار نہ رہی۔ یہاں یہ خیال آئے گا کہ "فیضِ تعلق" بے کار رہتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ حُسنِ الہام ہے یعنی نگاہ کو از آنجا کہ باصرہ مشتاقِ حسن ہے، اُس خط سے وہ تعلق بہم پہنچا ہے کہ اگر وہ خط سو برس کی راہ پر ہو تو بھی نگاہ اس سے متعلق رہتی ہے۔ جیسے طائر کو اپنا آشیانہ اور مسافر کو اپنا وطن اور عاشق کو معشوق کا خط و خال مسافتِ بعیدہ سے پیشِ نظر رہتا ہے۔ چاہو ایک معلول کی دو علت سمجھو "فیضِ تعلق" مذکور اور حسنِ خط مقدر، چاہو "فیضِ تعلق" کو ادعا کہو اور حسنِ خط جو تقدیر میں ہے اُس کو سببِ تعلق کا اور موکد جانو ادعا کا۔ سنو، دعوے کے واسطے دلیل موضوع ہے، ادعا کو دلیل ضرور نہیں ہے۔ ہاں ادعا پر تاکید طریقۂ بلاغت ہے۔ یہ لطائفِ معنوی خاص اس

بزرگ کے حصے میں آئی ہے۔ میں جانتا ہوں مشتری اور عطارد نے مل کر ایک صورت پکڑی تھی۔ اس کا اسم نورالدین اور تخلص ظہوریؔ تھا۔ اللہ اللہ۔ فرماتا ہے۔ شعر:

مروت کرد شبہا بر تو سیرِ بام و در لازم
نمی باشد چراغِ خانہاسے بے نوایاں را

ظہوریؔ کا ممدوح اور معشوق ایک ہے یعنی سلطان جلیل القدر ابراہیم عادل شاہ۔ پادشاہوں کے منظر بلند ہوتے اور کیا بعید ہے کہ رعایا یا ملازمین میں سے کچھ لوگ زیرِ قصر رہتے ہوں اس واسطے پادشاہ دن کو اُس منظرِ بلند پر نہیں چڑھتا کہ مبادا رعیت یا ملازموں کی جورو بیٹیاں نظر آئیں۔ رات کو اُن کے گھر تاریک ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بلند مکان پر چڑھا تو کچھ نظر نہ آئے گا۔ یہ مدح ہوئی عفت کی اور عفت ایک فضیلت ہے فضائلِ اربعہ میں سے۔ اب ابہام کو سوچیے۔ ممدوح نے راتوں کو کوٹھے پر چڑھنا اپنے پر لازم کیا ہے اس واسطے کہ اُن کے گھروں میں چراغ نہیں۔ اگر کسی کو کسی کپڑے میں پیوند لگانا یا کوئی چمڑے کی چیز گانٹھنی یا کسی مریض کا تفحصِ حال منظور ہو تو وہ گھر اس ممدوح کے پرتوِ جمال سے روشن ہو جائے۔ چراغ کی حاجت باقی نہ رہے۔ جو کام جو شخص چاہے، وہ کر لے۔ مروت کے لفظ کا مزہ وجدانی ہے۔ سوائے اس لفظ کے کوئی لفظ یہاں کام نہیں آتا۔ اگر حفظِ ناموسِ رعایا ہے تو مروت ہے اور اگر مفلسوں کی کار برآری ہے تو مروت ہے۔ قالبِ معنی کی جان ہے ظہوریؔ ناطقے کی سرفرازی کا نشان ہے ظہوریؔ۔ زیادہ کیا لکھوں۔

جون ۱۸۶۲ء

(۱۹)

بندہ پرور!

پرسوں تمہارا خط آیا، آج جواب لکھ رکھتا ہوں، کل ڈاک میں بھجوا دوں گا۔

میرا حال کیوں پوچھو؟ اپنے کو دیکھو جو تمہارا ڈھنگ ہے، وہی میرا رنگ ہے۔ شور و اورام

مرضِ خاص اور رنجِ عام، یہ ایک اجمال، دوسرا اجمال سنو کہ مہینا بھر سے صاحبِ فراش ہوں۔ صبح سے شام تک، شام سے صبح تک پلنگ پر پڑا رہتا ہوں۔ محل سرائے اگرچہ دیوان خانے کے بہت قریب ہے، پر کیا امکان جو جا سکوں، صبح کو نو بجے کھانا یہیں آ جاتا ہے۔ پلنگ پر سے پھسل پڑا، ہاتھ منھ دھو کر کھانا کھایا، پھر ہاتھ دھوئے، کُلّی کی، پلنگ پر جا پڑا۔ پلنگ کے پاس حاجتی لگی رہتی ہے۔ اُٹھا اور حاجتی میں پیشاب کیا اور پڑ رہا۔ مدتوں سے یہ مرض ہے کہ پیشاب جلد جلد آتا ہے۔ اس صاحبِ فراش ہونے کو دیکھو اور دم بہ دم تقاضاے بول کو دیکھو۔ پاخانے، اگرچہ دن رات میں ایک بار جاتا ہوں مگر صعوبت کو تصور کرو۔ ایک پھوڑا دائیں پہنچے میں، جس کو ساعد کہتے ہیں، دو پھوڑے بائیں پہنچے میں، یہ سہل ہیں۔ بائیں پاؤں میں کفِ پا و پشتِ پا سے لے کر آدھی پنڈلی تک ورم اور ورم بھی سخت، رادعات و محللات سے کچھ نہ ہوا۔ اب تجویز ہے کہ نیب کا بھرتا باندھیے۔ جب پکے، پھوٹے، تب مرہم لگائیے۔ کہو، جب کفِ[2] پا میں جراحت کا عمل ہوا تو قیام کا کہاں ٹھکانا؟

یہ حال جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں مجمل و موجز[3] ہے۔

میرا قیاس اس کا مقتضی ہے کہ پیر و مرشد حضرت صاحبِ عالم مجھ سے آزردہ ہیں اور وجہ اُس کی یہ ہے کہ میں نے ممتاز و اختر کی شاعری کو ناقص کہا تھا۔ اس رقعے میں ایک میزان عرض کرتا ہوں۔ حضرت صاحب اِن صاحبوں کے کلام کو یعنی ہندیوں کے اشعار کو قتیل اور واقف سے لے کر بیدل اور ناصر علی تک، اس میزان میں تولیں۔ میزان یہ ہے۔ رودکی و فردوسی سے لے کر خاقانی و سنائی و انوری وغیرہم تک ایک گروہ، اِن حضرات کا کلام تھوڑے تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے۔ پھر حضرت سعدی طرزِ خاص کے موجد ہوئے، سعدی[9] و جامی و ہلالی۔ یہ اشخاص متعدد نہیں۔ فغانی اور ایک شیوۂ خاص کا مبدع ہوا، خیالہاے نازک و معانیِ بلند لایا۔ اس شیوے کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے۔ سبحان اللہ قالبِ سخن میں جان پڑ گئی۔ اس روش کو بعد اس کے صاحبانِ طبع نے سلاست کا چربہ[12] بادیا صائب و

کلیم و سلیم و قدسی و حکیم شفائی اس زمرے میں ہیں۔ رودکی و اسدی و فردوسی، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا اور سعدی کی طرز نے بہ سبب سہلِ ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔ فغانی کا انداز پھیلا اور اُس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے۔ تو اب طرزیں تین ٹھہری ہیں۔ خاقانی اُس کے اقران، ظہوری اُس کے امثال۔ صائب اُس کے نظائر۔ خالصاً للہ ممتاز و اختر وغیرہم کا کلام ان تین طرزوں میں سے کس طرز پر ہے؟ بے شبہہ فرماؤ گے کہ یہ طرز اور ہی ہے۔ پس تو ہم تے جانا کہ اُن کی طرز چوتھی ہے! کیا کہنا ہے، خوب طرز ہے، اچھی طرز ہے مگر فارسی نہیں ہے، ہندی ہے۔ دارالضرب شاہی کا سکہ نہیں ہے، ٹکسال باہر ہے۔ داد، داد، انصاف، انصاف:

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار
زیک جام اند در بزمِ سخن مست
ولے با بادہ بعضے حریفاں
خمارِ چشمِ ساقی، نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعارِ این قوم
ورائے شاعری چیزے دگر ہست

وہ "چیزے دگر"[۳] پارسیوں کے حصے میں آئی ہے۔ ہاں اردو زبان میں اہلِ ہند نے وہ چیز پائی ہے۔ میر تقیؔ علیہ الرحمۃ:

بدنام ہو گے جانے بھی دو، امتحاں کو
رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جاں کو

سوداؔ:

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنسِ گراں کا

قائم:

قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی؟ کیوں کر مانوں
ہے تو ناداں مگر اتنا بھی[2] بد آموز نہیں

مومن خاں:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے ہاں کمتر اور[3] آتش کے ہاں بیشتر یہ تیز نشتر ہیں، مگر مجھے اُن[4] کا کوئی شعر اس وقت یاد نہیں آتا۔ یاد کیا آوے، لیٹا ہوا ہوں، دَم بہ دَم پاؤں کے ورم کی ٹیس ہوش اُڑائے دیتی ہے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔
جولائی ۱۸۶۳ء ۵

(۲۰)

ایک عبارت لکھتا ہوں چونکہ لفافہ جناب چودھری عبدالغفور صاحب کے نام کا ہوگا، پہلے وہ پڑھیں، پھر میرے پیر و مرشد کی نظر سے گزاریں، پھر مرشد زادہ شاہ عالم صاحب کو دکھائیں۔

برس دن سے فسادِ خون کے عوارض میں مبتلا ہوں۔ بثور و اورام میں لد رہا ہوں۔ برس دن میں اوجاع سہتے سہتے روح تحلیل ہو گئی نشست و برخاست کی طاقت نہ رہی اور پھوڑے تو خیر، مگر دونوں پنڈلیوں میں ہڈیوں کے قریب دو پھوڑے ہیں۔ کھڑا ہوا اور پنڈلیوں کی ہڈیاں چرّانے لگیں اور رگیں پھٹنے لگیں۔ بائیں پاؤں پر، کفِ پا سے جہاں تک وہ پھوڑا ہے، پنڈلی پر ورم ہے۔ رات دن پڑا رہتا ہوں۔ پلنگ کے پاس حاجتی لگی رہتی ہے، کھسک پڑا، بعد رفعِ حاجت پھر لیٹ رہا۔ اسی صورت سے روٹی کھاتا ہوں۔ اشعار کی اصلاح یک قلم موقوف۔ خطوط ضروری لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ دو خط چودھری صاحب کے آئے اور ایک خط شاہ عالم صاحب کا اور دو خط حضرت صاحب کے آئے۔ جواب نہ لکھ سکا۔ آج اپنے کو ٹھٹے دے کر مرد بنایا،

جب یہ عبارت لکھی۔ چودھری صاحب کو سلام۔ شاہ عالم صاحب کو سلام۔ حضرت صاحب کو بندگی۔

دسمبر ۱۸۶۳ء

(۲۱)

آہاہا، جناب منشی ممتاز علی خاں صاحب مارہرہ پہنچے۔ صاحب! یہ تو سیاحِ گیتی نوردِ ثانی مخدوم جہانیانِ جہاں گرد ہیں۔

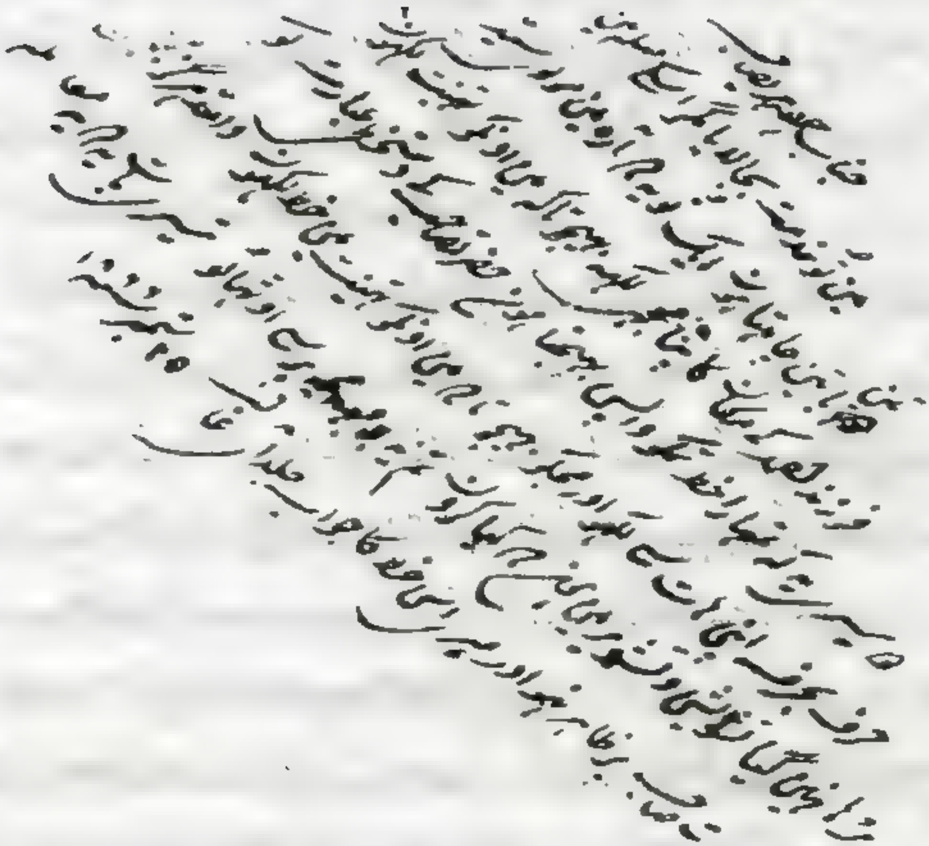
بہ ہر حال آپ نے دیباچہ بہت اچھا لکھا ہے، کتاب کو اس سے رونق ہو جائے گی۔ نظم میں وہ پایہ بلند کہ شعریٰ اُن کے شعر پر لآلیِ انجم نثار کرے، خود بلا گرداں ہو، لولیٔ سیما ہر مصرع پر دل و جان وار کرے، صدقے قربان ہو۔

"وار کرے" بہ معنیٔ "حملہ کرنے" کے ہے اور وہ جو آپ کا مقصود ہے اُن معنوں میں "وارنا" اور "وارے" آیا ہے۔ نہ "وار کرنا" اور "وار کرے"۔

آپ کو یاد ہوگا کہ چند سطریں میں نے بہ ہزار دشواری لکھ کر تمھیں بھیجی تھیں۔ خواہش یہ تھی کہ یہی سطریں میرے مخدوم اور مخدوم زادے کی نظر سے گزر جائیں۔ آج ایک خط میں نے پیر و مرشد کا اور پایا۔ وہ ابھی نہیں پڑھا، مگر شاہ عالم صاحب اُس خط کی پشت پر لکھتے ہیں کہ تو نے میرے خط کا جواب نہیں لکھا۔ حالانکہ میں اِن سطروں میں یہ لکھ چکا ہوں کہ نہ مجھے تحریر کی طاقت نہ اصلاح کے ہوش، ایک بات کو دس دس بار کیا لکھوں۔ اب میرا انجام کار دو طرح پر متصور ہے یا صحت یا مرگ۔ پہلی صورت میں خود اطلاع دوں گا، دوسری صورت میں سب احباب خارج سے سن لیں گے۔ یہ سطریں لیٹے لیٹے لکھی ہیں۔

دسمبر ۱۸۶۳ء

(۲۲)



جنابِ[1] چودھری صاحب!

میں تو خدمت بجالایا مگر اس کے صلے میں تین باتیں چاہتا ہوں: ایک تو یہ کہ آرے میں مولوی سید فرزند احمد کے مکان کا پتا مجھے لکھ بھیجو تاکہ میں اُن کو تہنیت لکھوں، دوسرے یہ کہ تمھارا خط تم کو واپس بھیجتا ہوں، حضرت صاحب کی دستخطی عبارت کو حرف بہ حرف اپنے ہاتھ سے لکھو اور مجھ کو بھیجو تاکہ میں اُن کو تہنیت میں خط لکھوں، واللہ ہرگز مجھ سے پڑھا نہیں گیا، تشویش و تشویر میں ہوں کہ کیا کروں؟ تم یہ بوجھ مجھ پر سے اُٹھالو۔ تیسری بات یہ کہ یہ معاملہ حضرت صاحب پر ظاہر نہ ہو اور میرے اس خط کا جواب جلد آئے۔

۲۵ ستمبر ۱۸۶۶ء — غالب

جناب چودھری صاحب کو سلام پہنچے۔ آپ نے اپنے مزاج کی ناسازی کا حال کچھ نہ لکھا۔ اگر پیر و مرشد بھی نہ لکھتے تو میں کیوں کر اطلاع پاتا اور اگر اطلاع نہ پاتا تو حصولِ صحت کی دعا کیوں کر مانگتا؟ کل سے وقتِ خاص میں، میں دعا مانگ رہا ہوں، یقین ہے کہ پہلے تم تندرست ہو جاؤ گے، ازاں بعد یہ خط پاؤ گے۔

اکثر صاحب اطراف و جوانب سے "ماہِ نیم ماہ" کے بھیجنے کا حکم بھیجتے ہیں اور میں جی میں کہتا ہوں کہ جب "مہرِ نیم روز" کی عبارت کو نہیں سمجھے تو "ماہِ نیم ماہ" کو لے کر کیا کریں گے۔

صاحب! مہرِ نیم روز کے دیباچے میں، میں نے لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کا نام "پرتوستاں" ہے اور اس کے دو مجلد ہیں۔ پہلی جلد میں ابتدائے خلقتِ عالم سے ہمایوں کی سلطنت تک کا ذکر، دوسرے حصے میں اکبر سے بہادر شاہ تک کی سلطنت کا بیان ــــ پہلے حصے کا نام "مہرِ نیم روز" دوسرے حصے کا اسم "ماہِ نیم ماہ" بارے پہلا حصہ تمام ہوا، چھاپا گیا، جا بجا پہنچا۔ قصد تھا جلال الدین اکبر کے حالات کے لکھنے کا کہ امیر تیمور تک کا نام و نشان مٹ گیا؛ "آں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مرد۔" جو کتاب میں نے لکھی ہی نہ ہو وہ بھیجوں کہاں سے؟

اب پیر و مرشد صاحبِ عالم کی طرف خطاب ہے۔ پیر و مرشد کو میری بندگی اور صاحبزادوں کو دعا۔ خداوند مجھے مارہرہ بلاتے ہیں اور میرا قصد مجھے یاد دلاتے ہیں۔ اُن دنوں میں کہ دل بھی تھا اور طاقت بھی تھی۔ شیخ محسن الدین مرحوم سے بہ طریقِ تمنا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں، اب وہ دل کہاں سے لاؤں؟ طاقت کہاں سے پاؤں؟ نہ آموں کی طرف وہ رغبت، نہ معدے میں اتنے آموں کی گنجایش۔ نہار منہ میں آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں جو کہوں بین العشائین، ہاں آخر روز بعد ہضمِ معدی آم کھانے بیٹھ جاتا تھا، بے تکلف عرض کرتا ہوں اتنے آم کھاتا تھا، پیٹ اپھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ کھاتا اب

بھی اُسی وقت ہوں، مگر دس بارہ، اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات:

دریغا کہ عہدِ جوانی گذشت

جوانی مگو، زندگانی گذشت

اب اس کے واسطے کیا سفر کروں؟ مگر حضرت کا دیکھنا، اُس کے واسطے متحملِ رنجِ سفر ہوں تو جاڑے میں نہ برسات میں:

اے وائے ز محرومیِ دیدار وگر ہیچ

(۲۴)

جناب چودھری صاحب!

آپ کے تلطف نامے کے ورود کی مسرت اور پارسل کے نہ پہنچنے کی حیرت، باعث اس کی ہوئی کہ آپ کو پھر تکلیف دوں اور باآں کہ خط جواب طلب نہ تھا، جواب لکھوں۔ بندہ پرور! میں نے پارسل کی رسید لے لی تھی۔ اب آپ کے خط کو پڑھ کر کارپردازانِ ڈاک کے پاس وہ رسید بھجوائی۔ انھوں نے کتاب دیکھ کر میرے آدمی سے کہہ دیا کہ سکندرہ راؤ کی رسید یہ موجود ہے۔ اب اس پارسل کی جواب دہی وہاں والوں کے ذمے ہے۔ یہ سن کر میں نے یوں مناسب جانا کہ وہ رسید آپ کے پاس بھیج دوں۔ آپ سکندرہ راؤ کے ڈاک خانے میں بھجوا کر اُن سے پارسل منگوا لیں اور اب اس رسید کا میری طرف راجع کرنا کسی صورت میں ضرور نہیں۔

والسلام

(۲۵)

بندہ پرور!

بہت دن کے بعد پرسوں آپ کا خط آیا۔ سرنامے پر دستخط اور کے، اور نام آپ کا پایا۔ دستخط دیکھ کر مفہوم ہوا، خط کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ تمھارے دشمن یہ عارضۂ تپ د

لرزہ رنجور رہیں۔ اللہ اللہ ضعف کی یہ شدت کہ خط کے لکھنے سے معذور ہیں۔ خدا وہ دن دکھائے کہ تمہارا خط تمھارے دستخطی آئے۔ سرنامہ دیکھ کر دل کو فرحت ہو، خط پڑھ کر دُونی مسرت ہو۔ جب تک ایسا خط نہ آئے گا، دلِ سودا زدہ آرام نہ پائے گا۔ قاصدِ ڈاک کی راہ دیکھتا رہوں گا۔ جنابِ ایزدی میں سرگرمِ دعا رہوں گا۔ آپ کے عمِ عالی مقدار اور بزرگِ آموزگار کو میرا سلام مع صنوفِ اشتیاق والوفِ احترام۔

جنابِ چودھری صاحب، آؤ ہم تم حضرت صاحبِ عالم کے پاس چلیں اور اپنی آنکھیں اُن کے کفِ پائے مبارک سے ملیں۔ میں سلام کروں گا، تم معروض ہونا کہ غالب یہی ہے۔ اہلِ دہلی میں آپ کے دیدار کا طالب یہی ہے۔ میں نے عزم قدم بوسی کیا۔ پیر و مرشد نے مجھے گلے لگایا۔ فرماتے ہیں کہ "غالب تو اچھا ہے؟" عرض کرتا ہوں کہ اَلحمدُ لِلّٰہ، حضرت کا مزاج مقدس کیسا ہے؟" ارشاد ہوا کہ "مولوی سید برکات حسن تیری بہت تعریف کرتے رہتے ہیں۔" "جناب یہ اُن کی خوبیاں ہیں۔ میں ایسا نہیں ہوں جیسا وہ کہتے ہیں۔ کاش وہ میری رنجوری کا حال کہتے، ضعفِ قوٰی و اضمحلال کہتے، تاکہ میں اُن کے کلام کی تصدیق کرتا، اُن کی غم خواری اور درد مند نوازی کا دم بھرتا۔ ہے ہے:

در کشاکشِ ضعفم نگسلد رواں از تن
اینکہ من نمی میرم، ہم ز ناتوانیہاست

حضرت نے میری گرفتاری کا نیا رنگ نکالا۔ "بوستانِ خیال" کے دیکھنے کا دانہ ڈالا۔ مجھ میں اتنی طاقتِ پرواز کہاں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں، دام پر گر کے دانہ زمین پر سے اُٹھاؤں۔ حضرت، سچ تو یوں ہے کہ غم ہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے۔ سانس نہیں لے سکتا، اتنا تنگ کر دیا ہے۔ ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی، پہ دل نے کسی طرح تسلّی نہ پائی۔ اب دو باتیں سوچا ہوں: ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں، یوں ہی رو یا کروں گا، دوسری یہ آخر ایک نہ ایک دن مروں گا۔ یعنی کہ یہی دل نشین ہے۔ نتیجہ اس کا تسکین ہے۔ بیہات:

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اُس کی دیکھا چاہیے

اے حضرت شاہ عالم صاحب میرا سلام لیجیے۔ کاغذ باقی نہیں رہا۔ اپنے سب بھائیوں کو مع میر وزیر علی صاحب میرا سلام کہہ دیجیے۔

(۲۶)

جناب چودھری صاحب!

سیاہی پھیکی، کاغذ پتلا، پیر و مرشد کی عبارت ایک طرف، آپ کی تحریر بھی مغشوش ہو گئی۔ بہرا ہو گیا ہوں، مگر حضرت، بصر ہنوز باقی ہے۔ تمھاری عبارت کا جو لفظ پڑھ لیا، قرینے سے اُس کا محاورہ بھی معلوم ہو گیا۔ حضرت کی تحریر کا ایک لفظ سوائے "سعادت توام شاہ عالم کے،" اگر پڑھا گیا ہو تو دیدے پھوٹیں، ایمان نصیب نہ ہو، وہ خط بدستور آپ کے پاس واپس بھیجتا ہوں۔ اور ولی سفید کاغذ پر حرف بہ حرف اُس کی نقل کر کے پھر مجھے بھیج دیجیے تاکہ اُس کے جواب لکھنے میں سعادت حاصل کروں، لیکن بہت جلد۔ بہت جلد۔ آپ کی نگارش سے استادریافت ہو گیا کہ اب آپ اچھے ہیں۔ الحمد للہ۔

جناب ممتاز علی خاں صاحب کہاں اور مارہرہ کہاں۔ بہ ہر حال میرا سلام۔

(۲۷)

جنابِ عالی: "چہاچہا" ترجمہ ہندی ہے۔ ایک بار "چہا" کفایت کرتا ہے "انواع انواع" ہماری آپ کی بول چال میں ہے، لیکن تحریر میں درست نہیں۔ "چمن پر فضا" کو "چمن پر فزا" زائے ہوّز سے کیوں لکھا؟

خطاب واحد غائب فقط "شین" ہے نہ "اش" ہاں، اگر آخر لفظ میں "ہائے انتہائی ترکت"

پر ہو مثل "غمزہ" و "چشمہ" و "خانہ" و "دانہ" تو اُس کو یوں لکھتے ہیں۔ "چشمہ اش"، "غمزہ اش" "خانہ اش" "دانہ اش" اور باقی سب الفاظ کا حرف آخر "شین" سے مل جاتا ہے۔ خطاب واحد حاضر خطاب "متکلم" "ت" "ش" "میم ہے"۔ "الف" کو یہاں کیا دخل ہے، اور جو وہ دکھنی بوہرہ یعنی جامع "برہانِ قاطع" "ات" "اش"، "ام" لکھتا ہے غلط کرتا ہے۔ جہاں تم نے بعد اپنے نام کے یہ اشعار لکھے ہیں:

پریشاں ترز خویشم داستانیست الخ

وہاں ربطِ کلام جاتا رہا تھا۔ ایک جملہ فاصل کر دیا ہے۔ یعنی "بدیں اشعار زمزمہ سراست" یہ خبر اُس کافِ توصیفی کی ہے اور آگے جو نثر ہے اُس کا فاعل وہی مصنف ہے۔

حضرت پیر و مرشد صاحب عالم کی خدمتِ عالی میں میرا سلامِ مسنون عرض کیجیے گا اور یہ عرض کیجیے گا کہ آپ کے منشورِ عطوفت کا جواب بہ انفراد آپ کی خدمت میں پہنچے گا۔

حکیم غلام نجف خاں

(۱)

میاں!

حقیقتِ حال اِس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا، نکالا نہیں گیا، لٹا نہیں۔ کسی محکمے میں ابھی تک بلایا نہیں گیا معرضِ بازپرس میں نہیں آیا۔ آیندہ دیکھیے کیا ہوتا ہے؟

شیر زماں خاں نے مجھے آگرے سے خط لکھا اُس میں ایک رقعہ شیخ نجم الدین حیدر صاحب کی طرف سے بہ نام ظہیر الدین کے۔ اب مجھ کو ضرور آپڑا کہ اُس کو تمھارے پاس بھیجوں۔ آدمی کوئی ایسا نظر نہ چڑھا۔ ناچار بہ طریقِ ڈاک بھیجتا ہوں۔ اگر پہنچ جائے تو آگرے کا جواب لکھ کر میرے پاس بھیج دینا۔ میں یہاں سے آگرے کو روانہ کر دوں گا۔

مرسلۂ دوشنبہ چہارم جمادی الاول ۱۲۷۴ھ

مطابق ۲۱ دسمبر ۱۸۵۷ء جواب طلب غالبؔ

(۲)

میاں!

تمھارا خط پہنچا۔ آج میں نے اُس کو اپنے خط میں ملفوف کر کے آگرے کو روانہ کیا۔ تم

جو کہتے ہو کہ "تم نے کبھی مجھ کو خط نہیں لکھا اور اگر شیخ نجم الدین حیدر کا خط نہ آتا تو اب بھی نہ لکھتے" انصاف کرو، لکھوں تو کیا لکھوں؟ کچھ لکھ سکتا ہوں؟ کچھ قابل لکھنے کے ہے؟ تم نے جو مجھ کو لکھا تو کیا لکھا؟ اور اب جو میں لکھتا ہوں تو کیا لکھتا ہوں؟ بس اتنا ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے، نہ میں لکھوں گا۔

ظہیر الدین کو میری دعا کہنا اور میری طرف سے پیار کرنا۔ تم کو اور ظہیر الدین کو اور اُس کی ماں کو اور اُس کی بہن کو اور اُس کی لڑکی کو تمھاری ماں دعا کہتی ہے اور دعائیں دیتی ہے۔

یہ رقعہ حیدر حسن خاں کے نام کا ہے، اُن کو حوالے کر دینا۔

نگاشتۂ شنبہ ۲۶ دسمبر ۱۸۵۵ء اسد اللہ

(۳)

سعادت و اقبال نشاں حکیم غلام نجف خاں طال بقاؤہ۔

تمھارا رقعہ پہنچا۔ جو دم ہے غنیمت ہے۔ اِس وقت تک مع عیال و اطفال جیتا ہوں۔ بعد گھڑی بھر کے کیا ہو، کچھ معلوم نہیں، قلم ہاتھ میں لیے پر، جی بہت لکھنے کو چاہتا ہے مگر کچھ نہیں لکھ سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے۔ ورنہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

نواسی کا حال معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ اُس کی ماں کو صبر دے اور زندہ رکھے۔ میں یوں سمجھتا ہوں کہ یہ چھوکری قسمت والی اور حرمت والی تھی۔

تمھاری استانی تم کو اور ظہیر الدین کو اور اُس کی ماں کو اور اُس کی بہن کو دعا کہتی ہیں اور میں ظہیر الدین کو پیار کرتا ہوں اور دعا دیتا ہوں۔

سہ شنبہ ۱۹ جنوری ۱۸۵۶ء غالب

(۴)

بھائی!

ہوش میں آؤ۔ میں نے تم کو خط کب بھیجا اور رقعے میں کب لکھا کہ میں شیر زماں خاں کا خط

تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ میں نے تو ایک لطیفہ لکھا تھا کہ شیر زماں خاں نے میرے خط میں تم کو بندگی لکھی تھی اور میں وہ بندگی اس رقعے میں لپیٹ کر تم کو بھیجتا ہوں، بس بات اتنی ہی تھی۔ وہ بندگی لکھی ہوئی گویا الٹی ہوئی تھی، سو حضرت کو پہنچ گئی۔ خاطر عاطر جمع رہے۔

۱۸۵۸ء غالب

(۵)

میاں!

تم کو مبارک ہو کہ حکیمؐ صاحب پر سے وہ سپاہی، جو اُن کے اوپر متعین تھا اُٹھ گیا اور اُن کو حکم ہو گیا کہ اپنی وضع پر رہو مگر شہر میں رہو۔ باہر جانے کا اگر قصد کرو تو پوچھ کر جاؤ اور ہر ہفتے میں ایک بار کچہری میں حاضر ہوا کرو۔ چناں چہ وہ کچے باغ کے پچھواڑے مرزا جاگن کے مکان میں آ رہے۔ صفدر میرے پاس آیا تھا، یہ اُس کی زبانی ہے۔ جی اُن کو دیکھنے کو چاہتا ہے مگر از راہِ احتیاط جا نہیں سکتا۔

مرزا بہادر بیگ نے بھی رہائی پائی۔ اب اس وقت سنا ہے کہ وہ خاں صاحب کے پاس آئے ہیں۔ یقین ہے کہ بعد ملاقات باہر چلے جائیں گے یہاں نہ رہیں گے۔ قدم شریف میں وہ رہتے ہیں۔

آج پانچواں دن ہے کہ حکیم محمود خاں مع قبائل و عشائر پٹیالے کو گئے ہیں۔ بہ مقتضائے وقت اپنی سکونت کے مکان چھوڑ کر یہاں آ رہا ہوں۔ اس طرح کہ محل سرا میں زنانہ اور دیوان خانے میں مردانہ۔

پنسن کی درخواست کا ابھی کچھ حکم نہیں معلوم ہوا۔ کلکٹر سے کیفیت طلب ہوئی ہے دیکھیے بعد کیفیت کے جانے کے پنسن ملتا ہے یا جواب۔

پنجشنبہ ۱۶ شعبان ۱۲۷۵ھ

مطابق یکم اپریل ۱۸۵۹ء

(۶)

بھائی!

میرا دکھ سنو، ہر شخص کو غم موافق اُس کی طبیعت کے ہوتا ہے۔ ایک تنہائی سے نفور ہے، ایک کو تنہائی منظور ہے۔ تاہل میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ پٹیالے جانے میں ایک سُبکی اور ذلت تھی۔ اگرچہ مجھ کو دولت میسر آجاتی لیکن اس تنہائی چند روزہ اور تجرید مستعار کی کیا خوشی؟ خدا نے لاولد رکھا تھا، شکر بجالاتا تھا۔ خدا نے میرا شکر مقبول و منظور نہ کیا۔ یہ بلا بھی قبیلہ داری کی شکل کا نتیجہ ہے۔ یعنی جس لوہے کا طوق اُسی لوہے کی دو ہتھکڑیاں بھی پڑ گئیں۔ خیر اس کا کیا رونا ہے، یہ قیدِ جاودانی ہے۔

جناب حکیم صاحب ایک روز از راہِ عنایت یہاں آئے۔ کیا کہوں کہ اُن کے دیکھنے سے دل کیا خوش ہوا ہے۔ خدا اُن کو زندہ رکھے۔ میاں، میں کثیر الاحباب شخص ہوں۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں دوست اِس باسٹھ برس میں مر گئے۔ خصوصاً اس فتنہ و آشوب میں تو شاید کوئی میرا جاننے والا نہ بچے گا۔ اِس راہ سے مجھ کو، جو دوست اب باقی ہیں، بہت عزیز ہیں۔ واللہ دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احبا میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی کہ جب میں مروں، تو کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ پر رونے والا بھی تو دنیا میں ہو۔

مصطفےٰ خاں کا حال سنا ہوگا۔ خدا کرے مرافعے میں چھوٹ جائے، ورنہ حبسِ ہفت سالہ کی تاب اُس نازپرورد میں کہاں؟

احمد حسین میکش کا حال کچھ تم کو معلوم ہے یا نہیں؟ مخنوق ہوا، گویا اس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں۔

پنسن کی درخواست دے رکھی ہے۔ یہ شرطِ اجرا بھی میرا کیا گزارہ ہوگا؟ ہاں دو باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ میری صفائی اور بیگناہی کی دلیل ہے۔ دوسرے یہ کہ موافق قول عوام چولھے ولدر نہ ہوگا۔ تجھ کو میری جان کی قسم! اگر میں تنہا ہوتا تو اس وجہِ قلیل میں کیسا فارغ البال اور خوش حال

رہتا ہے یہ بھی خبط ہے جو میں کر رہا ہوں خدا جانے پنشن جاری ہوگا یا نہ ہوگا۔ احتمال تعیش وتنعم بشرطِ تجرید، صورتِ اجرائے پنشن میں سوچتا ہوں اور وہ موہوم ہے۔ بیدل کا شعر مجھ کو مزا دیتا ہے:

نہ شامِ مارا سحر نویدے، نہ صبحِ مارا دمِ سپیدے
چو حاصلِ ماست نا امیدی، غبارِ دنیا بفرقِ عقبیٰ

اِس وقت جی تم سے باتیں کرنے کو چاہا، جو کچھ دل میں تھا وہ تم سے کہا۔ زیادہ کیا لکھوں۔[۱]

از غالب بنام جان وجاناں واز جان وجاناں
عزیز تر، حکیم غلام نجف خاں سلمہ اللہ تعالےٰ

۱۸۵۸ء[۲]

(۷)

بھائی!

تمہارے رقعے کا جواب پہلے تم کو شیر زماں خاں نے دیا ہوگا، پھر ظہیر الدین خاں نے تم سے کہا ہوگا۔ کہو کوئی طرح شہر میں تمہارے آنے کی بھی ٹھہری یا نہیں؟ بُعد تیس کوس اور آدھ کوس کا برابر ہے۔ میری جان، تم ہنوز دو جاتے ہیں ہو۔ مجھ کو بھی تم جانتے ہو کہ میرا شہر میں رہنا بہ اجازت سرکار کے نہیں اور باہر نکلنا بے ٹکٹ ممکن نہیں۔ پھر میں کیا کروں؟ کیوں کر وہاں آؤں؟ شہر میں تم ہوتے تو جرأت کر کے تمہارے پاس چلا آتا۔ شیر زماں خاں صاحب ایک بار آئے تھے کہہ گئے تھے کہ پھر بھی آؤں گا مگر نہیں آئے۔ خدا جانے اُن کے والد کی رہائی ہوئی یا نہیں۔ اگر تم سے ملیں تو میرا سلام کہنا اور اُن کو میرے پاس بھیج دینا اور تم کو اُن کے والد کا جو حال اُن کی زبانی معلوم ہوا، وہ مجھ کو لکھ بھیجو۔ ظہیر الدین کو دعا والدعا۔

فروری مارچ ۱۸۵۸ء[۳]
از غالب

(۸)

بھائی!

ہاں غلام فخر الدین خاں کی رہائی، زندگی دوبارہ ہے۔ خدا تم کو مبارک کرے۔ سنا ہے

لوہارو بھی اُن دونوں صاحبوں کو مل گیا۔ یہ بھی ایک تہنیت ہے۔ خدا سب کا بھلا کرے۔

مجھ کو ڈپٹی کمشنر نے بلا بھیجا تھا۔ صرف اتنا ہی پوچھا کہ غدر میں تم کہاں تھے؟ جو مناسب ہوا، وہ کہا گیا۔ دو ایک خط آمدِ ولایت میں نے پڑھ جائے۔ تفصیل لکھ نہیں سکتا۔ انداز وادا سے پنسن کا بہ حال دبرقرار رہنا معلوم ہوتا ہے۔ مگر پندرہ مہینے پچھلے ملتے نظر نہیں آتے۔

میاں یہ الور میں کیا فساد برپا ہوا ہے۔ خدا خیر کرے۔ واسطے خدا کے جو تم کو معلوم ہوا ہو اور جو معلوم ہو جائے، اُس سے مجھ کو بھی اطلاع دینا۔

اگست ۱۸۵۸ء[۱] غالبؔ

(۹)

قبلہ!

یہ تو معلوم ہوا کہ بعد قتل ہونے دس آدمی کے، کہ وہ اُس میں عزیز بھی تھے، یہ سب وہاں سے نکالے گئے مگر صورت نہیں معلوم نہیں کہ کیوں کر نکلے؟ پیادہ یا سوار؟ تہی دست یا مال دار؟ مستورات کو تو رتھیں دے دی تھیں۔ ذکور کا حال کیا ہوا اور پھر وہاں سے نکلنے کے بعد کیا ہوا؟ کہاں رہے اور کہاں رہیں گے؟ سرکار انگریزی کی طرف سے موردِ تفقد و ترحم ہیں یا نہیں؟ رنگ کیا نظر آتا ہے؟ جبر کسر کی توقع ہے یا نہیں؟ تفضل حسین خاں کا حال خصوصاً اور ان سوالات کا جواب عموماً لکھو۔

مرزا منل میرا حقیقی بھانجا کہ وہ منشی خلیل الدین خاں مرحوم کا خویش ہے۔ اُس کی بی بی ہے اور شاید ایک یا دو بچے بھی ہیں۔ ادعائی ہے یہ امر کہ وہ بھی قافلہ کے ساتھ ہوگا۔ اگر آپ کو معلوم ہو تو اُس کا حال بہ انفراد لکھیے۔ خواجہ جان اور خواجہ امان کی حقیقت بھی بہ شرطِ اطلاع ضرور تحریر فرمایئے۔ اور ہاں صاحب آپ جانتے ہوں گے علی محمد خاں کو، وہ جو میر منشی عزیز اللہ خاں کا خویش ہے۔ اگر کچھ اُس کا بھی ذکر سنا ہو تو میں اُس کا خیر طلب ہوں۔

ستمبر ۱۸۵۸ء[۲] غالبؔ جواب طلب

(۱۰)

میاں!

میں تم سے رخصت ہو کر اُس دن مرادنگر میں رہا۔ دوسرے دن یعنی جمعے کو میرٹھ پہنچا۔ نواب مصطفیٰ خاں نے ایک دن رکھ لیا۔ آج شنبہ اکیس جنوری یہاں مقام ہے۔ نو بج گئے ہیں۔ بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ مفت کا کھانا ہے۔ خوب پیٹ بھر کر کھاؤں۔ کل شاہ جہاں پور، پرسوں گڑھ مکتیشر رہوں گا۔ مراد آباد سے پھر تم کو خط لکھوں گا۔

لڑکوں کے ہاتھ کے دو خط لکھے ہوئے اُن کی دادی کو بھجوا دیے ہیں۔ تم اُس اپنے نام کے خط کو لے کر ڈیوڑھی پر جانا اور اپنی استانی جی کو پڑھ کر سنا دینا اور خیر و عافیت کہہ دینا۔ جناب خاں صاحب کو میرا سلام نیاز اور ظہیر الدین احمد کو دعا کہہ دینا۔

ہاں بھائی! میں از روے مصلحت، اپنے کو مقاماتِ مختلف کا عازم کہہ آیا ہوں۔ اب جو شخص تم سے پوچھا کرے، اُس سے پردہ نہ کرنا اور صاف کہہ دینا کہ رام پور کو گیا ہے، یعنی سب کو معلوم ہو جائے اور کوئی تذبذب میں نہ رہے۔

مرقومۂ چاشتگاہ شنبہ ۲۱ جنوری ۱۸۶۰ء[۱]

(۱۱)

برخوردار سعادت و اقبال نشاں، حکیم غلام نجف خاں کو میری دعا پہنچے۔ تمھاری تحریر پہنچی۔ تم جداگانہ خط کیوں نہ لکھا کرو؟ خط لکھا اور بیرنگ یا پوسٹ[۲]، جس طرح چاہا اپنے آدمی کے ہاتھ ڈاک گھر بھیج دیا۔ مکان کا پتا ضرور نہیں۔ ڈاک گھر میرے گھر کے پاس۔ ڈاک منشی میرا آشنا۔

اب تم ایک کام کرو۔ آج یا کل ڈیوڑھی پر جاؤ اور جتنے خط جمع ہیں، وہ لو اور مان سنگی مضبوط کاغذ کا لفافہ کرو اور بیرنگ لکھ کر کلیان کے ہاتھ ڈاک گھر میں بھجوا دو اور اپنے خط میں جو حال شہر میں نیا ہو وہ مفصل لکھو۔

جناب حکیم صاحب کو سلام نیاز اور ظہیر الدین احمد خاں کو دعا کہنا۔

اب میرا حال سنو۔ تعظیم و توقیر بہت، ملاقاتیں تین ہوئی ہیں۔ ایک مکان کہ وہ تین چار مکانوں پر مشتمل ہے، رہنے کو ملا ہے۔ یہاں پتھر تو دوا کو بھی میسر نہیں۔ خشتی مکان گنتی کے ہیں۔ کچی دیواریں اور کھپریل، سارے شہر کی آبادی اسی طرح پر ہے۔ مجھ کو جو مکان ملے ہیں وہ بھی ایسے ہیں۔

ہنوز کچھ گفتگو درمیان نہیں آئی۔ میں خود اُن سے ابتدا نہ کروں گا۔ وہ بھی مجھ سے بالمشافہ نہ کہیں گے۔ مگر بہ واسطہ کار پردازانِ سرکار۔ دیکھوں کیا کہتے ہیں اور کیا مقرر کرتے ہیں۔ میں سمجھا تھا کہ میرے پہنچنے کے بعد جلد کوئی صورت قرار پائے گی لیکن آج تک کہ جمعہ آٹھواں دن میرے پہنچنے کو ہے، کچھ کلام نہیں ہوا۔

کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا ہے اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے۔ غذا میرے بھی خلافِ طبع نہیں۔ پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں۔ ایک دریا ہے "کوسی" سبحان اللہ اتنا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے۔ صاف، سبک، گوارا، ہاضم، سریع النفوذ اس آٹھ دن میں قبض و انقباض کے صدمے سے محفوظ ہوں۔ صبح کو بھوک خوب لگتی ہے۔ لڑکے بھی تندرست، آدمی بھی توانا مگر ہاں ایک عنایت اللہ دو دن سے کچھ بیمار ہے۔ خیر، اچھا ہو جائے گا۔ والدعا۔

جمعہ ۳ فروری ۱۸۶۰ء

(۱۲)

میاں!

تم نے بُرا کیا کہ لفافہ کھول کر نہ پڑھ لیا۔ بارے آج سہ شنبہ چودہ فروری صبح کے وقت یہ لفافہ پہنچا اور اسی وقت پڑھوایا گیا۔ خط لفٹنٹ گورنر بہادر کا نہیں۔ یہ خط نواب گورنر جنرل بہادر کے چیف سکرتر کا ہے۔ ترجمہ اُس کا یہ ہے:

از دفتر خانہ سکرتر اعظم، حکم دیا جاتا ہے عرضی دینے والے کو کہ جواب اس عرضی کا نواب

گورنر جنرل بہادر بعد دریافت کے ارشاد فرمائیں گے۔ از کمپ لودھیانہ ۲۸ جنوری ۱۸۶۰ء۔

یہاں کا یہ حال ہے کہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر آگرہ، مراد آباد آیا چاہتے ہیں۔ مراد آباد یہاں سے بارہ کوس ہے۔ نواب صاحب دورے کو اپنے ملک کے گئے ہیں۔ دو چار دن میں پھر آئیں گے۔ اگر اُن کی ملاقات کو مراد آباد جائیں گے، میں بھی ساتھ جاؤں گا۔ اگرچہ گورنر غرب وشمال کو دلّی سے کچھ علاقہ نہیں مگر دیکھوں، کیا گفتگو درمیان آتی ہے۔ جو واقع ہوگا تمھیں لکھوں گا۔

یہ تم کیا لکھتے ہو کہ گھر میں خط جلد جلد لکھا کرو۔ تم کو جو خط لکھتا ہوں، گویا تمھاری استانی جی کو لکھتا ہوں۔ کیا تم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ جاؤ اور پڑھ کر سناؤ؟ اب اُن کو خیال ہوگا کہ اس انگریزی خط میں کیا لکھا ہے۔ تم یہ خط میرا ہاتھ میں لیے جاؤ اور حرف بہ حرف پڑھ سناؤ۔

لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں۔ کبھی میرا دل بہلاتے ہیں، کبھی مجھ کو ستاتے ہیں۔ بکریاں، کبوتر بٹیریں، تُکل، کنکوا، سب سامان درست ہے۔ فروری مہینے کے دو دو روپے لے کر دس دن میں اُٹھا ڈالے، پھر پرسوں چھوٹے صاحب آئے کہ دادا جان کچھ ہم کو قرضِ حسنہ دو۔ ایک روپیہ دونوں کو قرضِ حسنہ دیا گیا۔ آج چودہ ہے، مہینا دور ہے۔ دیکھیے، کَے بار قرض لیں گے۔

یہاں کا رنگ نواب صاحب کے آنے پر جو ہوگا اور جو قرار پائے گا، وہ مفصل تم کو لکھوں گا اور تم اپنی والدہ کو سنا دینا اور ہاں بھائی، یہ بھی گھر میں پوچھ لینا کہ کدار ناتھ نے اندر باہر کی تنخواہ بانٹ دی، میں نے تو وفادار اور حلال خوری تک کی بھی تنخواہ بھیج دی ہے۔

سہ شنبہ ۱۴ فروری ۱۸۶۰ء غالبؔ

(۱۴)

صاحب!

کل آخرِ روز تمھارا خط آیا۔ میں نے پڑھا، آنکھوں سے لگایا، پھر بھائی ضیاء الدین خاں صاحب کے پاس بھجوایا۔ یقین ہے کہ انھوں نے پڑھ لیا ہوگا۔ ما کتب فیہ معلوم کیا ہوگا۔

تمھارے یہاں نہ ہونے سے ہمارا جی گھبراتا ہے۔ کبھی کبھی ناگاہ ظہیر الدین کا آنا یاد آتا ہے۔

کہو، اب خیر سے کب آؤ گے؟ کے برس، کے مہینے، کے دن راہ دکھاؤ گے۔ یہاں کا حال جیسا کہ دیکھ گئے ہو، بہ دستور ہے :

زمیں سخت ہے، آسماں دُور ہے

جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ تونگر غرہ ہے، مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے۔

آبکاری کے بندوبستِ جدید نے مارا۔ عرق کے نہ کھینچنے کی قیدِ شدید نے مارا۔ اِدھر انسدادِ دروازۂ آبکاری ہے، اُدھر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مولوی فضل رسول صاحب حیدر آباد گئے ہیں۔ مولوی غلام امام شہید آگے سے وہاں ہیں۔ محی الدولہ محمد یار خاں سورتی نے ان صورتوں کو وہاں بلایا ہے، پر یہ نہیں معلوم کہ وہاں اُن کو کیا پیش آیا ہے۔ اگر تم معلوم کر سکو یا کچھ تم کو معلوم ہو گیا ہو تو مجھ کو ضرور لکھو۔ زیادہ کیا لکھوں؟

کیوں ظہیر الدین کیا میں اس لائق نہ تھا کہ تو ایک خط مجھ کو الگ لکھتا یا اپنے باپ کے خط میں اپنے ہاتھ سے بندگی لکھتا؟ حکیم غلام نجف خاں خط لکھنے بیٹھے، تیری بندگی لکھ دی تیرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ اِس بندگی کے آنے کی مجھے کیا خوشی؟

صبح یک شنبہ ۱۱ جنوری ۱۸۶۳ء غالب

(۱۴)

میاں!

تمھارا گلہ میرے سر و چشم پر، لیکن میرا حال سن لو اور اپنے وہم و قیاس پر عمل نہ کرو۔ پہلے ظہیر دلپذیر کا خط آیا۔ پڑھتے ہی اُس کا جواب لکھ رکھا۔ دوسرے دن ڈاک میں بھجوایا۔ مضمون بتغیرِ الفاظ، یہ "تم جو پھوڑے پھنسی میں مبتلا رہتے ہو، اُس کا سبب یہ کہ مجھ میں تمھارا لہو ملتا ہے اور میں احتراقِ خون کا مبتلا ہوں"۔ پھر تمھارا خط آیا۔ تیسرے دن اُس کا جواب بھجوا دیا۔ مضمون یہ کہ "تم سے تو یہ اپیارا پوتا ظہیر الدین اچھا کہ جاتے وقت مجھ سے مل گیا۔ اور وہاں پہنچتے ہی مجھ کو خط لکھا۔ رسید

ڈاک گھر سے ملتی نہیں۔ خط دونوں پیڈ تھے۔ یہاں کے ڈاک گھر میں ممکن نہیں کہ میرے وہ دونوں خط رہ گئے ہوں۔ شیخو پور کی ڈاک کے ہرکاروں نے نہ پہنچایا، میرا کیا قصور ہے؟ البتہ سرنامے پر صرف بستی کا نام اور تمہارا نام تھا، ٹلے کا نام نہ تھا۔ شاید اس سبب سے خط نہ پہنچا ہو۔ اسی وقت تمہارا خط آیا۔ میں نے لیٹے لیٹے یہ سطریں لکھیں۔ اب عنایت اللہ کو تمہارے گھر بھیجتا ہوں اور پتا منگواتا ہوں کہ پتا وہاں سے کیا لکھا جاتا ہے۔

لو صاحب، عنایت اللہ آیا اور یہ پرزہ لایا ہے۔ پتا سرنامے پر لکھتا ہوں مگر ڈاک کا وقت نہیں رہا، کل بھیج دوں گا۔

حکیم ظہیر الدین خاں کو دعا۔ بیٹا! اب اس وقت مجھ میں دم نہیں۔ دعا پر قناعت کر۔ تیرے خط کا جواب جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں، بھیج چکا ہوں۔ جھوٹے پر لعنت، تو بھی کہہ "بیش باد"۔

نواب مصطفیٰ خاں کل شہر میں آ گئے۔ مع قبائل آئے ہیں۔ ذی قعدہ میں چھوٹے لڑکوں کے ختنے اور ذی الحجہ میں محمد علی خاں کی شادی کریں گے۔

آج پانچواں دن ہے، شہر میں مرغ کے انڈے برابر اولے پڑے۔ کہیں کہیں اس سے بڑے بھی۔

نواب لفٹنٹ گورنر بہادر جدید آئے۔ دربار کیا۔ میری تعظیم اور مجھ پہ عنایت میری تمنا سے زیادہ کی۔ آؤ گے تو مفصل سن لو گے۔

شنبہ ۴ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ

یکم اپریل ۱۸۶۵ء　　　　نجات کا طالب ۔ غالب

(۱۵)

بھائی!

میں تم کو کیا بتاؤں کہ میں کیسا ہوں؟ طاقت یک قلم جاتی رہی ہے۔ پھوڑا بہ دستور ہے، رستا ہے، غیر محل اندیشہ نہیں ہے، رِس رِس کر مادہ نکل جائے گا۔ اس سے اور زیادہ خستہ و افسردہ

ہوں قبض کہ وہ دشمنِ جانی ہے، ان دنوں میں حد کو پہنچ گیا ہے۔ بہ ہر حال :

مرگیست بنامِ زندگانی

حضرت غور کی جگہ ہے۔ ایک مکان دلکشا، کوچے کی سیر، بازار کا تماشا، دو کمرے، دو کوٹھریاں، آتش دان صحن وسیع، اس کو چھوڑ کر وہ مکان لوں جو ایک تنگ گلی کے اندر ہے؟ دروازہ وہ تاریک کہ دن کو بغیر چراغ کے راہ نہ ملے اور پھر ڈیوڑھی پر حلال خوروں کا مجمع، گوہ کے ڈھیر، کہیں حلال خور کا بچہ ہگ رہا ہے، کہیں بیل بندھا ہوا ہے، کہیں کوڑا پڑا ہوا ہے۔ عیاذاً باللہ۔ خدا نہ لے جائے ایسے مکان میں۔

تم نے وہ مسودہ کیوں نہیں بھیجا؟ میں خدمت گزاری کو آمادہ ہوں۔

ستمبر ۱۸۶۵ء[۱]

نجات کا طالب۔غالب

(۱۶)

برخوردار حکیم غلام نجف خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔ بدھ کا دن، پہر بھر دن چڑھا ہوگا کہ میں فقط پالکی پر مراد آباد پہنچا۔ بیس جمادی الاول کی اور گیارہ اکتوبر کی ہے۔ دونوں لڑکے دونوں گاڑیاں اور رتھ اور آدمی سب پیچھے ہیں۔ اب آئے جاتے ہیں۔ رات بہ خیر گزرے، بہ شرطِ حیات کل رام پور پہنچ جائیں گے۔ گھبرایا ہوا ہوں۔ تیسرا دن ہے، پاخانہ پھرے کو۔

لڑکے بخیر و عافیت ہیں۔ اپنی استانی سے کہہ دینا۔ مرزا شہاب الدین خاں کو دعا۔ نواب ضیاء الدین خاں کو سلام۔ میرا رقعہ ان دونوں صاحبوں کو پڑھا دینا۔ ضرور ضرور۔ ظہیر الدین دعا سے خفا ہوگا، اس کو میری بندگی کہنا۔

۱۱ اکتوبر ۱۸۶۵ء[۲]

غالب

(۱۷)

اقبال نشان، عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں کو غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔ تمھارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو میرے کھانے پینے کی طرف سے تشویش ہے۔ خدا کی قسم، میں یہاں خوش اور

تندرست ہوں۔ دن کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن، پلاؤ، متنجن، پسندے، دونوں وقت روٹیاں خمیری، چپاتیاں، مربے، آچار۔ میں بھی خوش، لڑکے بھی خوش۔ کلو اچھا ہو گیا ہے۔ سقا، مشعلچی، خاکروب، سرکار سے متعین ہے۔ حجام اور دھوبی نوکر رکھ لیا ہے۔ آج تک دو ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ تنظیم، تواضع، اخلاق کسی بات میں کمی نہیں۔

ظہیرالدین خاں بہادر کو دعا پہنچے۔ یہ خط لے کر تم اپنی دادی صاحب پاس جاؤ اور یہ خط پڑھ کر سناؤ اور اُن سے یہ کہہ دو کہ وہ بات، جو میں نے تم سے کہی تھی وہ غلط ہے اس کی کچھ اصل نہیں ہے۔ باقی خیر و عافیت۔

صبح شنبہ ۲۱ ماہ اکتوبر ۱۸۶۵ء غالب

(۱۸)

صاحب!

تم سچ کہتے ہو۔ بھائی فضل اللہ خاں کی غم خواری اور مددگاری کا کیا کہنا ہے مگر الور سے مجھ کو لینا نہیں — یاد رکھنا کہ وہاں سے مجھے کچھ نہ آئے گا۔ بہ فرض محال اگر ملا تو ڈھائی سو روپیہ، سو وہ بھی مجھے بھائی فضل اللہ خاں کا دینا ہے، اُن کا قرض ادا ہو جائے گا۔ احیاناً اگر خلاف میرے عقیدے کے پانسو روپیے کا حکم ہوا اور وہ آ جائیں تو تم بعد اطلاع ڈھائی سو میاں فضل کو دے کر مجھ کو لکھنا۔ باقی کے واسطے میں جس طرح لکھوں اُس طرح کرنا۔

لو صاحب! شیخ چلی بنا۔ خیالی پلاؤ پکا لیا۔ اب روداد سنو۔ نواب صاحب کا اخلاص و التفات روز افزوں ہے۔ آج منگل کا دن، ۴ جمادی الثانی کی اور ۲۴ اکتوبر کی ہے۔ کھانے کی اور گھوڑوں اور بیلوں کے گھانس دانے کی نقدی ہو گئی لیکن اس میں میرا فائدہ ہے، نقصان نہیں۔ دسمبر کی پہلی سے جشن شروع ہو گا۔ ہفتے دو ہفتے کی مدت اُس کی ہے۔ بعد جشن کے رخصت ہوں گا۔ خدا چاہے تو آخر دسمبر تک تم کو آ دیکھتا ہوں۔ ظہیرالدین خاں کو دعا۔

۲۴ اکتوبر ۱۸۶۵ء

(۱۹)

صاحب!

تمھارے دو خط متواتر آئے۔ ظہیرالدین کا آگرے جانا میرا خط اُس کا موسومہ تمھارے پاس بھیجنا اور اُس کا آگرے کو روانہ ہونا۔ ظہیرالدین کی دادی کا بہ عارضۂ سرفہ و سعال رنجور ہونا۔ کدارناتھ کا مجھ سے خفا ہونا۔ مکان کو روکنے کی اجازت کا مانگنا۔ فضل حسن سے میرے واسطے دریوزۂ تفقد کرنا۔ یہ مدارج و مطالب معلوم ہوئے۔

ظہیرالدین کا خط تم نے کیوں کھولا۔ وہ مغلوب الغضب ہے، تم پر خفا ہوگا۔ اُس کی دادی اس موسم میں ہمیشہ اِن امراض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ایک نسخہ اُس کے پاس ماءاللحم کا ہے، وہ کھچوا دو اور ذرا خبر لیتے رہو۔ کدارناتھ لڑکا ہے، وہ مجھ سے کیا خفا ہوگا؟ روپیہ جو خزانے میں جمع ہوگا آخر وہی لائے گا۔ خفا میں ہوں کہ روپیہ دام دام پایا اور میرا تمسک نہ دیا۔ اور چھٹا تیئس روپے آٹھ آنے کا نہ بانٹا۔ مکان کے روکنے کو اور کس طرح لکھوں؟ شہاب الدین خاں کو لکھا۔ شمشاد علی بیگ کو لکھا، اب تم کو لکھتا ہوں۔ ستمبر کے پانچ روپے آٹھ آنے دے آیا ہوں۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر یہ سولہ روپے آٹھ آنے آکر دوں گا بلکہ اگر موقع بنے گا تو یہ سہ ماہا یہاں سے بہ طریقِ ہنڈوی بھیج دوں گا۔

اسمٰعیل خاں صاحب کو میری دعا کہو اور کہو کہ ڈیوڑھی کی سیڑھی بنوا دیں اور حویلی کے پاے خانے کی صورت درست کروادیں۔ ہائے قسمت! اس قسمت پر لعنت کہ میاں فضل حسن میرے مربی و محسن بنیں اور پھر وائے محرومی کہ مطلب برآری نہ ہو۔ خدا کرے نہ ہو۔ لونڈوں کا احسان زہرِ قاتل ہے۔ فضل اللہ خاں میرا بھائی ہے۔ اُس کا احسان مجھ کو گوارا، سو بار اُس سے کہا اور ہزار بار کہوں گا۔ خیر، جو ہوا سو ہوا۔ اب آپ اُس سے زنہار نہ کہیے گا، نہ لکھیے گا۔ اگر کچھ کہو تو فضل سے کہو، تفضل سے کہو۔ والا لا

نواب صاحب دورے سے یا آج شام کو یا کل آجائیں گے۔ جشنِ جمشیدی کی تیاریاں

ہو رہی ہیں۔

یکشنبہ ۱۲ نومبر ۱۸۶۵ء، صبح کا وقت　　　　نجات کا طالب۔ غالب

(۲۰)

حکیم غلام نجف خاں سنو! اگر تم نے مجھے بنایا ہے، یعنی استاد اور باپ کہتے ہو، یہ امر از روے تمسخر ہے تو خیر اور اگر از روے اعتقاد ہے تو میری عرض مانو اور ہیرا سنگھ کی تقصیر معاف کرو، بھائی انصاف کرو، اُس نے اگر حکیم احسن اللہ خاں سے رجوع کی وہ تمھارے بھائی بھی ہیں اور تم کو اُن سے استفادہ بھی ہے، اگر گھبرا کر حکیم محمود خاں کے پاس گیا تو اُن کے باپ سے تم کو نسبت تلمذ کی ہے۔ ابتدا میں اُن سے پڑھے ہو، پس یہ غریب سوائے تمھارے اگر گیا تو تمھارے ہی علاقے میں گیا۔ وہ بھی گھبرا کر اور خفقان سے تنگ آکر۔ اب جو حاضر ہوتا ہے تو لازم ہے کہ اس پر بہ نسبت سابق کے توجہ زیادہ فرماؤ اور بہ دل اس کا معالجہ کرو۔

التفات کا طالب۔ غالب

(۲۱)

میاں!

آج صبح کو تم آئے تھے۔ میں اُس ٹکٹ کے قصے میں ایسا اُلجھا کہ تم سے کہنا بھول گیا۔ اب میر عنایت حسین صاحب تمھارے پاس پہنچتے ہیں جس امر میں یہ تم سے کوشش چاہیں، تم کو میری جان کی قسم بہ دل متوجہ ہو کر اُس کام کو انجام دو۔ امر سہل ہے، کچھ بات نہیں ہے، مگر درصورت سعی۔ خدا کے ہاں سے تم کو بڑا اجر ملے گا اور میں تمھارا ممنون ہوا ہوں گا۔

نجات کا طالب۔ غالب

(۲۲)

میاں!

پہلے ظہیر الدین کا حال لکھو، پھر حکیم صاحب کی حقیقت لکھو۔ کہیں اور جائیں گے یا یہاں

آئیں گے ؟ اگر یہاں آئیں گے تو کب آئیں گے ؟ پھر تم خط لکھو میاں نظام الدین کو اور اس میں لکھو کہ "تم نے غالب کے خط کا جواب نہیں لکھا" وہ کہتا ہے کہ "میں حیران ہوں کہ میاں نظام الدین اور میرے خط کا جواب نہ لکھیں۔ خدا جانے مجھ سے ایسی کیا تقصیر ہوئی ہے۔"
نجات کا خدا سے اور تم سے اس رقعے کے جواب کا

طالب۔غالب

(۲۳)

میاں!

چانول بُرے، بڑھتے نہیں، لمبے نہیں، پتلے نہیں۔ اب زیادہ قصہ نہ کرو۔ پُرانے اور پتلے چانول آئیں۔ ایک روپیے کے خرید کر کے بھیج دو۔ یاد رہے، نئے چانول قابض ہوتے ہیں اور پُرانے چانول قابض نہیں ہوتے۔ یہ میرا تجربہ ہے۔

شام کو میر مجدالدین صاحب کہتے تھے کہ حکیم غلام نجف خاں کے پاس ایک کاتب ہے۔ بھائی دس بارہ جز کی ایک کتاب نثر کی مجھ کو لکھوانی ہے۔ یہ معلوم کر لو کہ وہ صاحب روپیے کے کَے جز لکھیں گے اور روز کس قدر لکھ سکتے ہیں ؟ یہ تو اب لکھو اور پھر دوپہر کے بعد اُن کو میرے پاس بھیج دو تا کہ میں اُن کو کاغذ اور منقول عنہ حوالے کروں۔ ظہیر الدین کو دعا کہو اور اُس کا حال لکھو۔

غالب

خواجہ غلام غوث خاں بےخبر

(۱)

پیر و مرشد!

یہ خط ہے یا کرامت ہے[۱]؟ صاف صفائے ضمیر و کشفِ حجب[۲] کی علامت ہے۔ مدعا ضروری التحریر اور اندیشۂ نشانِ مسکن دامن گیر۔ اگر یہ خط کل نہ آجاتا تو آج خط کیوں کر لکھا جاتا؟ سبحان اللہ! جس دن یہاں مجھ کو وہ مطلبِ خطیر در پیش آیا ہے، اُسی دن آپ نے وہاں خط لکھنے کو قلم اُٹھایا ہے۔ آپ کو عارفِ کامل کیوں کر نہ کہوں اور کیا کہوں ولی اگر نہ کہوں؟ مدعا بیان کرتا ہوں مگر یہ گمان کرتا ہوں کہ یہ خط پہنچنے نہ پائے گا کہ وہ رازِ سربستہ آپ پر کھل جائے گا یعنی یک شنبہ اٹھائیس نومبر[۳] کو دو خط اور دو پارسل، ایک میں "دستنبو" کا ایک مجلد اور ایک میں تین، معاً بہ سبیلِ ڈاک روانہ کر چکا ہوں۔ خطوں کا چوتھے پانچویں دن اور پارسلوں کا چھٹے ساتویں دن پہنچنا خیال کرتا[۴] ہوں۔ پارسلوں کے عنوان پر خطوں کی معیت رقم کی ہے اور خطوں کے سرنامے پر پارسلوں کے ارسال کی اطلاع دی ہے۔ تین[۵] کتاب والے[۶] پارسل اور ایک خط پر جناب چیف سکرتر بہادر اوّل کا نام نامی ہے اور ایک کتاب والے[۷] پارسل اور ایک خط پر جناب چیف[۸] سکرتر بہادر دوم کا اسم سامی ہے۔ آج پانچواں دن ہے۔ خط دونوں اگر پہنچ گئے ہوں تو کیا عجب ہے بلکہ سچ تو یوں ہے کہ اگر نہ پہنچے ہوں تو بڑا غضب ہے۔ اگلے عرائض کے نہ پہنچنے[۹] میں کچھ شک نہیں۔ جواب امر[۱۰] اُخری دفتر میں اُس کا پتا آج تک نہیں۔ بارے[۱۱]

کارپردازانِ ڈاک ڈاکو نہ بن جائیں اور میرے ان دونوں خطوں اور پارسلوں کو بہ احتیاط پہنچائیں۔ صرف عنایت کی گنجایش تو آپ جب پائیں کہ وہ خط اور پارسل پہنچ جائیں گے۔ ابھی تو آپ سے مجھ کو اُن کے نہ پہنچنے کا سوال ہے۔ کس واسطے کہ جب تک آپ مجھ کو اطلاع نہ دیں گے اُن کے نہ پہنچنے کی بھی خبر مجھ تک پہنچنی محال ہے۔ بہر حال یہ نیاز نامہ جس دن پہنچے اُس کے دوسرے دن جواب لکھیے۔ جیسا میں نے جلد لکھا ایسا ہی آپ بھی شتاب لکھیے۔

آپ کے عنایت نامے میں کوئی امر ایسا نہ تھا کہ جس کا جواب لکھا جائے یا اُس باب میں کچھ اور عرض کیا جائے۔

لوہارو کی روانگی کا خط جب آئے گا لوہارو کو بھیج دیا جائے گا۔ جناب منشی نواب جان صاحب اور جناب منشی اظہار حسین صاحب میں اور آپ میں اگر ربط بے تکلف ہو تو اُن دو صاحبوں کی خدمت میں میرا اسلامِ نیاز پہنچانے میں نہ توقف ہو:

تم سلامت رہو قیامت تک

پنجشنبہ ۲ دسمبر ۱۸۵۵ء

(۲)

قبلہ!

اس نامہ مختصر نے وہ کیا جو پارۂ ابر کشتِ خشک سے کرے، یعنی خط اور پارسل کا پہنچ جانا ایسا نہیں کہ اُس کی خبر پاکر بخت کی رسائی کا سپاس گزار نہ ہوں۔ یہ تو حضرت کو لکھ چکا ہوں کہ دوسرا پارسل اور خط معاً اُس پارسل اور اس خط کے ساتھ بھیجا گیا ہے اور ہرگز نہ توقع کا خیال اُسی پارسل پر ہے۔ کس واسطے کہ اُس خط میں حاکمِ اعظم کے نام کی عرضی ملفوف ہے۔ جانتا ہوں کہ محکمہ ایک، ڈاک ایک، دونوں پارسل اور دونوں لفافے ایک دن پہنچے ہوں گے مگر دل نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ نہ مانوں گا، جب تک کہ حضرت اُس سررشتے سے معلوم کر کر نہ لکھیں گے۔ اب آپ جانیے اور یہ دل سودا زدہ۔ میں اس کی سفارش کرنے والا اور اُس کے مدعا کا گزارش کرنے والا کون؟

ہاں، اتنی بات ہے کہ آپ لکھ سکتے ہیں بلکہ یہ بھی آپ مجھ پر حالی کر سکتے ہیں کہ نذر ولایت کی، ولایت کو روانہ ہوئی یا نہیں؟ میری جگر کاوی کی قدر دانی ہوئی یا نہیں؟ پیش گاہِ حکام سے موافق دستورِ قدیم کے خط کا امیدوار ہوں یا نہیں؟ اپنے حسنِ طبع کا شکر گزار ہوں یا نہیں؟ اس خط کا جواب جتنا جلد عنایت کیجیے گا، مجھ کو جلا لیجیے گا۔

لوہارو کا خط ایک معتمد کے ہاتھ بھیج دیا گیا۔

اوائل دسمبر ۱۸۵۵ء

(۳)

قبلہ حاجات!

عطوفت نامے کے آنے سے آپ کا بھی شکر گزار ہوا اور اپنے بخت و قسمت کو بھی آفریں کہی اور ڈاک کے کار پردازوں کا بھی احسان مانا۔ بارے، دونوں پارسل اور دونوں لفافے پہنچ گئے۔ شعر:

تا نہالِ دوستی کے بر دہد
حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

یہ کتاب جو مرسل الیہ کے مطالعے میں ہے، پھر بہ نسبت اُس دوسری کتاب کے، قسمت کی اچھی ہے، یعنی خود ملاحظہ فرمارہے ہیں اور اگر کہیں کچھ پوچھنا ہوگا تو یقین ہے کہ آپ سے پوچھیں گے۔ دوسری کتاب دیکھیے مجھ کو کیا دکھائے؟ جن کو اُس کے دیکھنے کا حکم ہوا ہے، وہ اہلِ علم و فضل میں سے ہیں لیکن یہ طرزِ تحریر، یہ میں نہیں کہتا کہ نادر ہے مگر بیگانہ و ناآشنا ہے۔ خدا کرے وہ جو اُس کی سیر پر مامور ہیں، ان اوراق کو بہ مشورت آپ کے دیکھا کریں اور کہیں کہیں آپ سے پوچھ لیا کریں۔ کیوں کر لکھوں؟ نہیں لکھ سکتا، تم سب کچھ جانتے ہو، جہاں گنجایش پاؤ گے، جیسا مناسب جانو گے، جو کچھ کر سکو گے، وہ کرو گے۔

لوہارو کو خط بہ کمال احتیاط روانہ ہو گیا۔ خاطرِ اقدس جمع رہے جواب طلب۔ زیادہ حدِ ادب۔

اواخر دسمبر ۱۸۵۵ء

(۴)

جنابِ عالی!

آج دو شنبہ، ۳ جنوری ۱۸۵۹ء کی ہے۔ پہر دن چڑھا ہوگا۔ ابر گھِر رہا ہے، ترشح ہو رہا ہے۔ ہوا سرد چل رہی ہے۔ پینے کو کچھ میسر نہیں، ناچار روٹی کھائی ہے:

افق ہا پر از ابرِ بہمن مہی
سفالینہ جامِ من از مے تہی

غم زدہ و دردمند بیٹھا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ تمھارا خط لایا۔ سرنامے کو دیکھ کر اس راہ سے کہ دستخطِ خاص کا لکھا ہوا ہے، بہت خوش ہوا۔ خط کو پڑھ کر اس رُو سے کہ حصولِ مدعا کے ذکر کے حاوی نہ تھا، افسردگی حاصل ہوئی:

ما خانہ رمیدگانِ ظلمیم
پیغامِ خوش از دیارِ ما نیست

اسی افسردگی میں جی چاہا کہ حضرت سے باتیں کروں۔ باآں کہ خط جواب طلب نہ تھا، جواب لکھنے لگا۔ پہلے تو یہ سنیے کہ آپ کے دوست کو آپ کا خط پہنچ گیا مگر وہ دو بار مجھ کو لکھ چکا ہے کہ میں جواب اُس کا نشانِ مرقومہ لفافہ کے مطابق ڈاک میں بھیج چکا ہوں، جواب الجواب کا منتظر ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ کمالِ یاس مقتضیِ استغنا ہے۔ پس اب اس سے زیادہ یاس کیا ہوگی کہ بہ امیدِ مرگ جیتا ہوں، اس راہ سے کچھ مستغنی ہوتا چلا ہوں۔ دو ڈھائی برس کی زندگی اور ہے، ہر طرح گزر جائے گی۔ جانتا ہوں کہ تم کو ہنسی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے؟ مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے؟ چاہیے الہام سمجھیے، چاہیے اوہام سمجھیے۔ میں بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے۔

قطعہ: من کہ باشم کہ جاوداں باشم
چوں نظیری نماند و طالب مرد
ور بگویند در کدامی سال
مرد غالب بگو کہ غالب مرد

اب بارہ سو چھہتر ہیں اور "غالب مرد" کے بارہ سو ستر ہیں۔ اِس عرصے میں جو کچھ مسرت پہنچنی ہو، پہنچ لے ورنہ پھر ہم کہاں۔

۳ جنوری ۱۸۵۹ء

(۵)

قبلہ!

کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست، جو غالب کہلاتا ہے، وہ کیا کھاتا پیتا ہے، اور کیوں کر جیتا ہے؟ پنشنِ قدیم اکیس مہینے سے بند اور میں سادہ دل فتوحِ جدید کا آرزومند۔ اُس پنشن کا احاطہ بہ جاب کے حکام پر مدار ہے۔ سو اُن کا یہ شیوہ اور یہ شعار ہے کہ نہ روپیہ دیتے ہیں، نہ جواب، نہ مہربانی کرتے ہیں، نہ عتاب۔ خیر اُس سے قطع نظر کی۔ اب سنیے اُدھر کی بات ۱۸۵۶ء سے بموجب تحریرِ وزیر عطیہ شاہی کا امیدوار ہوں۔ تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں، اگر گنہگار ہوں، گنہگار ٹھہرتا تو گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ میں بے گناہ ہوں، مقید اور مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں۔ پیش گاہِ گورنمنٹ کلکتے میں جب کوئی کاغذ بھجوایا ہے بہ قلم چیف سکرتر بہادر اُس کا جواب پایا ہے۔ اب کی بار دو کتابیں بھیجیں۔ ایک پیش کش گورمنٹ اور ایک نذرِ شاہی ہے۔ نہ اُس کے قبول کی اطلاع، نہ اُس کے ارسال سے آگاہی ہے جناب ولیم میور صاحب بہادر نے بھی عنایت نہ فرمائی۔ اُن کی بھی کوئی تحریر مجھ کو نہ آئی۔ یہ سب ایک طرف، اب خبریں ہیں مختلف۔ کہتے ہیں کہ چیف سکرتر بہادر لفٹنٹ گورنر ہوئے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ ان کی جگہ کون سے صاحبِ عالی شان سکرتر ہوئے؟ مشہور ہے کہ جناب ولیم میور صاحب بہادر صدر بورڈ میں تشریف لے گئے۔ یہ کوئی نہیں بتاتا کہ لفٹنٹ گورنری کے سکرتری کا کام کس کو دے گئے؟ آپ کا حال کوئی نہیں کہتا کہ آپ کہاں ہیں۔ ہاں از روئے قیاس جانتا ہوں کہ آپ اُسی منصب اور اُسی دفتر میں شاد و شادماں ہیں۔ جو اب لفٹنٹی کے سکرتر ہوئے ہوں گے، اُن سے علاقہ رہتا ہوگا۔ میور صاحب بہادر سے کاہے کو ملنا ہوتا ہوگا۔ لفٹنٹ گورنری اور صدر بورڈ، یہ دونوں محکمے الٰہ آباد آ گئے یا آئیں گے۔ بہ ہر حال اب آپ کیوں آگرے کو جائیں گے۔

نواب گورنر جنرل بہادر کی روانگی کی بھی خبر میں اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ بیس جنوری کو گئے۔ کوئی کہتا ہے کہ فروری میں کوچ فرمائیں گے۔ میں تو اُدھر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا، ہر طرح اپنی قسمت کو رو بیٹھا مگر یہ چاہتا ہوں کہ حقیقتِ واقعی پر کماحقہ اطلاع حاصل ہو تاکہ تسلیِ خاطر اور تسکینِ دل ہو۔ اگر ان مطالب کا جواب نہ مجمل بلکہ مفصل، نہ دیر بلکہ جلد مرحمت کیجیے گا تو گویا مجھ کو مول لے لیجیے گا۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں؟

۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء [۲]

(۶)

قبلہ حاجات!

قطعے میں جو حضرت نے الہام درج کیا ہے، وہ تو ایک لطیفہ بہ سبیلِ دعا ہے۔ مگر ہاں یہ کشفِ یقینی ہے اور مخدوم کی روشن دلی اور دوربینی ہے کہ جو سوالات میں نے تیس جنوری کو کیے اُن کے جواب تم نے ستائیس کو لکھ کر بھیج دیے۔ کیوں کر نہ کہوں روشن ضمیر ہو، اگرچہ جوان ہو مگر میرے پیر ہو۔ خلاصۂ تقریر یہ کہ تیسویں کو آخر روز میں نے خط ڈاک [۱] میں بھجوایا اور اکتیسویں کو ڈاک کا ہرکارہ پہر دن چڑھے تمھارا خط لایا۔ سوالات میں ایک سوال کا جواب باقی رہا۔ یعنی جنابِ [۱] ڈمنسٹن صاحب بہادر کی جگہ چیف سکرتر گورمنٹ کلکتہ کون ہوا؟ یہ دل میں پیچ و تاب باقی رہا۔

کتاب کے باب میں جو کچھ لکھا ہے، واقعی کہ [۹] یہ درست اور بجا ہے۔ جو کچھ واقع ہوا اُس کو مفیدِ مطالب عرض کروں لیکن اگر اجازت پاؤں تو اسی باب میں یہ عرض کروں کہ پیش گاہِ گورمنٹ میں بہ توسطِ چیف سکرتر بہادر سابق اور لفٹنٹ گورنر بہادر حال، دو مجلد پیش کیے ہیں۔ ایک نذر گورمنٹ اور دوسری کے واسطے یہ سوال کہ میری عزت بڑھائی جاوے اور یہ مجلد حضور حضرت شاہنشاہی میں بھجوائی جاوے [۱]۔ اچھا، نذر گورمنٹ میں تو مولوی اظہار حسین صاحب کا وہ اظہار بہ نذر سلطانی کے ارسال و عدمِ ارسال میں کیا دار و مدار ہے؟ دو نسخے جو اُن دونوں صاحبوں کے پیشکش مقرر ہوئے، اُن میں سے ایک صدر بورڈ کے حاکم اور ایک [۱۱] لفٹنٹ گورنر ہوئے۔

ردو قبول و نفرین و آفرین کچھ بھی نہیں۔ قیاس جو چاہوں سو کروں، یقین کچھ بھی نہیں۔

سترہ دسمبر ۱۸۵۶ء کا لکھا ہوا حکم وزیر اعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ اس قصیدے کے صلے اور جائزے کے واسطے کہ جو بہ توسط لارڈ ایلن برا، سائل نے بھجوایا ہے، خطاب اور خلعت اور پنسن کی تجویز ضرور ہے۔ جو حکم صادر ہوگا سائل کو بہ توسط گورمنٹ اس کی اطلاع دینی ضرور ہے۔ یہ حکم مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۸۵۶ء آخر جنوری ۱۸۵۷ء میں میں نے پایا۔ فروری، مارچ، اپریل خوشی اور توقع میں گزرے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں فلک نے یہ فتنہ اٹھایا۔ اب اس کتاب اور دوسرے قصیدے کے جا بہ جا نذر کرنے کا یہ سبب ہے کہ سائل محکمۂ ولایت کو یاد دہی کرتا ہے اور گورمنٹ سے تحسین طلب ہے۔ جب یہاں سے نوید تحسین نہیں، تو ولایت کو نذر کے ارسال کا بھی یقین نہیں۔ تحسین اور آفرین سے گزرا۔ نذر کے ولایت جانے کا یقین کیوں کر حاصل ہو۔ یہاں یہ تفرقہ اور یہ بے اتفاقی اور یہ دشواری اور یہ مشکل ہو؟ جی میں آتا ہے کہ نواب گورنر جنرل بہادر اور نواب لفٹنٹ گورنر بہادر اور حاکم صدر بورڈ کو ایک ایک عریضہ جدا جدا لکھوں۔ پھر یہ سوچتا ہوں کہ انگریزی لکھواؤں، فارسی لکھوں اور دونوں صورتوں میں کیا لکھوں؟؟

کل کا بھیجا ہوا خط اور یہ آج کا خط یقین تو ہے کہ دونوں معاً ایک وقت میں پہنچیں۔ وہ تو جواب طلب نہیں۔ اس کا جواب لکھیے اور بہت شتاب لکھیے۔

فروری ۱۸۵۹ء

(۷)

حضور!

پہلے خدا کا شکر، پھر آپ کا شکر بجا لاتا ہوں کہ آپ نے خط لکھا اور میرا حال پوچھا۔ یہ پرسش زخم تشنہ کا رکھتی ہے۔ اب رگِ قلم کی خونابہ فشانی دیکھو۔ گورنر اعظم نے میرٹھ میں دربار کا حکم دیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے سات جاگیرداروں میں سے جو تین بقیۃ السیف تھے، ان کو حکم دیا اور دربارِ عام میں سے سوائے میرے کوئی باقی نہ تھا یا چند مہاجن۔ مجھ کو حکم نہ پہنچا۔

جب میں نے استدعا کی تو جواب ملا کہ اب نہیں ہو سکتا۔ جب یہ سرزمین مخیم خیامِ گورنری ہوئی، میں اپنی عادتِ قدیم کے موافق خیمہ گاہ میں پہنچا۔ مولوی اظہار حسین خاں صاحب بہادر سے ملا۔ چیف سکرتر بہادر کو اطلاع کی۔ جواب آیا کہ "فرصت نہیں" میں سمجھا کہ اس وقت فرصت نہیں۔ دوسرے دن پھر گیا۔ میری اطلاع کے بعد حکم ہوا کہ: "ایامِ غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ اب گورمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟" اُس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خط اُن کے نام کا لکھ کر اُن کو بھیجا۔ مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اخلاص مظنہ محض ہے۔ امیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو تاکہ میری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا۔ اب ماہِ گذشتہ یعنی فروری میں پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے، پس یہ مقدمہ طے ہوا۔ دربار، خلعت، موقوف؛ پنسن مسدود؛ وجہ نامعلوم۔ "لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ وَلَا مُوَثِّرَ فِی الْوُجُوْدِ اِلَّا اللّٰہ۔"

۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والیِ رام پور، کہ میرے آشنائے قدیم ہیں، اس سال یعنی ۱۸۵۵ء میں میرے شاگرد ہوئے۔ ناظمؔ اُن کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اردو کی بھیجتے، میں اصلاح دے کر بھیج دیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ اُدھر سے آتا رہتا۔ قلعے کی تنخواہ جاری، انگریزی پنسن کھلا ہوا، اُن کے عطایا فتوح گنے جاتے تھے۔ جب وہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگی کا مدار اُن کے عطیے پر رہا۔ بعد فتحِ دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے اور میں عذر کرتا تھا۔ جب جنوری ۱۸۶۰ء میں گورمنٹ سے وہ جواب پایا کہ جو اوپر لکھ آیا ہوں تو میں آخر جنوری میں رام پور گیا۔ چھ سات ہفتے وہاں رہ کر دلی آیا۔ یہاں آپ کا خط محررہ آٹھ مارچ پایا۔ استفتا کا جواب بھیجا جاتا ہے۔

اواخر مارچ ۱۸۶۰ء

(۸)

حضرت پیرو مرشد!

اس سے آگے آپ کو لکھ چکا ہوں کہ منشی ممتاز علی خاں صاحب سے میری ملاقات ہے

اور وہ میرے دوست ہیں۔ یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ میں صاحبِ فراش ہوں۔ اُٹھنا بیٹھنا ناممکن ہے۔ خطوط لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ اِس حال میں دیباچہ کیا لکھوں؟ یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ تفتہ کو میں نے خط نہیں لکھا۔ اشعار اُن کے آئے۔ اصلاح دے دی۔ منشاے اصلاح جا بہ جا حاشیے پر لکھ دیا۔ کل جو عنایت نامہ آیا اُس میں بھی دیباچے کا اشارہ اور تفتہ کے خطوط کا حکم مندرج پایا۔ ناچار تحریرِ سابق کا اعادہ کرکے حکم بجا لایا۔

ناظرینِ "قاطعِ برہان" پر روشن ہوگا کہ "نامراد" اور "بے مراد" کا ذکر مبنی اس پر ہے کہ عبدالواسع ہانسوی نے "بے مراد" کو صحیح اور "نامراد" کو غلط لکھا ہے۔ میں لکھتا ہوں کہ ترکیبیں دونوں صحیح، لیکن "بے مراد" غنی کو کہتے ہیں اور "نامراد" محتاج کو۔ اب آپ کے نزدیک اگر ان دونوں کا محلِ استعمال ایک ہی ہو تو میرا مدعاے اصلی یعنی نامراد کی ترکیب کا علی الرغم عبدالواسع کے، صحیح ہونا فوت نہیں ہوتا۔ شعر مرزا صائب :

نامرادی زندگی بر خویش آساں کردنست
ترکِ جمعیت دل خود را بساماں کردنست

یہاں "نامرادی" اور "بے مرادی" کے معنی کیوں کر دے گی؟ اغنیا خواہی اہلِ توکل خواہی اہلِ تمول۔ متمولین پر کبھی کام آسان نہیں ہوتا بلکہ مفلسوں سے زیادہ اُن پر مشکلیں ہیں۔ رہے اہلِ توکل، اُن کی صفتیں اور ہیں۔ وہ اہل اللہ ہیں، مقربانِ بارگاہِ کبریا ہیں۔ دنیا پر لپشت پا مارے ہوئے ہیں۔ کام اُن پر کب مشکل تھا کہ انھوں نے اس کو آسان کر دیا؟ "نامراد" صیغہ مفرد ہے مساکین کا، اصنافِ مساکین کی شرح ضرور نہیں۔ سختی کشی و بے نوائی۔ تہی دستی و گدائی یہ اوصاف ہیں مساکین کے۔ ان صفات میں سے ایک صفت جس میں پائی جاوے وہ مسکین و نامراد۔ البتہ مساکین پر نہ ایک کام بلکہ سب کام آسان ہیں۔ نہ پاسِ ناموس و عزت، نہ حبِ جاہ و مکنت۔ نہ کسی کے مدعی، نہ کسی کے مدعا علیہ۔ دن رات میں دو بار روٹی ملی۔ بہت خوش۔ ایک بار ملی بہ ہر حال خوش۔ خدا کے واسطے مولانا صاحب کے شعر میں سے "نامراد" بہ معنی "کسے کہ ہیچ مراد نہ داشتہ

باشد" کیوں کر ثابت ہوتا ہے۔ مساکین کی زندگی جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں، آسان گزرتی ہے یا اغنیا کی؟ رہا مولوی معنوی علیہ الرحمۃ کا یہ شعر:

عاقلاں از بے مرادی ہائے خویش
باخبر گشتند از مولائے خویش

میں نے مثنوی کے ایک نسخے میں "عاقلاں" کی جگہ "عاشقاں" دیکھا ہے۔ بہ ہر صورت معنی یہ ہیں کہ عشاق یا عقلا بعد ریاضت شاقہ ماسوائے اللہ سے اعراض کر کے بے مراد اور بے مدعا ہو گئے۔ یہ پایۂ تسلیم و رضا ہے۔ البتہ اس رتبے کے آدمی کو خدا سے لگاؤ پیدا ہو گا:

باخبر گشتند از مولائے خویش

یہاں بھی "بے مرادی" سے "نامرادی" کے معنی نہیں لیے جاتے، مگر ہاں:

با مرادی مومناں از نیک و بد

دوسرا مصرع:

در بسکی بے مرادت داشتی

ان دونوں مصرعوں میں "نامراد" اور "بے مرادی" کے معنی میں خلط واقع ہو گیا ہے۔ خیر، "بے مراد" اور "نامراد" ایک سہی، ہر چند دوسرے مصرعِ مولوی میں "بے مراد" کے معنی بے حاجت کے درست ہوتے ہیں۔ مگر:

من کہ رندم، شیوۂ من نیست بحث

زیادہ تکرار کیوں کروں؟ معہذا مصرعِ اول کی کچھ توجیہ بھی نہیں کر سکتا۔ "نامراد" کی ترکیب کی صحت علی الرغم عبدالواسع ثابت ہو گئی۔ فثبت المدعا کمال یہ کہ مانند "ناچار" و "بے چارہ" اور "ناانصاف" اور "بے انصاف" کے "نامراد" اور "بے مراد" کا بھی موردِ استعمال مشترک رہا۔

والسلام
۱۸۶۲ء

(۹)

بندہ پرور!

اگر ایک بندۂ قدیم کہ عمر بھر فرمان پذیر رہا ہو، بڑھاپے میں ایک حکم بجا نہ لاوے تو مجرم نہیں ہو جاتا۔ مجموعۂ نثرِ اُردو کا انطباع، اگر میرے لکھے ہوئے دیباچے پر موقوف ہے تو اُس مجموعے کا چھپ جانا، بالفعل میں نہیں چاہتا، بلکہ چھپ جانا بالسّم چاہتا ہوں۔ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

رسم است کہ مالکانِ تحریر
آزاد کنند بندۂ پیر

آپ بھی اُسی گروہ یعنی مالکانِ تحریر میں سے ہیں۔ پھر اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتے؟

حضرت! وہ شعر بنگالی زبان کا لو۔ ۱۸۲۹ء میں ضیافتِ طبعِ احباب کے واسطے کلکتے سے ارمغان لایا ہوں۔ صحیح یوں ہے:

تم کہتے تھے رات میں آئیں گے سو آئے نہیں
قبلہ، بندہ رات بھر اس غم سے کچھ کھائے نہیں

والسلام بالوف الاحترام
۱۸۶۲ء

(۱۰)

قبلہ!

کل خط آیا۔ آج جواب لکھتا ہوں۔ پہلے آپ کا ایک فقرہ لکھ کر اتنا ہنسوں کہ پیٹ میں بل پڑ جائیں اور آنکھ سے آنسو نکل آئیں۔ فقرہ: "بڑھاپے میں کیا جاتیے کہاں کی حرارت مزاج میں آگئی ہے۔"

کیوں صاحب، جب تم نے بوڑھوں میں اپنا نام لکھوایا   تو مجھ کو لازم ہے کہ میں اپنے

کو اموات میں گنوں۔ تمھاری عمر میرے نزدیک پچاس سے متجاوز نہ ہوگی۔ اگر تجاوز کیا ہوگا تو دو تین برس سے وہ تجاوز زیادہ نہ ہوگا۔ بھائی ضیاء الدین خاں اور تم ہم عمر ہو۔ وہ کچھ کم پچاس، تم کچھ اوپر پچاس۔ ابھی تم دونوں صاحبوں کو ایک سو بیس برس میں سے ستر برس یا کچھ کم ستر برس باقی ہیں۔

"بنا بہ آب رسیدن" لازمی اور "بنا بہ آب رساندن" متعدی با اجماعِ جمہور اضداد میں سے ہے۔ ہم بہ معنی استحکام و ہم بہ معنی انہدام در صورتِ استحکام نیو کا گہرا کھودنا ملحوظ ہے، اور درصورت انہدام لطمۂ امواجِ سیلاب مدِ نظر ہے۔ آپ کے لکھے ہوئے دونوں شعر مفید معنی خرابی ہیں۔ صائب :

بنائے عمرِ مسیح و خضر بہ آب رسید

یعنی ویران ہوگئی، ڈھے گئی۔ حالانکہ یقیناً وہ جاودانی تھی :

ہنوز تشنۂ خون است تیغِ مژگانش

باآں کہ تیغِ مژہ نے دو زندۂ جاوید کو مارا مگر اب تک تشنۂ خوں ہے۔ "تشنہ" بہ معنی "مشتاق" اور "خون" بہ معنی "قتل" اور "بنائے عمر بہ آب رسیدن" استعارۂ ہلاک :

ہزار میکدہ را محتسب بہ آب رساند

بنائے صومعۂ شید ہمچناں برپاست

"بنائے میکدہ" غلط "ہزار میکدہ" صحیح ہے۔ کلیم کے دیوان میں موجود یعنی محتسب نے ہزار میکدے ڈھا دیے۔ دریا برد کر دیے صومعہ زرق دریا اب تک معمور اور موجود ہے۔ بہ معنی استحکام بنا نعمت خاں عالی کہتا ہے :

نیست محکم گر رسد بنیادِ دنیا تا بآب

چوں حباب ایں خانہ بے بنیاد می سازیم ما[۱]

صائب کہتا ہے :

چگونہ شمعِ تجلّی ز رشک تگدازد
رخِ تو خانۂ آئینہ را بہ آب رساند

بہ نون موقوف۔

غالبؔ کہتا ہے کہ اساتذہ کے کلام کے مشاہدے میں اگر توغل رہے تو ہزارہا بات نئی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے سات شعر امیر خسرو کی غزل پر لکھ کر ایک مطرب کو دیے۔ وہ مجلسوں میں گانے لگا۔ اکبرآباد و لکھنؤ تک مشہور ہوئے۔ وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے۔ مطلع:

از جسم بجاں نقاب تا کے
ایں گنج دریں خراب تا کے

ایک صاحب آگرے میں اور ایک صاحب لکھنؤ میں معترض ہوئے کہ: "گنج در خرابہ باید نہ در خراب" ہر چند کہا کہ "خرابہ" مزید علیہ اور اصل لغت "خراب" عربی الاصل، بہ معنی "ویران و ویرانہ" ہے، جس کی ہندی "اُجڑ" معترض مقر رہا۔ صائبؔ کے دیوان میں سے یہ مطلع نکلا:

بہ فکر دل نہ فتادی بہ ہیچ باب دریغ
بہ گنج راہ نہ بُردی دریں خراب دریغ

سنہ ۱۸۶۲ء

(۱۱)

قبلہ!

آج تیسرا دن ہے کہ میں "بنا بہ آب رسیدن" و "بہ آب رساندن" کی حقیقت بہ استنادِ اشعارِ اساتذہ لکھ کر بہ سبیل ڈاک بھیج چکا ہوں۔ آج اس وقت بھائی ضیاء الدین خاں صاحب آئے اور اس امرِ خاص میں کلام کے بادی ہوئے۔ میری تقریر سن کر کہنے لگے کہ وہ "آب در بنا رسیدن" و "آب در بنا رساندن" کے باب میں متردد ہیں کہ آیا یہ ترکیب جائز ہے یا نہیں؟ اب میں متنبہ ہوا کہ واقعی جو میں نے لکھا وہ سوال دیگر، جواب دیگر تھا۔ ستر برس کا پیر خرف ہوا اس

معروض معترض تلمذ۔ اگرچہ سوال کو غلط سمجھا لیکن جواب غلط نہیں لکھا۔ "رسیدن بنا بہ آب" ہم معنی "استحکام بنا" و ہم بہ معنی انہدام بنا"، درست۔

اب "آب در بنا رسیدن" و "رساندن" کی کیفیت سنیے۔ فقیر نے اساتذہ کے کلام میں کہیں یہ ترکیب نہیں دیکھی، پس میں اس کی صحت اور غلطی میں کلام نہیں کر سکتا۔ جانب غلطی میرے نزدیک راجح ہے۔ آپ جب تک کلامِ اہلِ زبان میں نہ دیکھ لیں، اُس کو جائز نہ جانیے گا مگر کلامِ سعدی و نظامی و حزیں اور اُن کے امثال و نظایر کا معتمد علیہ ہے۔ نہ آرزو اور واقف اور قتیل وغیرہم کا۔ میرا ایک مطلع ہے۔ شعر:

از تبسم بجاں نقاب تا کے
ایں گنج دریں خراب تا کے

ایک گروہ معارض ہوا کہ گنج کو "خرابہ" کہو، نہ "خراب" میں متحیر کہ یارب کس سے کہوں، "خرابہ" مزید علیہ "خراب" ہے مثل "ویران" و "ویرانہ" و "موج" و "موجہ" الحاق ہائے ہوز سے لغت دوسرا نہیں پیدا ہوا۔ بارے صائب کے دیوان میں ایک مطلع نظر آیا:

بہ فکر دل نہ فتادی بہ ہیچ باب، دریغ
بہ گنج راہ نہ بردی، دریں خراب، دریغ

یہ مطلع لکھ کر معترض صاحبوں کو بھیج دیا کہ غالب کو دردسر نہ دیجے۔ جو پوچھنا ہو وہ صائب سے پوچھ لیجے۔[۲]

۱۸۶۲ء[۳]

(۱۲)

قبلہ!

دیکھیے۔ ہم عارف ہیں۔ دو دو نامے سے پہلے جواب نامہ لکھتے ہیں۔ دن بھول گیا ہوں۔ غالب ہے کہ آج تیسرا دن ہو، صبح کو میں نے "آب در بنا رسیدن" کی بحث میں خلاصہ تحقیق لکھ کر ارسال

کیا، اُسی دن شام کو آپ کا خط آیا۔ بقیہ جواب اب لکھتا ہوں۔

"نقاب،" اُس شعر میں بہ معنی حائل ہے۔ "حول" کو وجہ و رُخ کی خصوصیت نہیں، دو چیزوں کے بیچ میں جو شے آجائے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ جو چیز ایک چیز کی مانعِ نظارہ ہو، وہ نقاب ہے۔ اُس شے نامرئی کے رُخ کا رُخ بہ مناسبتِ نقاب مقدر ہے اور یہ تقدیر جائز اور بلیغ ہے۔ حجاب کا یہاں اوپری یعنی بے محل اور نا ملائم ہونا بہ شرطِ عقلِ سلیم و طبعِ لطیف ظاہر ہے۔ "گِل" خاک بہ آب آمیختہ کو کہتے ہیں۔ وہ رخ آفتاب تک کہاں پہنچے؟ ہاں گرد و غبار میں آفتاب چھپ جاتا ہے۔ اُس کا استعمال از روے مجاز جائز ہے۔

"گنج در ویرانہ تا کے" یہ بہت لطیف بات ہے۔ یعنی افسوس کیا جاتا ہے، اُس گنج کے بیکار ہونے کا۔ گنج سے غرض یہ تو نہیں کہ جنگل میں مدفون رہے وہ تو یہ چاہتا ہے کہ مدفن سے نکلے اور صرف ہو اور لوگ اُس کے وجود سے تمتع پائیں۔

یہاں ایک اور دقیقہ ہے کہ اس شعر میں گنج مشبہ بہ اور روحِ انسانی مشبہ ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ روح کا تعلق جسم سے جاودانی نہیں۔ پس کیا قباحت ہے۔ اگر ایک غم زدہ، ستم زدہ قطعِ تعلقِ روح کا منتظر اور مشتاق ہو؟ مثلاً ایک میعادی محبوس حسرت مندانہ کہے کہ الٰہی وہ دن کب آئے گا کہ میں قید سے نجات پاؤں؟ کب تک سڑک کاٹوں؟ کب تک رنج اٹھاؤں؟ فاخر مکیں ایک شاعر تھا، شجاع الدولہ و آصف الدولہ کے عہد میں۔ اُس نے سعدی و نظامی و حزیں کے اشعار کو اصلاحیں دی ہیں۔ جب ایک ہندستانی بے علم تنک مایہ اساتذۂ نامیِ عجم کے کلام کو اصلاح دے، اگر ایک عالمِ خراسانی نے ایک ہندی کے مطلع میں تصرف کیا تو کیا قباحت لازم آئی؟ خدا کا شکر کہ مجھ کو ستر برس کی عمر میں پچاس برس کی مشق کے بعد استاد میسر آیا۔

سنہ ۱۸۶۲ء

(۱۳)

پیر و مرشد!

"سہلِ ممتنع" میں کسرۂ لام توصیفی ہے۔ سہل موصوف اور ممتنع صفت۔ اگرچہ بہ حسبِ ضرورتِ وزن کسرۂ لام مشبع ہو سکتا ہے لیکن مخلِ فصاحت ہے اور لام موقوف تو خود سراسر قباحت ہے۔ سہلِ ممتنع اُس نظم و نثر کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اُس کا جواب نہ ہو سکے۔ بالجملہ سہلِ ممتنع کمالِ حسنِ کلام ہے اور بلاغت کی نہایت ہے۔ اور ممتنع درحقیقت ممتنع النظیر ہے۔ شیخ سعدی کے بیشتر فقرے اس صفت پر مشتمل ہیں اور رشید وطواط وغیرہ شعرائے سلف نظم میں اس شیوے کی روایت منظور رکھتے ہیں۔ خود ستائی ہوتی ہے۔ سخن فہم اگر غور کرے گا تو فقیر کی نظم و نثر میں سہلِ ممتنع اکثر پائے گا:

ہے سہلِ ممتنع یہ کلام ادق مرا
برسوں پڑھے تو یاد نہ ہووے سبق مرا

یہ مصرع حیرت آور ہے۔ کلامِ ادق، سہلِ ممتنع کے منافی ہے۔ پھر یاد نہ ہونا اور حافظے پر نہ چڑھ جانا ہرگز سہلِ ممتنع کی صفت نہیں ہو سکتی۔ کلامِ ادق جس کا حفظ دشوار ہو۔ شاید کوئی قسم اقسامِ کلام میں سے ہو۔ ہاں کلامِ ادق کلامِ مغلق کو کہتے ہیں، سو کلامِ مغلق اور کلامِ سہلِ ممتنع ضد یک دیگر ہے۔ مغلق اور ادق سہلِ ممتنع اور سہلِ ممتنع مغلق اور ادق کیوں کر ہو سکے گا۔ اور حافظے میں محفوظ رہنا کلامِ مغلق اور ادق کی صفت کیوں کر پڑے گی؟ ہاں کلامِ مغلق عسیر الفہم ہو گا پڑھا نہ جائے گا۔ معنی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ سہلِ ممتنع کی صفت وہ تھی جو فقیر اوپر لکھ آیا۔ اس شعر سے مجھ کو کچھ علاقہ نہیں۔

"آب در بنا رسیدن" بہ معنی "خراب بنیاد" قیاسی ہے۔ اساتذہ کے کلام میں، میں نے نہیں دیکھا۔ اگر آیا ہو تو درست ہے۔ ہاں "بہ آب رسانیدن بنا" کہ بظاہر "آب در بنا رسیدن" کا متعدی منہ ہے۔ بلغا کے کلام میں آیا ہے لیکن اضداد میں سے ہے۔ ہم بہ معنی "ویرانی بنا" مستعمل اور ہم بہ معنی استحکام بنا مستعمل۔ اگر اس کا لازمی ڈھونڈ لیے تو رسیدن بنا بہ آب" ہے نہ رسیدن آب در بنا" جیسا کہ نعمت خان علی ہاہے:

نیست محکم گر رسد بنیادِ دنیا تا بہ آب
چوں حباب ایں خانۂ بے بنیاد می سازیم ما

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "رسیدن بنا تا بآب" موجب استحکام ہے اور شاعر باوجود دلیلِ استحکام بنا کو نا استوار جانتا ہے۔

صائب کہتا ہے :

چگونہ شمع تجلی ز رشک نہ گدازد
رخِ تو خانۂ آئینہ را بآب رساند

جان محمد جانؔ قدسی :

بگوشِ عطایش رساند ایں خطاب
کہ بنیادِ کاں را رساند بآب

یہ دونوں شعر مفید معنی ویرانی ہیں۔ قصہ مختصر "بآب رسیدن بنا خرابی۔ خانہ دہ آب رساندن" متعدی آں و رسیدن آب در بنا" نامسموع۔ میں ابھی بیمار ہوں اور بیمار کے واسطے انجام کو غسلِ صحت ہے یا غسلِ میت۔ والسلام۔

۱۸۶۲ء

(۱۴)

در نومیدی بسے امید است
پایانِ شبِ سیہ سپید است

قبلہ : آج آپ کی خوشی اور خوشنودی کے واسطے اپنی روداد لکھتا ہوں۔

توطیہ : ۱۸۶۶ء میں لارڈ صاحب بہادر نے میرٹھ میں دربار کیا۔ صاحب کمشنر بہادر دلی اہالیِ دہلی کو ساتھ لے گئے۔ میں نے کہا: "میں بھی چلوں۔" فرمایا کہ "نہیں"، جب لشکر میرٹھ سے دلی آیا۔ میں موافق اپنے دستور کے، روزِ ورودِ لشکر خیم میں گیا۔ میر منشی صاحب سے ملا، اُن کے خیمے

میں سے اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر بہادر کے پاس بھیجا۔ جواب آیا کہ: "تم غدر کے دنوں میں بادشاہ باغی کی خوشامد کیا کرتے تھے۔ اب گورمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں۔" میں گدائے مبرم اس حکم پر متورع نہ ہوا۔ جب لارڈ صاحب بہادر کلکتے پہنچے۔ میں نے قصیدہ حسبِ معمولِ قدیم بھیج دیا۔ مع اس حکم کے واپس آیا کہ: "اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔" میں مایوسِ مطلق ہو کر بیٹھ رہا اور حکامِ شہر سے ملنا ترک کیا۔

واقعۂ اواخر ماہِ گذشتہ یعنی فروری ۱۸۶۳ء میں نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب دلی آئے۔ اہالیِ شہر صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر و صاحب کمشنر بہادر کے پاس دوڑے اور اپنے نام لکھوائے۔ میں تو بیگانۂ محض اور مطرودِ حکام تھا، جگہ سے نہ ہلا، کسی سے نہ ملا۔ دربار ہوا۔ ہر ایک کامگار ہوا۔ شنبہ آٹھ فروری کو آزادانہ منشی من پھول سنگھ صاحب کے خیمے میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر بہادر پاس بھیجا۔ بلالیا۔ مہربان پاکر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی۔ وہ بھی حاصل ہوئی۔ وہ حاکم جلیل القدر کی وہ عنایتیں دیکھیں، جو میرے تصور میں بھی نہ تھیں۔

جملۂ معترضہ: میر منشی لفٹنٹ گورنر سے سابقہ تعارف نہ تھا۔ وہ بہ طریقِ حسنِ طلب میرے خواہاں ہوئے تو میں گیا۔ جب حکام بہ مجرد استدعا مجھ سے بے تکلف ملے تو میں قیاس کر سکتا ہوں کہ میر منشی کی طرف سے حسنِ طلب بہ ایمائے حکام ہوگا۔ وَ لِلرَّحمٰنِ اَلْطَافٌ خَفِیَّۃٌ۔

بقیہ روداد یہ ہے کہ دوشنبہ دوم مارچ کو سوادِ شہر مخیمِ خیامِ گورنری ہوا۔ آخر روز، میں اپنے شفیقِ قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ: "تمھارا دربار و خلعت بدستور بہ حال و برقرار ہے۔" متحیرانہ میں نے پوچھا کہ حضرت کیوں کر؟ حضرت نے کہا کہ: "حاکم حال نے ولایت سے آکر تمھارے علاقے کے سب کاغذ انگریزی دفاتر کے دیکھے اور بہ اجلاسِ کونسل حکم لکھوایا کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت بہ دستور بہ حال و برقرار رہے۔" میں نے پوچھا کہ حضرت یہ امر کس اصل پر متفرع ہوا؟ فرمایا کہ: "ہم کو کچھ معلوم نہیں۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ حکم دفتر میں لکھوا کر چودہ دن یا پندرہ دن ادھر کو روانہ ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ سبحان اللہ۔

کارسازِ ما بفکر کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

سہ شنبہ تین مارچ کو بارہ بجے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مجھ کو بلایا۔ خلعت عطا کیا اور فرمایا کہ: لارڈ صاحب بہادر کے ہاں کا دربار اور خلعت بھی بہ حال ہے۔ انبالے جاؤ گے تو دربار اور خلعت پاؤ گے۔" عرض کیا گیا کہ حضور کے قدم دیکھے، خلعت پایا۔ لارڈ صاحب بہادر کا حکم سن لیا، میں نہال ہو گیا۔ اب انبالے کہاں جاؤں؟ جیتا رہا تو اور دربار میں کامیاب ہو رہوں گا:

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد
ہر چہ گیرید، مختصر گیرید

اواخر مارچ ۱۸۶۳ء[۴]

(۱۵)

جنابِ عالی!

کل میرے شفیقِ مکرم منشی نواب جان کلبۂ احزان میں تشریف لائے، آپ کا سلام کہا۔ معلوم ہوا کہ خواجہ صدر الدین صاحب لشکر کے ساتھ گئے ہیں اور آپ یہیں ہیں۔ اس فصل میں کہ ابھی سے رات دن آگ برستی ہے، اچھا ہوا کہ زحمتِ سفر نہ کھینچی۔

اجی حضرت یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں؟ رقعے جمع کیے اور نہ چھپوائے۔ فی الحال پنجاب احاطے میں اُن کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ اُن سے کہیں، مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں، وہ سب یا اُن سب کی نقل بہ طریقِ پارسل آپ مجھ کو بھیج دیں۔ جی یوں چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب وہی پارسل ہو[۵]۔

تم سلامت رہو قیامت تک

۱۸۶۳ء[۶]

(۱۶)

جناب عالی!

ایک شعر استاد کا مدت سے تحویلِ حافظہ چلا آتا ہے:

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

میں نے ازراہِ تصرف اس شعر کی صورت بدل ڈالی

ان دل فریبیوں سے نہ کیوں اس پہ پیار آئے
روٹھا جو بے گناہ تو بے عذر من گیا

تم اخوان الصفا میں سے ہو۔ تمہاری آزردگی اوروں کی مہربانی سے خوشتر ہے۔

ہاں حضرت کہیے، منشی ممتاز علی خاں کی سعی بھی مشکور ہوگی۔ وہ مجموعۂ اردو چھپے گا یا چھپا ہی رہے گا۔ احباب اس کے طالب ہیں بلکہ بعض نے طلب کو بہ سرحدِ تقاضا پہنچا دیا ہے۔

میرا حال سنیے۔ لارڈ کیننگ صاحب نے بعد فتح جدید دہلی میرا قصیدہ مجھ کو واپس بھیج دیا۔ صاحب سکرتر نے مجھ سے کہہ دیا کہ تم ایامِ غدر میں بادشاہِ باغی کے مصاحب رہے۔ اب گورمنٹ کو تم سے راہ و رسم آمیزش منظور نہیں۔ ناچار چپ ہو رہا۔ بے حیا ہوں۔ لارڈ الگن صاحب بہادر کے وقت میں پھر موافق معمول، قصیدہ شملے کے مقامات پر بھیج دیا۔ خلافِ تصور بہ حسبِ دستورِ قدیم چیف سکرتر بہادر کا خط آگیا۔ وہی افشانی کاغذ، وہی القاب، وہی تحسین کلام، وہی اظہارِ خوشنودی۔ اب جو یہ امیر کبیر وانسرائے قلمرو ہند ہوئے۔ میں خدمتِ دیرینہ بجا لایا۔ تیرہ فروری ۶۴ء حال کو قصیدہ مع عرضداشت ارسال کیا۔ آج تک کہ سات مارچ کی ہے، جواب نہیں پایا۔ باوجود سوابق معرفت رسم قدیم کا عمل میں نہ آنا خاطر آشوب کیوں نہ ہو؟

بیدل نیم ہنوز بہ بینم چہ میشود

۸ مارچ ۱۸۶۴ء

(۱۷)

قبلہ!

میرا ایک شعر ہے:

خود پیشِ خود کفیلِ گرفتاری منست
ہر دم بہ پرسشِ دلِ مایوس میرسد

یہ معاملہ میرا اور آپ کا ہے۔ خارج سے مسموع ہوا کہ میں نے جو اغلاط "برہانِ قاطع" کے نکال کر ایک نسخہ موسوم بہ "قاطع برہان" لکھا ہے اور ایک مجلد اُس کا آپ کو بھی بھیج دیا ہے۔ آپ اُس کی تردید میں کوئی رسالہ لکھ رہے ہیں۔ اگرچہ باور نہیں آیا لیکن عجب آیا۔ ایک مولوی نجف علی صاحب ہیں۔ باوجود فضیلتِ علم عربی، فارسی دانی میں اُن کا نظیر نہیں۔ وہ جو ایک شخص مجہول الحال نے اہلِ دہلی میں سے میرے کلام کی تردید میں کتاب تصنیف کی ہے۔ مسمی بہ "محرقِ قاطعِ برہان" انھوں نے اُس کی توہین اور مسود کی تفضیح میں دو جزو کا ایک نسخہ مختصر لکھا ہے اور ایک طالب علم مسمی بہ عبدالکریم نے سعادت علی مؤلفِ "محرقِ قاطع" سے سوالات کیے ہیں اور ایک محضر اُس نے بہ فتوائے علمائے شہر مرتب کیا ہے۔ ایک میرے دوست نے بہ صرفِ زر اُس کو چھپوایا ہے۔ ایک نسخہ اُس کا آج اسی خط کے ساتھ بہ سبیلِ پارسل ارسال کیا ہے۔

اِس شہر میں ایک میلا ہوتا ہے پھول والوں کا میلا کہلاتا ہے۔ بھادوں کے مہینے میں ہوا کرتا ہے۔ امرائے شہر سے لے کر اہل حرفہ تک قطب صاحب جاتے ہیں۔ دو تین ہفتے تک وہیں رہتے ہیں۔ مسلمین اور ہنود دونوں فرقے کی شہر میں دکانیں بند پڑی رہتی ہیں۔ بھائی ضیاالدین خاں اور شہاب الدین خاں اور میرے دونوں لڑکے سب قطب گئے ہوئے ہیں۔ اب دیوان خانے میں ایک میں ہوں اور ایک داروغہ اور ایک بیمار خدمت گار۔ بھائی صاحب جب وہاں سے آئیں گے تو مقرر آپ کو خط لکھیں گے۔ بڑے پہاڑ سے اترے چھوٹے پہاڑ پر چڑھ گئے۔ عدم تحریر کی وجہ یہ ہے۔

اکتوبر، نومبر ۱۸۶۳ء

(۱۸)

میں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں
یعنی سبقِ شوق مکرّر نہ ہوا تھا

پیرومرشد! خفا نہیں ہوا کرتے۔ یوں سنا، مجھے باور نہ آیا۔ یہاں تک تو میں موردِ عتاب نہیں ہو سکتا۔ جھگڑا استعجاب پر ہے۔ محلِ استعجاب وہ ہے کہ آپ کا دوست کہتا ہے کہ میر منشی نواب لفٹنٹ گورنر بہادر میرے شاگرد ہیں اور وہ "قاطعِ برہان" کا جواب لکھ رہے ہیں۔ اولیا کا یہ حال ہے۔ وائے بر حال ہم اشقیا کے۔ یہ حکایت ہے شکایت نہیں ہے! میں دنیاداری کے لباس میں فقیری کر رہا ہوں، لیکن فقیر آزاد ہوں، نہ شیاد و کیاد۔

ستر برس کی عمر ہے۔ بے مبالغہ کہتا ہوں، ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے۔ زمرۂ خواص میں سے، عوام کا شمار نہیں۔ دو مخلص صادق الولا دیکھے۔ ایک مولوی سراج الدین رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِ، دوسرا منشی غلام غوث سَلَّمَہُ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ، لیکن وہ مرحوم حسنِ صورت نہیں رکھتا تھا اور خلوص اخلاص اُس کا خاص میرے ساتھ تھا۔ اللہ اللہ دوسرا دوست خیر خواہِ خلق، حسن و جمال چشمِ بد دُور، کمال مہر و وفا، صدق و صفا نورٌ علیٰ نُور۔ میں آدمی نہیں ہوں آدم شناس ہوں:

نگہم نقب ہمی زد بہ نہان خانۂ دل
مژدہ باد اہلِ ریا را کہ زمیدان رفتم

غایت مہر و محبت، جس کے ملکہ کا تم کو مالک سمجھا ہوں، وہ بہ نسبت اپنے اس قدر یقین کرتا ہوں کہ پہلے دو آدمیوں کو اپنے بعد اپنا ماتم دار سمجھا ہوا تھا، ایک کو تو میں رو لیا۔ اب اللہ آمین کا ایک دوست رہ گیا۔ دعائیں مانگتا ہوں کہ خدایا اُس کا داغ نہ مجھے دکھائیو۔ میں اُس کے سامنے مروں، میاں میں تمھارا عاشقِ صادق ہوں۔

بھائی ابھی قطب سے نہیں آئے۔ "دافعِ ہذیان" کے دو مجلد اور بھیج دوں گا۔

اکتوبر و نومبر ۱۸۶۴ء

(۱۹)

پیر و مرشد!

کوئی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہیں کلکتے میں، مولوی عبدالغفور خاں اُن کا نام اور نساخ اُن کا تخلص ہے۔ میری اُن کی ملاقات نہیں — انھوں نے اپنا دیوان چھاپے کا موسوم بہ "دفترِ بے مثال" مجھ کو بھیجا۔ اُس کی رسید میں یہ خط میں نے اُن کو لکھا۔ چوں کہ یہ خط مجموعۂ نثرِ اردو کے لائق ہے، آپ کے پاس ارسال کرتا ہوں۔

اور ہاں حضرت، وہ مجموعہ چھَپے گا بالفتح، یا چھُپے گا بالضم۔ چھپ چکا ہو تو حق التصنیف کی جتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت اقتضا کرے، فقیر کو بھیجیے۔ والسلام۔

۱۸۶۴ء

(۲۰)

قبلہ!

آپ کا خط پہلا آیا اور میں اُس کا جواب لکھنا بھول گیا۔ کل دوسرا خط آیا مگر شام کو۔ اُسی وقت پڑھ لیا۔ آدمی کے حوالے کیا۔ اُس نے آج صبح دم مجھ کو دیا۔ میں جواب لکھ رہا ہوں، بعد اختتامِ تحریر معنون کر کے ڈاک میں بھجوا دوں گا۔

والیِ رام پور کو خدا سلامت رکھے۔ اپریل، مئی اِن دونوں مہینوں کا روپیہ موافق دستورِ قدیم آیا۔ جون ماہِ گذشتہ کا روپیہ خدا چاہے تو آجائے۔ آج جمعہ سات جولائی ہے۔ معمول یہ ہے کہ دسویں بارھویں کو رئیس کا خط مع ہنڈوی آیا کرتا ہے۔ میں نے قصیدۂ تہنیتِ جلوس بھیجا۔ اُس کا جواب آگیا۔

اب میں نظم و نثر کا مسودہ نہیں رکھتا۔ دل اس فن سے نفور ہے۔ دو ایک دوستوں کے پاس اُس کی نقل ہے۔ اُن کو اس وقت کہلا بھیجا ہے۔ اگر آج وہ آگیا کل، اور اگر کل آیا پرسوں بھیج دوں گا۔ بھائی امین الدین خاں صاحب کے اصرار سے خسرو کی غزل پر ایک غزل لکھی ہے۔ علاء الدین خاں

نے اُس کی نقل اُن کو بھیج دی۔ میں دیوان پر نہیں چڑھاتا۔ مسودہ بھیجتا ہوں۔ تقدیم و تاخیر ہندسوں کے مطابق ملحوظ رہے۔ گرمی کی شدت سے حواس بجا نہیں۔ معہذا امراضِ جسمانی و آلامِ روحانی۔

قصیدہ[2]

تجلی کہ ز موسیٰ ربود ہوش بہ طور
بہ شکلِ کلب علی خاں دگر نمود ظہور
خجستہ سرورِ سلطاں شکوہ را نازم
کہ رشک بر کلہ اش دارد افسرِ فغفور
ہوائے لطفِ وی از جانِ خور برد سوزش
نگاہِ قہرِ وی از روئے مہ رباید نور
دم نگارشِ وصفِ کلامِ شیرینش
چو خیلِ مور دود بر ورق حروف سطور
فضائے رزم گہش شاہراہِ قہر و غضب
بساطِ بزم گہش کارگاہِ سور و سرور
بہ خوانِ شرع، بہین ہم نوالۂ شبلی
بہ بزمِ عشق، بہین ہم پیالۂ منصور
ز روئے رابطۂ حسن، ماہتاب جمال
بہ حسبِ ضابطۂ جاہ، آفتاب ظہور
بہ حکمِ مرتبہ، او حاکم و فلک محکوم
ز راہِ قاعدہ، شرع امرست او مامور

چو آبِ سیل روانی کہ ایستد بہ مغاک
بود ہمیشہ بہ فنجانِ وے شرابِ طہور
زہے وزیر کہ نبھے شہریار دانا دل
تو شاہِ کشورِ حسن و خرد ترا دستور
بنائے منظرِ جاہِ ترا، زحل معمار
ثوابت کُرۂ چرخِ ہشتمی مزدور
ثناگرِ تو سکندر بہ بارِ جلوے جلال
قفا خورِ تو ارسطو، بہ درسگاہِ شعور

ق

برائے بزمِ نشاطِ تو شمع چوں ریزند
نہ پیہ گاوِ بکار آورند و نے کافور
ز فیضِ نسبتِ خُلقِ تو عنبرِ سارا
بجائے موم بر آید زخانۂ زنبور

ق

بدیں خرام و بدیں قامت و بدیں رفتار
زبہرِ فاتحہ آئی اگر بسوئے قبور
جہانِ جانی و جانِ جہاں، عجب نبود
کہ از ورودِ تو ہر مردہ رقصد اندر گور
بہ پیش گاہِ تو زانو ہمے زند انصاف
کہ اے برحم و کرم در جہانیاں مشہور

در انتقام کشی شیوۂ کرم مگذار
برآر کامِ دلِ بد سگال از ساطور
توئیَ بہ فضل فزایندۂ عروجِ علوم
توئیَ بہ علم کشایندۂ عقودِ صدور
صریرِ خامۂ من بیں کہ می رباید دل
چنان کہ از لبِ داوُد استماعِ زبور
سوادِ صفحۂ من بین و تابشِ معنی
عیاں چو شمع فروزندہ در شبِ دیجور
امیرِ زندہ دل آں والیِ ولایتِ نظم
بہ گنج خانۂ گنجہ، نظامیش گنجور
غروبِ مہر و طلوعِ مہ دو ہفتہ بود
رسیدنِ تو بدیں اوج بعدِ آں مغفور
چو او بزیرِ زمیں رفت وآں ولایت یافت
تو باش والیِ روے زمیں قرونُ و دہور
بہ انجمن نرسیدم ز نا توانائیَ
ولے بہ عرضِ ثنا و دعا نیَم معذور
بہ خاک پاے تو گر دست گاہ داشتمے
نبودمے بہ غمِ دوریٔ درِ تو صبور
من آں کسم کہ ز افراطِ ورزشِ اخلاص
بہ غیبت ست مرا دعویِ دوامِ حضور

توئی رحیم دل و من سقیم، دوری به
مباد رنجه شوی از نظارهٔ رنجور
کنی بدست تهی بزر کیسهٔ دلاک
دمے به سینه بسے تنگ ترز دیدهٔ مور
کمی زما و کرم از شما، بلاتشبیه
ز کردگار بود رحمت و ز بنده قصور
نظر به خستگی و پیری و تهی دستی
قبول کردن تسلیم من خوش ست از دور
شعار غالب آزاده جز دعا نبود
که باد سعی دعاگوی در دعا مشکور
بدهر تا بود آئیں که در نوا آرند
رباب و بربط و قانون و نے به محفل سور
به بزم عیش تو ناهید باد زمزمه سنج
نسیم عطر فروش از شمیم طرهٔ حور
محب ز لطف تو بالنده چوں نوا از ساز
عدو ز بیم تو نالنده چوں خر طنبور

غزل

هم "انا الله" خواں درختے را بگفتار آورد
هم "انا الحق" گوے مردے را سر دار آورد
اے که پنداری که ناچار ست گردوں در روش
نیست ناچار آن که گردوں را برفتار آورد

نکتۂ داریم و با یاراں نمی گوییم فاشش
طالبِ دیدار باید تابِ دیدار آورد
آں کند قطعِ بیاباں، ایں شگافد مغزِ کوہ
عشق ہر یک را بطرزِ خاص در کار آورد
جذبِ شوقش بیں کہ در ہنگامِ برگشتن زدیر
در قفائے خویشتن بت را بر رفتار آورد
دانہ ہا چوں ریزد از تسبیح، تاری بیش نیست
ایں مشعبد دہرگاہ از سبحہ زنار آورد
آہِ ما را ہیں کہ ناورد از دلِ سختش خبر
باد را نازم کہ ابر از سوئے کہسار آورد
نزدِ ما حیف ست، گو نزدِ زلیخا میل باش
جذبۂ کز چاہ یوسف را بہ بازار آورد
ہر انارے را کہ افشاریم از وے خوں چکد
ہر نہالے را کہ بنشانیم دل بار آورد
نیست چوں در منطقش جز ذکرِ شاہد حرف و صوت
شاہدے باید کہ غالب را بگفتار آورد

جمعہ ۷ جولائی ۱۸۶۵ء

(۲۱)

بندۂ گنہگار شرمسار عرض کرتا ہے کہ پرسوں غازی آباد کا اُٹھا ہوا گیارہ بجے اپنے گھر پر مثلِ بلائے ناگہانی نازل ہوا ہوں:

باید کہ کنم ہزار نفریں بر خویش
اما بہ زبانِ جادۂ راہِ وطن

خواجہ صاحب کی رحلت کا اندوہ بہ قدرِ قرب و قرابت آپ کو اور بہ اندازۂ مہر و محبت مجھ کو۔ وہ مغفور میرا قدر دان اور مجھ پر مہربان تھا۔ حق تعالیٰ اُس کو اعلیٰ علیین میں بہ سبیلِ دوام قیام دے۔

رام پور ہی میں تھا کہ "اودھ اخبار" میں حضرت کی غزل نظر فروز ہوئی۔ کیا کہنا ہے! ابداع اِس کو کہتے ہیں، جدّتِ طرز اس کا نام ہے۔ جو ڈھنگ تازہ نوایانِ ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم بروے کار لائے۔ خدا تم کو سلامت رکھے اور میرے اور دکھنی جامعِ "برہانِ قاطع" کے جھگڑے میں بہ خلاف اور فارسی دانوں کے، توفیقِ انصاف عطا کرے۔

لو اب اِس خط کا جواب جلد بھیجو تا یہ طریقہ مسلسل ہو جائے۔[۳]

۱۰ جنوری ۱۸۶۶ء[۴]

(۲۲)

مولانا!

بندگی۔ آج صبح کے وقت شوقِ دیدار میں بے اختیار، نہ ریل، نہ ڈاک، توسنِ ہمت پر سوار چل دیا ہوں جانتا ہوں کہ تم تک پہنچ جاؤں گا۔ مگر یہ نہیں جانتا کہ کہاں پہنچوں گا اور کب پہنچوں گا۔ اتنا بے خود ہوں کہ جب تک تم اطلاع نہ دو گے میں نہ جانوں گا کہ کہاں پہنچا اور کب پہنچا۔

آپ کا پہلا خط رام پور سے دلّی آیا۔ میں راہ میں تھا۔ پھر دلّی سے خط رام پور پہنچا۔ میں وہاں بھی نہ تھا۔ خط دلّی روانہ ہوا۔ اب کئی دن ہوئے کہ میں نے ڈاک سے پایا۔ اُس حال میں کہ میں بیمار تھا، معہذا جاڑے کی شدت، مہاوٹ کا مہینہ، دھوپ کا پتا نہیں، پردے چھٹے ہوئے، نشیمن تاریک۔ آج نیرِ اعظم کی صورت نظر آئی۔ دھوپ میں بیٹھا ہوں، خط لکھ رہا ہوں۔ حیران ہوں کہ کیا لکھوں؟ اس خط کے مضامینِ اندوہ فزا نے دل کو بڑا مضمحل کر دیا۔ جانتا تھا کہ خواجہ صاحب مغفور تمھارے ماموں ہیں مگر اُن کے اور تمھارے معاملاتِ مہر و ولا، جیسے کہ

تمھاری تحریر سے اب معلوم ہوئے، میرے دل نشین نہ تھے۔ ایسے محب کا فراق اور پھر بہ قیدِ دوام کیوں کر جاں گزا نہ ہو۔ حق تعالیٰ اُن کو بخشے اور تم کو صبر دے۔

حضرت! میں بھی اب چراغِ سحری ہوں۔ رجب ۱۲۸۲ھ حال کی آٹھویں تاریخ سے اکہتّرواں سال شروع ہو گیا۔ طاقت سلب، حواس مفقود، امراض مستولی۔ بہ قول نظامیؔ:

یکے مردہ شخصم بمردی رواں

آج میں اور بھی باتیں کرتا مگر میرا خاص تراش آ گیا۔ مہینا بھر سے حجامت نہیں بنوائی۔ خط لپیٹ کر ڈاک میں بھیجتا ہوں اور خط بنواتا ہوں۔

جنوری ۱۸۶۶ء

(۲۳)

قبلہ!

آپ بے شک ولیِ صاحبِ کرامت ہیں۔ کم و بیش ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ ایک امر جدید مقتضی اس کا ہوا کہ آپ کو اُس کی اطلاع دوں۔ خانۂ کاہلی خراب، آج لکھوں، کل لکھوں، اب کون لکھے، کل صبح لکھوں گا۔ صبح ہوئی غالبؔ اس وقت نہ لکھ — سہ پہر کو لکھیو۔

آج دوشنبہ ۲۳ جولائی کے بارہ پر دو بجے ہرکارے نے آپ کا خط دیا۔ پلنگ پر پڑے پڑے خط پڑھا اور اُسی طرح جواب لکھا۔ اگرچہ ڈاک کا وقت نہ رہا تھا مگر بھجوا دیا۔ کل روانہ ہو رہے گا۔ آپ کو معلوم رہے کہ منشی حبیب اللہ ذکاؔ اور نواب مصطفیٰ خاں حسرتیؔ کو کبھی اردو خط نہیں لکھا۔ ہاں ذکاؔ کو غزل اصلاحی کے ہر شعر کے تحت میں منشاے اصلاح سے آگہی دی جاتی ہے۔ نواب صاحب کو یوں لکھا جاتا ہے: "کہار آیا، خط لایا، آم پہنچے۔ کچھ بانٹے، کچھ کھائے۔ بچوں کو دعا۔ بچوں کی بندگی۔ مولوی الطاف حسین صاحب کو سلام۔" یہ تحریر اس بنشے میں گئی ہے۔ غرض کہ عامیانہ لکھنا اختیار کیا ہے۔ اب یہ عبارت جو تم کو لکھ رہا ہوں۔ یہ لائقِ شمولِ مجموعۂ اردو کہاں ہے؟ یقین جانتا ہوں کہ ایسی نثروں کو آپ خود نہ درج کریں گے۔

کتاب کے باب میں سرمد کی رباعی کا شعر اخیر لکھ دینا کافی ہے۔ شعر:

عالم ہمہ مرآت جمال ازلی ست
می باید دید و دم نمی باید زد

"بوستانِ خیال" کا ترجمہ موسوم بہ "حدائق الانظار" معرضِ طبع میں ہے۔ اگر آپ یا آپ کا کوئی دوست خریدار ہو تو جتنی مجلد فرمایئے اُسی قدر بھجوا دوں۔ چھے روپیے مع محصول ڈاک قیمت ہے اسی مطبع میں جس میں "حدائق الانظار" کا انطباع ہوا ہے۔ اخبار بھی چھاپا جاتا ہے۔ اب کے ہفتے کا دو ورقہ بھیج دوں گا۔ بہ شرطِ پسند آپ توقیعِ خریداری لکھ بھیجیے گا۔

جناب کیمس صاحب بہادر افسر مدارس غرب و شمال کا، باوجود عدمِ تعارف، خط مجھ کو آیا۔ کچھ اردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا۔ اس کا جواب لکھ بھیجا۔ نظم و نثر اردو طلب کی تھی۔ مجموعۂ نظم بھیج دیا۔ نثر کے باب میں تمھارا نام نہیں لکھا۔ مگر یہ لکھا کہ مطبعِ الہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے۔ بعد انطباع و حصولِ اطلاع وہاں سے منگا کر بھیج دوں گا۔ زیادہ حد ادب، نامۂ جواب طلب۔

دو شنبہ ۲۳ جولائی ۱۸۶۶ء

(۲۴)

قبلہ!

پیری و صد عیب۔ ساتویں دہا کے کے مہینے گن رہا ہوں۔ تولنج آگے دوری تھا۔ اب دائمی ہو گیا ہے۔ مہینا بھر میں پانچ سات بار فضول تجمہ دفع ہو جاتے ہیں۔ اور یہی خلاصۂ حیات ہے۔ غذا کم ہوتے ہوتے اگر معدوم نہ کہو تو بہ منزلہ مفقود کہو۔ پھر گرمی نے مار ڈالا۔ ایک حرارتِ غریبہ جگر میں پاتا ہوں، جس کی شدت سے بُھنا جاتا ہوں۔ اگرچہ جرعہ جرعہ پیتا ہوں، مگر صبح سے سوتے وقت تک، نہیں جانتا کہ کتنا پانی پی جاتا ہوں۔

یہ ہے ایک رشتے کے بھتیجے نے "بوستانِ خیال" کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ میں نے اُس کا دیباچہ لکھا ہے۔ ایک دو ورقہ اُس کا بہ صورتِ پارسل بلکہ بہ ہیئتِ خط بھیجتا ہوں۔ آپ

کا مقصود دیباچہ ہے، سو نقل کر لیجے۔ میرا مدعا اس دو ورقے کے ارسال سے یہ ہے کہ اگر آپ کے پسند آئے یا اور اشخاص خرید کرنا چاہیں تو چھے روپے قیمت اور محصول بہ ذمہ خریدار ہے۔

۱۸۶۶ء[2]

(۲۵)

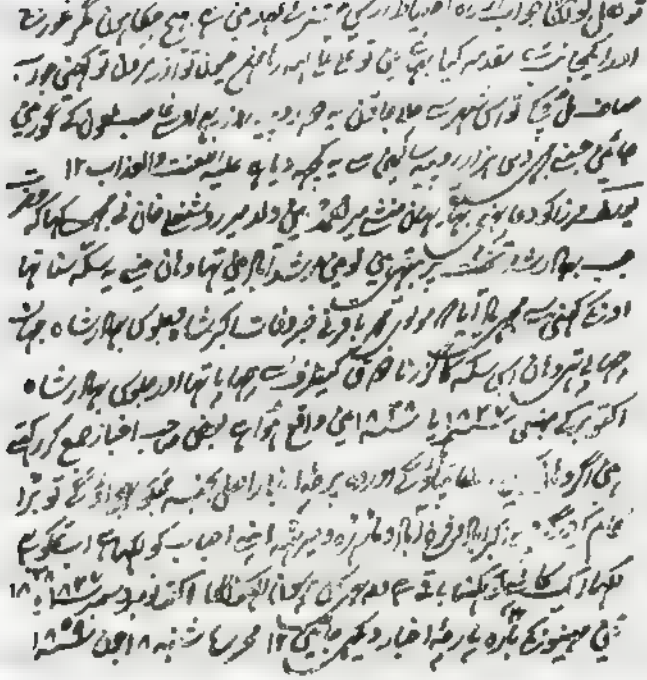
قبلہ!

میں نہیں جانتا کہ ان روزوں میں یہ قول ہندی اختر شناسوں کے کون سی کھوٹی[3] گرہ آئی ہوئی ہے کہ ہر طرف سے رنج و زحمت کا ہجوم ہے۔ مولوی صاحب سے میری ایک ملاقات، جب وہ دلّی آئے تھے اور میر خیراتی کے گھر میں اترے ہوئے تھے، ہوئی تھی۔ شرفا میں تعارف بنائے محبت اور مودت ہے۔ چہ جائے آں کہ معانقہ اور مکالمہ اور مشاعرہ واقع ہوا ہو۔ روزِ ملاقات سے اُس دن تک کہ حضرت دکن کو روانہ ہوں، کوئی امر ایسا کہ باعث ناخوشی کا ہو، درمیان نہیں آیا اور میرے اس قول کی اس راہ سے کہ مولوی صاحب آپ کے ہم نشیں و ہمدم تھے اور مجھ میں آپ میں پیوند ولائے روحانی متحقق ہے۔ آپ بھی گواہ ہو سکتے ہیں۔ اگر خدا نہ خواستہ مجھ میں اُن میں رنج پیدا ہوتا تو آپ بہت جلد اصلاحِ بین الذاتین کی طرف متوجہ ہوتے۔ اب سنیے حال منشی حبیب اللہ کا۔ میں نے اُن کو دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ تین چار برس ہوئے کہ ناگاہ ایک خط حیدر آباد سے آیا۔ اُس میں دو غزلیں۔ خط کا مضمون یہ کہ میں مختار الملک کے دفتر میں نوکر ہوں۔ آپ کا تلمذ اختیار کرتا ہوں۔ ان دونوں غزلوں کو اصلاح دیجیے۔ اس امر کے فقط[6] وہ بادی نہیں۔ بریلی اور لکھنؤ اور کلکتے اور بمبئی اور سورت سے اکثر حضرات نظم و نثر فارسی اور ہندی بھیجتے رہتے ہیں۔ میں خدمت بجا لاتا ہوں اور وہ صاحب میرے حک و اصلاح کو مانتے ہیں۔ کلام کا حسن و قبح میری نظر میں رہتا ہے اور ہر ایک کا پایہ اور دستگاہ فنِ شعر میں معلوم ہو جاتا ہے۔ عادات و عندیات عدمِ ملاقاتِ ظاہری کے سبب میں کیا جانوں۔ آمدم بر سرِ مدعا۔ منشی حبیب اللہ ذکا کے اشعار آتے رہے اور میں اصلاح دے کر بھیجتا رہا۔ بعد وارد ہونے

مولوی صاحب کے، ایک غزل اُن کی آئی اور انھوں نے یہ لکھا کہ مولوی غلام امام شہید اکبر آبادی کی غزل پر یہ غزل لکھ کر بھیجتا ہوں۔ میں نے حسبِ معمول غزل کو اصلاح دے کر بھیجا اور یہ لکھا کہ مولانا شہید اکبر آباد کے نہیں لکھنؤ اور الٰہ آباد کے ہیں۔ اس کلمے سے زیادہ کوئی بات میں نے نہیں لکھی۔ اس میں سے توہین کے معنی مستنبط ہوں تو میں ان کا مستہین سہی۔ اب میں نہیں جانتا کہ منشی صاحب نے مولوی صاحب سے کیا کہا اور مولوی صاحب نے آپ کو کیا لکھا۔

نواب حسین مرزا





(۱)

جناب نواب صاحب!

شکوہ کرنا سہل ہے۔ سبز سیاہی کہیں سے مفت کی ہاتھ آگئی۔ حضرت نے شکوہ لکھا۔ یوسف مرزا صاحب نے نظم و نثر کے لکھنے کا حکم چڑھایا۔ بھائی! تمھارے خط کا جواب آگے لکھ کر بھیج چکا ہوں۔ اپنی طرف سے سلطان عالم کو ابھی عرضی نہ لکھوں گا اور جب لکھوں گا تو خدا، میرے خداوند کو سلامت رکھے، بہ واسطہ اُن کے بھیجوں گا۔ تم کو چاہیے کہ اپنی طرف سے عرضی فارسی متعارفہ مروجہ میں لکھ بھیجو۔ یعنی یہ تم کو لکھ چکا ہوں اور اب یہی جواب ہے یوسف مرزا کو۔

پرسوں مرزا آغا جانی صاحب آئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بہادر سنگھ اور کاشی ناتھ دونوں آئے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا آؤ۔ نہ میرے کام کے نہ تمھارے کام کے۔ کام کرے کیا گنجائش ہی نہیں اور جو کچھ ہوتا جاتا ہے وہ اس قسم سے ہے کہ جس طرح صبح ہوئی، شام ہوئی، ابر آیا، مینہ برسا یعنی سعی کو، تدبیر کو، خواہش کو دخل نہیں۔

آبادی کا آوازہ پھر فرو ہے۔ لاہوری دروازے کے علاقے میں کچھ کم سو گھر آباد ہوئے ہیں۔ کئی ہزار گھر کی بستی ہے۔ اِنشاءَاللہ تعالیٰ دو چار برس میں وہ علاقہ آباد ہو جائے گا اور جب وہ علاقہ آباد ہو جائے گا تو دوسرا علاقہ شروع ہو گا۔ گھبراؤ نہیں جلدی کیا ہے۔

آج صبح کو سردار سنگھ والد جگت سنگھ میرے پاس آئے تھے، تمھارے مکان کا پتا لکھوا لے گئے ہیں، شاید تم کو خط لکھیں۔

میر عنایت حسین صاحب گڑھ مکتیسر بن کر اُڑ گئے۔ کئی آدمیوں سے کہا، انھوں نے کہا اب وہ وہاں نظر نہیں آتے۔ میرے پاس ہر ہفتے کے آنے والے مہینا بھر سے نہیں آئے۔ میر ارتضیٰ حسین کا خط اُن کے نام کا میرے پاس دھرا ہوا ہے، جب وہ آئیں گے اُن کو دے دوں گا۔ جگت سنگھ کا لکھنؤ سے روانہ ہونے کا قصد سردار سنگھ سے کہ دیا۔ اب کے تمھارے خط میں منظفر مرزا کی طرف سے کچھ نہیں لکھا۔ اس سے مستنبط ہوا کہ وہ اور جگت سنگھ جیسا کہ تم نے لکھا تھا، لکھنؤ سے کول و مراد آباد کو گئے۔ میر امداد کا ذکر میں نے مرزا آغا جانی صاحب سے کر دیا ہے کہ اچھا ہے، اگر وہ حسین مرزا صاحب اور حسینی صاحب کی طرف سے مختار کار ہو جائیں۔

کل جمعہ تھا، یقین ہے کہ صاحب کمشنر سے ملے ہو گے، عرضی دی ہو گی۔ اُس کا حال مجھ کو لکھو۔

یہ ہو لیا۔ اب میرا دکھ سنو، بھاگا نہیں، پکڑا نہیں گیا۔ دفتر قلعہ سے کوئی میرا کاغذ نہیں نکلا۔ کسی طرح کی بے وفائی و نمک حرامی کا دھبا مجھ کو نہیں لگا۔ یہاں ایک اخبار جو گوری شنکر یا گوری دیال یا کوئی اور غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا۔ اُس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی کہ فلانی تاریخ اسد اللہ خاں غالب نے یہ سکہ کہ کر گزرانا:

بہ زر زد سکۂ کشور ستانی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی

مجھ سے عند الملاقات صاحب کمشنر نے پوچھا کہ: "یہ کیا لکھتا ہے۔" میں نے کہا کہ: "غلط لکھتا

ہے۔ بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے نوکر شاعر، خدا جانے کس نے کہا؟ اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر میں نے کہہ کر گزرا نا ہوتا تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا گزرتا اور آپ کو چاہیے حکیم احسن اللہ خاں سے پوچھیے۔ اُس وقت تو چپ ہو رہا۔ اب جو اُس کی بدلی ہوئی تو جانے سے دو ہفتے پہلے ایک فارسی روبکاری لکھوا گیا کہ یہ جو اسداللہ خاں فارسی کے علم میں یکتا مشہور ہے، اُس سے کام نہیں نکلتا۔ یہ شخص بادشاہ کا نوکر تھا اور اُس کا سکہ لکھا۔ ہمارے نزدیک پنشن کے پانے کا مستحق نہیں ہے۔ غرض اس سے یہ ہے کہ میں یہاں موجود ہوں اور عملے سے راہ و رسم ہے۔ یہ تو کوئی بتاتا نہیں کہ تاریخ روبکاری کی کیا ہے اور یہ صدر کو بھیجی گئی ہے یا نہیں۔ اب حیران ہوں کہ کیا کروں۔ کمشنر جدید سے ملوں گا۔ اُس نے اگر دے گا تو نقل لوں گا۔ جواب ازراہِ احتیاط اُس کمشنر کے عہد میں بھی بھیج چکا ہوں، مگر غور نہ کی اور ایک جانب سے مقدمہ کیا۔ بھائی میں تو "علی علی" کہہ رہا ہوں۔ جیوں تو اور مروں تو۔ کہیں جواب صاف مل چکے تو اس شہر سے چلا جاؤں۔ یہ دو روپیہ روز بھی اُسی غاصب ملعون کی گور میں جائیں جس نے مجھے دس ہزار روپیہ سال میں سے یہ کچھ دیا ہے۔ علیہ اللعنت والعذاب۔

یوسف مرزا کو دعا پہنچے، بھائی، یہاں منشی میر احمد حسین ولد میر روشن علی خاں نے مجھ سے کہا کہ حضرت، جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں تو میں مرشد آباد میں تھا۔ وہاں میں نے یہ سکّہ سنا تھا۔ اُن کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ مولوی محمد باقر نے خبرِ وفاتِ اکبر شاہ و جلوسِ بہادر شاہ جہاں چھاپی تھی، وہاں اس سکے کا گزرنا، ذوق کی طرف سے چھاپا تھا اور جلوس بہادر شاہ اکتوبر کے مہینے ۱۸۳۷ء یا ۱۸۳۸ء میں واقع ہوا ہے۔ بعض صاحب اخبار جمع کر رکھتے ہیں۔ اگر وہاں کہیں اس کا پتا پاؤ گے اور وہ پرچہ اخبار اصل بجنسہ مجھ کو بھجواؤ گے تو بڑا کام کرو گے۔ میں نے اکبر آباد و فرخ آباد و مارہرہ و میرٹھ اپنے احباب کو لکھا ہے۔ اب تم کو بھی لکھا۔ ایک کالپی کو لکھنا باقی ہے، وہ بھی کل پرسوں لکھوں گا۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۸۳۷ء ۱۸۳۸ء، تین مہینوں کے بارہ پارچہ اخبار دیکھے جائیں۔

محررہ پنجشنبہ ۱۸ جون ۱۸۵۹ء



(۲)

یاحسین ابن حیدر، روحی فداک۔

یہاں تک لکھ چکا ہوں کہ محمد قلی خاں کے نام کا خط کلّو سے بُنّو بیگم صاحب نے لے لیا۔ محمد قلی خاں علی جی گئے ہوئے تھے۔ کل رضا شاہ کی زبانی معلوم ہوا کہ بھابھی صاحب نے وہ خط میر رستم علی کو دیا اور وہ اُس خط کو لے کر درگاہ گئے۔ آفریں، صد ہزار آفریں، میر رستم علی کو، دوست کے کام کے واسطے اتنی دور پیادہ جانا۔ آج دوپہر کو میر صاحب میرے پاس آئے اور وہی خط کھلا ہوا لائے اور کہا کہ میں نوندرلال کو حرف بہ حرف یہ خط پڑھا لایا ہوں۔ میں نے کہا کہ کاشی ناتھ کو کیوں نہ دکھایا؟ انھوں نے کہا کہ: تم دیکھ کر، پڑھ کر اپنے آدمی کے ہاتھ کاشی ناتھ کے پاس بھیج دینا۔" میں نے سوچا کہ کاشی ناتھ دیکھے گا اور الٹا پھیر دے گا۔ نہ آدمی سے کچھ کہے گا، نہ میرے پاس آئے گا۔ میں نے میر صاحب سے کہا کہ آپ ہی کاشی ناتھ کو دکھا کر اور اُس سے بات چیت کر کر مجھ کو لا دیجیے گا۔ وہ اُس خط کو بہ موجب میرے کہنے کے لے گئے۔ کل پرسوں وہ آئیں گے تب فکر کی

جائے گی، مگر بھائی! پیچ یہ پڑا ہے کہ محمد قلی خاں، رضا شاہ کے ساتھ پاٹودی جاتے ہیں۔ محرّم وہاں کریں گے۔ لاڈو بیگم والدۂ اکبر علی خاں نے اُن کو بلایا ہے تو اب یہ مقدمہ ان کی معاودت کے بعد ہوگا۔ کاغذ میرے پاس دھرے رہیں گے۔

صاحب! محمد قلی خاں نے غلط لکھا ہے۔ نہ حسن علی خاں مقید، نہ حامد علی خاں، نہ حکیم احسن اللہ خاں۔ حکم آخر ان تینوں صاحبوں کے واسطے نہیں ہوا۔ حکیم احسن اللہ خاں کے مکانات پر ان کو قبضہ مل گیا۔ زنانے مکان میں، جو عقب حمام ہے، ایک انگریز اترا ہوا ہے۔ پینتیس روپے مہینا اُن کو کرایہ دیتا ہے اور وہ دونوں آدمی ابھی یوں ہی اُلجھے ہوئے ہیں۔ احسن اللہ خاں اپنے مکان میں جا رہے ہیں۔ دیوان خانے کو محل سرا بنایا۔ خود جہاں اصطبل تھا، وہاں بیٹھتے ہیں۔ دیبی سنگھ سالک رام کو ان کے مکانات مل گئے۔ ایسا بھی سنا ہے کہ اُن کے دفینے بچ گئے۔ اب وہ حامد علی خاں کو قطب الدین سوداگر کی کوٹھی پر سے اٹھا کر اپنے مکان میں لے گئے ہیں۔

سردار مرزا کا حال مجھے اس سے زیادہ نہیں معلوم کہ رضا شاہ کبھی کبھی اُن کی بندگی مجھ کو کہہ دیتے ہیں۔ آج یا کل اگر رضا شاہ آگئے تو میں بیگانہ وار نکاح و متعہ کا حال اُن سے پوچھ لوں گا۔

پنجشنبہ ۲۶ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ

۲۸ جولائی (سالِ حال) ۱۸۵۹ء [۳]

(۳)

بھائی!

تمھارے خطوں کا اور یوسف مرزا کے خطوں کا جواب بھیج چکا ہوں۔ محمد قلی خاں صاحب ہمہ تن مصروف ہیں۔ دوالی کی تعطیل ہو چکی ہے۔ نوندرائے کی بی بی مر گئی ہے، وہ غمزدہ ہو رہا ہے مگر خیر، کام کرے گا۔ کاشی ناتھ بے پروا آدمی ہے۔ تم ایک خط تاکیدی اُس کو بھی لکھ بھیجو۔ اکثر وہ کہا کرتا ہے کہ ”حسین مرزا صاحب جب لکھتے ہیں، مرزا نوشہ صاحب ہی کو لکھتے ہیں۔“ یہ امر

اُس پر ظاہر نہ ہو کہ میں نے تمھیں یوں لکھا ہے، مطلب اپنا اُس کو لکھو۔

میں کیا کروں؟ اگر کہوں کہ میری جان بھی تمھارے کام آئے تو میں حاضر ہوں۔ یہ کہنا تکلّفِ محض ہے۔ کون جان دیتا ہے اور کون کسی سے جان مانگتا ہے؟ مگر جو فکر مجھ کو تمھاری ہے اور جو میری دسترس ہے اس کو میرا خدا اور میرا خداوند جانتا ہے۔ دسترس کو تم بھی جانتے ہو۔ اِنشاءَاللہ تعالیٰ، اوائلِ ماہِ آیندہ یعنی نومبر میں تیرو الا مقدمہ درست ہو جائے۔

ان سطور کی تحریر سے مراد یہ ہے کہ ابھی چنی لال تمھارا قرض خواہ آیا تھا۔ تمھارا حال پوچھتا تھا۔ کچھ سچ، کچھ جھوٹ کہہ کر اُس کو راہ پر لایا ہوں کہ سو دو سو روپیے تم کو بھیج دے۔ بنیوں کی طرح تقریر اُس کو سجھائی ہے کہ لالہ جس درخت کا پھل کھانا منظور ہوتا ہے تو اُس کو پانی دیتے ہیں۔ حسین مرزا تمھارے کھیت ہیں۔ پانی دو تو اناج پیدا ہو" بھائی، کچھ تو نرم ہوا ہے۔ تمھارے مکان کا پتا لکھوا کر لے گیا ہے، اور یہ کہ گیا ہے کہ میں اپنے بیٹے رام جی داس سے صلاح کر کے جو بات ٹھہرے گی، آپ سے آکر کہوں گا۔ اگر وہ روپیہ ہی بھیج دے تو کیا کہنا ہے اور اگر وہ خط لکھے اور تم اس کا جواب لکھو تو یہ ضرور لکھنا کہ "اسد اللہ نے جو تم سے کہا ہے، وہ سچ ہے اور وہ امر ظہور میں آنے والا ہے۔ بس زیادہ کیا لکھوں"۔

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ سردار مرزا صاحب تشریف لائے۔ میں نے خط اُن کو نہیں دکھایا مگر عند الاستفسار کہا گیا کہ خط حسین مرزا صاحب کو لکھتا ہوں۔ انھوں نے کہا میرا اسلام لکھنا اور لکھنا کہ یہاں سب خیر و عافیت سے ہیں اور سب کو دعا سلام کہتے ہیں۔

یوسف مرزا کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ اس وقت سردار مرزا سے دریافت ہو گیا کہ عباس مرزا کے نام کا تمھارا رقعہ اُن کو پہنچ گیا۔

شنبہ ۲۹ اکتوبر ۱۸۵۹ء

(۴)

جنابِ عالی!

کل آپ کا خط لکھا ہوا سہ شنبہ یکم نومبر کا پہنچا۔ لطف یہ کہ کل وہی سہ شنبہ کا دن، ۸ نومبر کی

تھی۔ آج بدھ کا دن، نو نومبر کی صبح کے وقت میں تم کو خط لکھنے بیٹھا تھا کہ برخوردار یوسف مرزا خاں کا خط لکھا ہوا تین نومبر کا پہنچا۔ اب میں دونوں خطوں کا جواب باہم لکھتا ہوں۔ دونوں صاحب باہم پڑھ لیں۔

مرزا آغا جانی صاحب اچھی طرح ہیں۔ اُن کو تپ آ گئی تھی۔ اب تپ مفارقت کر گئی ہے، مگر ضعف باقی ہے۔ آج چوتھا دن ہے کہ میرے پاس آئے تھے۔ کاشی ناتھ سراسر پہنو تہی کرتا ہے۔ نوندرا ہے یک سر ہزار سودا۔ محمد قلی خاں اکثر علی جی رہتے ہیں کبھی یہاں آجاتے ہیں تب نوند رائے کو تاکید کرتے ہیں۔

آج کل یہاں پنجاب احاطے کے بہت حاکم فراہم ہیں۔ پون ٹوٹی کے باب میں کونسل ہوئی پرسوں سات نومبر سے جاری ہوگئی۔ سالک رام خزانچی، چھنامل، مہیش داس، ان تینوں شخصوں کو یہ کام بطریق امانی سپرد ہوا ہے۔ غلّے اور اُپلے کے سوا کوئی جنس ایسی نہیں کہ جس پر محصول نہ ہو۔ آبادی کا حکم عام ہے۔ خلق کا اژدہام ہے۔ آگے حکم تھا کہ مالکانِ مکان رہیں، کرایہ دار نہ رہیں۔ پرسوں سے حکم ہو گیا کہ کرایہ دار بھی رہیں۔ کہیں یہ نہ سمجھنا کہ تم یا میں یا کوئی اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہیں رکھتے اور ہمیشہ سے کرایے کے مکان میں رہتے تھے، وہ بھی آرہیں مگر کرایہ سرکار کو دیں۔

تم انصاف کرو ہمشیرہ کی درخواست کیوں کر گزرے۔ جب وہ خود آئیں اور درخواست دیں اور منظور ہو اور مکان ملے تو اس تمام شہرستانِ ویران میں سے ایک حویلی ملے گی اور اُن کو یہاں رہنا ہوگا۔ کیوں کر اُس ویرانے میں تنہا رہیں گی سہم کر دم نکل جائے گا۔ مانا کہ جبر اختیار کر کر رہیں، کھائیں گی کہاں سے؟ بہ ہر حال یہ سب خیالاتِ خام اور حیلے ناتمام ہیں۔ ہاں نقل لینی اور مرافعہ کرنا اور نقلِ حکم لینی اور پھر مرافعہ کرنا اور پھر اُس حکم کی نقل لینی۔ یہ امور ایسے نہیں کہ جلد فیصل ہو جائیں۔ حکام بے پروا، مختار کار عدیم الفرصت، میں پاشکستہ، محمد قلی خاں کبھی یہاں، کبھی وہاں۔ وقت پر موقوف ہے، گھبراؤ نہیں۔

حکیم احسن اللہ خاں کے مکاناتِ شہر اُن کو مل گئے اور یہ حکم ہے کہ شہر سے باہر نہ جاؤ۔ دروازے سے باہر نہ نکلو، اپنے گھر میں بیٹھے رہو۔

نواب حامد علی خاں کے مکانات سب ضبط ہو گئے۔ وہ قاضی کے حوض پر کرایے کے مکانات میں مع ممتوعہ کے رہتے ہیں۔ باہر جانے کا حکم اُن کو بھی نہیں۔

مرزا الٰہی بخش کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے۔ انھوں نے زمین پکڑی ہے۔ سلطان جی میں رہتے ہیں۔ عذر کر رہے ہیں۔ دیکھیے یہ جبر اُٹھ جائے یا یہ خود اُٹھ جائیں۔

چار شنبہ ۹ نومبر ۱۸۵۹ء

(۵)

نواب صاحب!

آج تیسرا دن ہے کہ تم کو حال لکھ چکا ہوں۔ محمد قلی خاں آئے۔ ہم میں اُن میں باہم گفتگو ہوئی۔ نواب گورنر کی آمد آمد میں کچہریاں بند۔ حکام میرٹھ کو چلے جاتے ہیں۔ ۱۹ یا ۲۰ دسمبر کو میرٹھ مخیم خیام ہوگا، دربار وہیں ہوگا۔ رہا دلّی کا آنا، مشتبہ فیہ ہے۔ کوئی کہتا ہے نہ آئیں گے، کوئی کہتا ہے جریدہ بہ سبیلِ ڈاک آئیں گے۔ کوئی کہتا ہے مع لشکر آئیں گے۔ تیرہ دن یہاں رہیں گے۔ آج پندرہ دسمبر کی ہے جو کچھ واقع ہوگا وہ تم کو لکھوں گا۔

نقل حکم کی درخواست اور اس مقدمہ کی فکر بعد اس ہنگامے کے عمل میں آئے گی۔ خاطر عاطر جمع رہے۔

تمھارا دوست بھی حسب الحکم کمشنر ہانسی حصار کل یا پرسوں میرٹھ کو جائے گا اور اُدھر سے امین الدین خاں بھی وہاں آئے گا۔ میرا دربار اور خلعت دریا بُرد ہو گیا۔ نہ پنسن کی توقع، نہ دربار و خلعت کی صورت۔ نہ سزا، نہ انعام، نہ رسمِ معمولِ قدیم۔

یوسف مرزا صاحب کو دعا پہنچے۔ پرسوں کلو جو تالے آیا کل دونوں طرف سے کھلا ہوا لے کر گیا۔ ڈاک کے کارپردازوں نے الٹا پھیر دیا اور کہا کہ پولندہ بنا لاؤ۔ پولندہ بنا کر

لے گیا۔ کہا بارہ پر دو بجے لاؤ۔ بارہ پر دو بجے لے گیا۔ بیٹھا رہا۔ رات کو نو بجے اُس کے سامنے روانہ ہوا۔ رسید لے کر اپنے گھر آیا۔ خدا کرے تم کو پہنچ جائے اور پسند آئے۔

قصیدے کے باب میں میں مایوسِ مطلق ہوں مگر خیر، جو کچھ واقع ہو بہ طریقِ خبر لکھ بھیجنا۔ مثنوی "بادِ مخالف" کی رسید تمھاری تحریر سے معلوم ہوگئی۔ خیر، مفتی صاحب[۲] کے حکم کی تعمیل ہوگئی۔ فصیل خانۂ ملک پیرا لال ڈوگی کے محاذی کے مکانات سب گرائے گئے۔ بلاقی بیگم کا کوچہ التوا میں ہے۔ اہلِ فوج ڈھانا چاہتے ہیں، اہلِ قلم بچاتے ہیں۔ پایانِ کار دیکھیے کیا ہو۔

جمعہ ۱۶ دسمبر ۱۸۵۹ء

(۶)

نواب صاحب!

پرسوں صبح کو تمھارا خط پہنچا۔ پہر دن چڑھے لاٹ صاحب کا لشکر آیا۔ کابلی دروازے کی فصیل کے قریب، بھولو شاہ کی قبر کے سامنے خیمۂ خاص برپا ہوا اور باقی لشکر تیس ہزاری باغ تک اترا ہے۔ پنجشنبہ انتیس دسمبر ۱۸۵۹ء۔

اب غالب کی مصیبت کی داستان سنیے۔ پرسوں تمھارا خط پڑھ کر لشکر کو گیا۔ میر منشی سے ملا۔ اُن کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سکرتر بہادر کو اطلاع کروائی۔ تیرا اسی کے ساتھ کلو بھی گیا تھا جواب آیا کہ: "ہمارا سلام دو اور کہو کہ فرصت نہیں ہے۔" خیر، میں اپنے گھر آیا۔ کل پھر گیا، خبر کروائی، حکم ہوا کہ غدر کے زمانے میں تم باغیوں کی خوشامد کرتے رہتے تھے، اب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو؟" عالم نظر میں تیرہ و تار ہوگیا۔ یہ جواب پیامِ نومیدیِ جاوید ہے، نہ دربار، نہ خلعت، نہ پنشن۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُوْن۔

بقیہ خبرِ لشکر یہ ہے کہ راجا بھرت پور برات لے کر پٹیالے گیا تھا اور اس سبب سے آگرے میں لاٹ صاحب سے نہیں ملا تھا۔ ایک ہفتے سے معاودت کر کے یہاں آیا ہوا تھا۔ آج اُس کی ملازمت ہے۔

شنبہ اکتیس دسمبر ۱۸۵۹ء گیارہ بجے ہوں گے۔ میں خط لکھ رہا ہوں، توپیں چل رہی ہیں۔ شاید راجا صاحب کی ملاقات اسی وقت ہوئی کل یک شنبہ ہے۔ پرسوں دوشنبے کو یا سہ شنبہ کو لارڈ صاحب کا کوچ ہے۔ کہتے ہیں کہ پشاور تک جائیں گے۔

کل صبح کو محمد قلی خاں آئے۔ ایک عرضی انگریزی اُن کے ہاتھ میں، کہنے لگے یہ عرضی طالب علی فیل بان نے مجھ کو بھیر دی ہے اور کہا ہے کہ اس کے گزراننے کا موقع نہیں۔ میں اس وقت سوار ہوا چاہتا تھا۔ تمھاری یاس سن، کر گیا، اپنا داغِ حسرت جیسا اوپر لکھ آیا ہوں، لے کر آیا۔

ابراہیم علی خاں انور میں مستسقی ہو کر مر گئے۔ خدا اُن کو بخشے اور مجھ کو بھی یہ دن نصیب کرے۔ کمشنر صاحب کا نائب یہاں کوئی نہیں آیا اور نہ کسی انگریزی خواں سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ اتنا مسموع ہوا ہے کہ ایک محکمہ لاہور میں معاوضۂ نقصانِ رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے اور حکم یہ ہے کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے البتہ اُس کا معاوضہ بہ حساب دہ یک سرکار سے ہوگا۔ یعنی ہزار روپیے کے مانگنے والے کو سو روپیے ملیں گے اور جو گوروں کے وقت کی غارت گری ہے وہ ہدر اور بحل ہے، اُس کا معاوضہ نہ ہوگا۔ شاید یہ وہی کمشنر ہوں۔

مکانات کو حامد علی خاں کا کر کر کیوں لکھتے ہو؟ وہ تو مدت سے ضبط ہو کر سرکار کا مال ہو گیا۔ باغ کی صورت بدل گئی تھی۔ محل سرا اور کوٹھی میں گورے رہتے تھے۔ اب پھاٹک اور سرتا سر دکانیں گرا دی گئیں۔ سنگ و خشت کا نیلام کر کے روپیہ داخلِ خزانہ ہوا۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ حامد علی خاں کے مکان کا عملہ بکا ہے۔ سرکار نے اپنا مملوکہ و مقبوضہ ایک مکان ڈھا دیا۔ جب بادشاہِ اودھ کی املاک کا وہ حال ہو تو رعیت کی املاک کو کون پوچھتا ہے؟ تم اب تک سمجھے نہیں ہو کہ حکام کیسا سمجھتے ہیں اور نہ کبھی سمجھو گے۔ کیسا نوند راے، کیسی نقلِ حکم، کیسا مرافعہ۔ جو احکام کہ دلّی میں صادر ہوئے ہیں، وہ احکام قضا و قدر ہیں، ان کا مرافعہ کہیں نہیں۔ اب یوں سمجھ لو کہ نہ ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے، نہ جاہ و حشم رکھتے تھے، نہ املاک رکھتے تھے، نہ پنشن رکھتے تھے۔ رام پور زندگی میں میرا مسکن اور بعد مرگ میرا مدفن ہو لیا۔ جب تم لکھتے ہو کہ للہ تم وہاں جاؤ تو مجھ کو ہنسی آتی ہے۔ میں یقین کرتا

ہوں کہ ہلالِ ماہِ رجب المرجب رام پور میں دیکھوں۔

جو تدبیر وثیقے کے باب میں تم نے کی ہے، وہ بہت مناسب ہے، بہ شرط بیش ہونے کے اور ولایت پہنچنے کے۔ سجاد مرزا اور اکبر مرزا اپنی پیرانہ سری میں اس پر قابض ہو رہیں گے اِنْشَاءَاللّٰہ اَلعلیّ العظیم۔

یوسف مرزا خاں کو دعا پہنچے۔ حال قصیدہ ومخمس کا معلوم ہوا قبلہ وکعبہ وہ کر رہے ہیں جو بابا اولاد سے اور آقا غلام سے سلوک کرتا ہے اُن کو منظور ہے کہ دعا کا عطیہ جدا پاؤں اور ثنا کا صلہ جدا پاؤں۔ کارساز مابفکر کار ما، لیکن میری جان اتصالات تو کر ان صلوں میں زندگی تو بسر نہیں ہوتی۔ یہ فکر بھی بیہودہ ہے، زندگی میری کب تک؟ سات مہینے یہ اور بارہ مہینے سال آیندہ کے۔ اسی مہینے میں اپنے آقا کے پاس جا پہنچتا ہوں۔ وہاں نہ روٹی کی فکر، نہ پانی کی پیاس، نہ جاڑے کی شدت، نہ گرمی کی حدت، نہ حاکم کا خوف، نہ مخبر کا خطر، نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے اور نہ کپڑا خریدنا پڑے۔ نہ گوشت گھی منگاؤں نہ روٹی پکواؤں۔ عالم نور اور سراسر سرور :

یارب! ایں آرزوے من چہ خوش است
تو بدیں آرزو مرا برساں

بندہ علی ابن ابی طالب
آرزو مندِ مرگ۔ غالب

روز شنبہ ۳۱ دسمبر ۱۸۵۹ء

نواب امین الدّین احمد خاں

(۱)

اخ مکرم کے خدام گرام کی خدمت میں بعد ادائے سلام مسنون، ملتمس ہوں، تمھارا شہر میں رہنا موجبِ تقویتِ دل تھا:

گو نہ ملتے تھے پر ایک شہر میں تو رہتے تھے

بھائی! ایک سیر دیکھ رہا ہوں۔ کئی آدمی طیورِ آشیاں گم کردہ کی طرح ہر طرف اڑتے پھرتے ہیں۔ اُن میں سے دو چار بھولے بھٹکے کبھی یہاں بھی آجاتے ہیں۔

لو صاحب، اب وعدہ کب وفا کروگے۔ علائی کو کب بھیجو گے؟ ابھی تو شب کے چلنے اور دن کے آرام کرنے کے دن ہیں۔ بارش شروع ہو جائے گی تو آپ کی اجازت بھی کام نہ آئے گی۔ چلنے والا کیسے گا۔ میں رہروِ چالاک ہوں، تیراک نہیں۔ لوہارو سے دلّی تک کشتی بغیر کیوں کر جاؤں؟ دخانی جہاز کہاں سے لاؤں؟:

اے ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

استاد میر جان صاحب کو سلام

یوم الخمیس ۱۷ محرم ۱۲۸۱ھ

۲۳ جون ۱۸۶۴ء

علائی کے دیدار کا طالب۔ غالب

(۲)

برادر صاحب جمیل المناقب، عمیم الاحسان! سلامت۔

تمھاری تفریحِ طبع کے واسطے ایک غزل نئی لکھ کر بھیجی ہے۔ خدا کرے پسند آئے اور مطرب کو سکھائی جائے۔

آج شہر کے اخبار لکھتا ہوں، سوانحِ لیل و نہار لکھتا ہوں۔ کل پنجشنبہ ۲۵ مئی کو اول روز پہلے بڑے زور کی آندھی آئی۔ پھر خوب مینہ برسا، وہ جاڑا پڑا کہ شہر کرۂ زمہریر ہو گیا۔ بڑے دریبے کا دروازہ ڈھایا گیا۔ قابل عطار کے کوچے کا بقیہ مٹایا گیا۔ کشمیری کٹرے کی مسجد زمین کا پیوند ہو گئی۔ سڑک کی وسعت دوچند ہو گئی۔ اللہ اللہ، گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں اور ہنود کی ڈیوڑھیوں کی جھنڈیوں کے پرچم پھر آتے ہیں۔ ایک شیر زور آور اور پیل تن بندر پیدا ہوا ہے۔ مکانات جا بجا ڈھاتا پھرتا ہے۔ فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر، جو گلدستے ہیں، جس کو عوام "کنگری" کہتے ہیں، اُن میں سے ہلا ہلا کر ایک ایک کی بنا ڈھادی۔ اینٹ سے اینٹ بجادی۔ واہ رے بندر، یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر۔

ریگستان کے ملک سے ایک سردار زادہ کثیر العیال عسیر الحال، عربی، فارسی، انگریزی تین زبانوں کا عالم دلّی میں وارد ہوا ہے۔ بلّی ماروں کے محلے میں ٹھہرا ہے۔ بہ حسبِ ضرورت حکامِ شہر سے مل لیا ہے۔ باقی گھر کا دروازہ بند کیے بیٹھا رہتا ہے۔ گاہ گاہ نہ ہر شام و پگاہ، غالب علی شاہ درویش کے تکیے پر آجاتا ہے۔ اہلِ شہر حیران ہیں کہ کھاتا کہاں سے ہے، اُس کے پاس روپیہ آتا کہاں سے ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ باپ سے پھر گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بے سبب باپ کی نظر سے گر گیا ہے۔ دیکھیے انجام کار کیا ہو۔ غالب علی شاہ کا قول یہ ہے کہ کُل کا بھلا ہو۔

جمعہ ۲۶ مئی ۱۸۶۵ء

(۳)

برادر صاحب جمیل المناقب، عمیم الاحسان! سلامت۔

بعد سلام مسنون و دعائے بقائے دولت روز افزوں، عرض کیا جاتا ہے کہ استاد

میر جان آئے اور اُن کی زبانی تمھاری خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ خدا تم کو زندہ و تندرست و شاد و شاداں رکھے۔

یہاں کا حال کیا لکھوں؟ بہ قول شیخ سعدی رَحْمَۃُ اللہِ عَلَیْہ:

نہ ماند آب جز آبِ چشمِ یتیم

شب و روز یا آگ برستی ہے یا خاک۔ نہ دن کو سورج نظر آتا ہے۔ نہ رات کو تارے۔ زمین سے اُٹھتے ہیں شعلے، آسمان سے گرتے ہیں شرارے۔ چاہا تھا کہ کچھ گرمی کا حال لکھوں۔ عقل نے کہا کہ دیکھ نادان، قلم انگریزی دیاسلائی کی طرح جل اُٹھے گی اور کاغذ کو جلا دے گی۔ بھائی! ہوا کی گرمی تو بڑی بلا ہے۔ گاہ گاہ جو ہوا بند ہو جاتی ہے وہ اور بھی جاں گزا ہے۔

خیر، اب فصل سے قطع نظر ایک کودکِ غریب الوطن کے اختلاط کی گرمی کا ذکر کرتا ہوں کہ وہ جاں سوز نہیں، بلکہ دل افروز ہے۔ پرسوں فرخ مرزا آیا۔ اُس کا باپ بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ کیوں صاحب، میں تمھارا کون ہوں اور تم میرے کون ہو؟ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ حضرت آپ میرے دادا ہیں اور میں آپ کا پوتا ہوں۔ پھر میں نے پوچھا کہ تمھاری تنخواہ آئی؟ کہا جناب عالی آقا جان کی تنخواہ آگئی ہے میری نہیں آئی میں نے کہا۔ تو لوہارو جائے تو تنخواہ پائے۔ کہا حضرت میں تو آقا جان سے روز کہتا ہوں کہ لوہارو چلو، اپنی حکومت چھوڑ کر دلی کی رعیت میں کیوں مل گئے۔

سُبْحَانَ اللہ! بالشت بھر کا لڑکا اور یہ فہم درست اور طبعِ سلیم۔ میں اُس کی خوبیِ خو، اور فرخی سیرت پر نظر کر کے اس کو فرخ سیر کہتا ہوں۔ مصاحب بے بدل ہے۔ تم اس کو بلا کیوں نہیں بھیجتے؟ مگر بھائی غلام حسین خاں مرحوم کے متبع ہو کہ زین العابدین و حیدر حسن اور اُن کی اولاد کو کبھی منہ نہ لگایا۔ علاء الدین خاں جیسا ہوش مند و ہمہ داں بیٹا۔ فرخ سیر جیسا دانشور بذلہ سنج اور شیریں سخن پوتا۔ یہ دو عطیۂ عظمٰے و موہبتِ کبریٰ ہیں، تمھارے واسطے من جانب اللہ:

اگر دریافتی بر دانشت بوس
وگر غافل شدی افسوس افسوس

آج ۲۲ جون کی ہے آفتاب سرطان میں آگیا۔ نقطۂ انقلاب صیفی میں دن گھٹنے لگا۔ چاہیے کہ تمھارا غیظ و غضب ہر روز کم ہوتا جائے۔

۲۲ جون ۱۸۶۵ء نجات کا طالب۔ غالب

(۴)

برادر صاحب جمیل المناقب، عمیم الاحسان! سلامت۔

بعد سلام مسنون و دعاے بقاے دولت روز افزوں عرض کیا جاتا ہے کہ عطوفت نامے کی رُو سے فارسی دو غزلوں کی رسید معلوم ہوئی۔ تیسری غزل "گوہرنتواں گفت" "اختر نتواں گفت" جو تمھارے حسب الطلب بھیجی گئی ہے۔ کیا نہیں پہنچی؟ بے شبہ پہنچی ہو گی۔ تم بھول گئے ہو گے۔

وکیلِ حاضر باش دربارِ اسد اللہی یعنی علائی مولائی نے اپنے موکل کی خوشنودی کے واسطے فقیر کی گردن پر سوار ہو کر ایک اردو کی غزل لکھوائی۔ اگر پسند آئے تو مطرب کو سکھائی جائے۔ جھنجوٹی کے اونچے سروں میں راہ رکھوائی جائے۔ اگر جیتا رہا تو جاڑوں میں آکر میں بھی سن لوں گا۔

والسلام مع الاکرام

چہار شنبہ ۲ ربیع الاول ۱۲۸۲ھ

۲۶ جولائی ۱۸۶۵ء نجات کا طالب۔ غالب

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بے داد سے خوش، اس سے سوا اور سہی

غیر کی مرگ کا غم کس لیے اے غیرتِ ماہ؟
ہیں ہوس پیشہ بہت، وہ نہ ہوا اور سہی

تم ہو بت، پھر تمھیں پندارِ خدائی کیوں ہے؟
تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی

حسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی
آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی
تیرے کوچے کا ہے مائل دلِ مضطر میرا
کعبہ ایک اور سہی، قبلہ نما اور سہی
کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ
خلد بھی باغ ہے، خیر آب و ہوا اور سہی
کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زہر کچھ اور سہی، آبِ بقا اور سہی
مجھ سے غالبؔ یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ ۔

(۵)

بھائی صاحب!

آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں۔ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں۔ اظہارِ غم۔ تلقینِ صبر۔ دعائے مغفرت۔ سو بھائی، اظہارِ غم تکلفِ محض ہے۔ جو غم تم کو ہوا ہے۔ ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو۔ تلقینِ صبر بے دردی ہے۔ یہ سانحۂ عظیم ایسا ہے جس نے غمِ رحلتِ نوابِ مغفور کو تازہ کیا۔ پس، ایسے موقع پر صبر کی تلقین کیا کی جائے۔ رہی دعائے مغفرت۔ میں کیا اور میری دعا کیا؟ مگر چوں کہ وہ میری مربیہ اور محسنہ تھیں۔ دل سے دعا نکلتی ہے۔

معہذا تمھارا یہاں آنا سنا جاتا تھا۔ اس واسطے خط نہ لکھا۔ اب جو معلوم ہوا کہ دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے اور اس سبب سے آنا نہ ہوا۔ یہ چند سطریں لکھی گئیں۔ حق تعالیٰ تم کو سلامت اور تندرست اور خوش رکھے۔

۱۵ نومبر ۱۸۶۶ء تمھاری خوشی کا طالب - غالب

(۶)

اے میری جان!

کس وقت میں مجھ سے غزل مانگی کہ میرے واسطے نکرین کے جواب دینے کا زمانہ قریب آگیا۔ میرا حال اب جس کو دریافت کرنا ہو، وہ اہلِ محلہ سے دریافت کر لے۔

تمھاری خاطر عزیز ہے۔ فکر کی۔ بارے، نفسِ ناطقہ نے بری بھلی طرح مدد دی۔ نو شعر پہنچتے ہیں، لیکن نہ شاعرانہ، نہ عارفانہ۔

غزل

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوے صیاد دیدہ ہوں

ہوں دردمند، جبر ہو، یا اختیار ہو
گہ نالۂ کشیدہ، گہ اشکِ چکیدہ ہوں

جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بس کہ تلخیِ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں

نہ سُبحہ سے علاقہ، نہ ساغر سے رابطہ
میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں

ہوں خاکسار، پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
نہ دانۂ فتادہ ہوں، نہ دامِ چیدہ ہوں

جو چاہیے نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسفِ بہ قیمتِ اول خریدہ ہوں
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلامِ نغز، ولے ناشنیدہ ہوں
اہلِ ورع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے فرقے میں، میں برگزیدہ ہوں
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

۳ مارچ ۱۸۶۷ء

(۷)

بھائی صاحب!

ساٹھ ساٹھ برس سے ہمارے تمھارے بزرگوں میں قرابتیں بہم پہنچیں۔ نج کا میرا تمھارا معاملہ یہ کہ پچاس برس سے میں تم کو چاہتا ہوں، بے اس کے کہ چاہت تمھاری طرف سے بھی ہو، چالیس برس سے محبت کا ظہور طرفین سے ہوا۔ میں تمھیں چاہتا رہا، تم مجھے چاہتے رہے۔ وہ امر عام اور یہ امر خاص کیا مقتضی اس کا نہیں کہ مجھ میں تم میں حقیقی بھائیوں کا سا اخلاص پیدا ہو جائے؟ وہ قرابت اور یہ مودت کیا پیوندِ خون سے کم ہے؟ تمھارا یہ حال سنوں اور بے تاب نہ ہو جاؤں اور وہاں نہ آؤں، مگر کیا کروں، مبالغہ نہ سمجھو، میں ایک قالبِ بے رُوح ہوں:

یکے مردہ شخصم بمردی رواں

اضمحلال روح کا روز افزوں ہے، صبح کو تبرید، قریب دوپہر کے روٹی، شام کو شراب۔ اس میں سے جس دن ایک چیز اپنے وقت پر نہ ملی، میں مرلیا۔ واللہ نہیں آسکتا، باللہ نہیں آسکتا۔ دل کی جگہ میرے پہلو میں پتھر بھی تو نہیں۔ دوست نہ سہی دشمن بھی تو نہ ہوں گا۔ محبت نہ سہی، عداوت

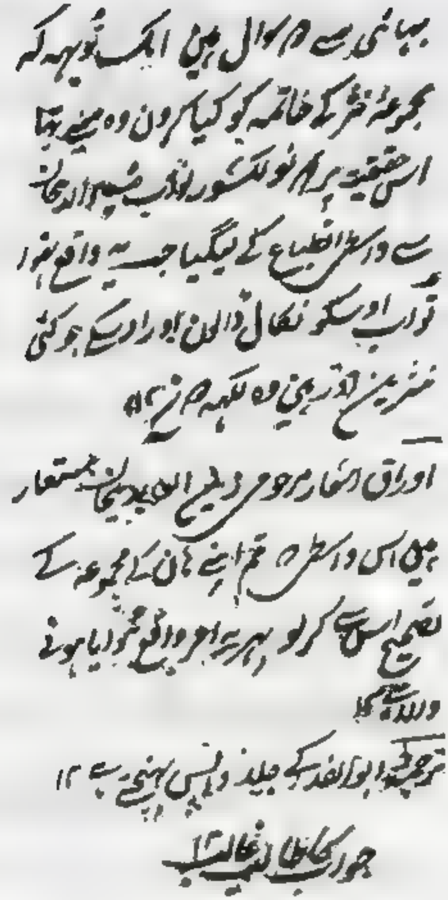
بھی تو نہ ہو گی۔ آج تم دونوں بھائی اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخرالدولہ کی جگہ ہو ہیں "لم یلد ولم یولد" ہوں۔ میری زوجہ تمھاری بہن، میرے بچے تمھارے بچے ہیں۔ خود جو میری حقیقی بھتیجی ہے، اُس کی اولاد بھی تمھاری ہی اولاد ہے۔ نہ تمھارے واسطے بلکہ ان بےکسوں کے واسطے تمھارا دعاگو ہوں اور تمھاری سلامتی چاہتا ہوں۔ تمنا یہ ہے اور اِنشاءاللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا کہ تم جیتے رہو اور تم دونوں کے سامنے مر جاؤں تاکہ اس قافلے کو اگر روٹی نہ دوگے، تو چنے تو دوگے اور اگر چنے بھی نہ دوگے اور بات نہ پوچھوگے تو میری بلا سے۔ میں تو موافق اپنے تصور کے مرتے وقت ان فلک زدوں کے غم میں نہ اُلجھوں گا۔

جناب والدہ ماجدہ تمھارا یہاں آنا چاہتی ہیں اور ضیاءالدین خاں اسی واسطے وہاں پہنچتے ہیں۔ سنو، بعد تبدیلِ آب و ہوا دو فائدے اور بھی بہت بڑے ہیں۔ کثرتِ اطبا، صحبتِ احبا، تنہائی سے نہ ملول رہوگے۔ حرف و حکایت میں مشغول رہوگے۔ آؤ آؤ، شتاب آؤ۔

بھائی مرزا علاءالدین خاں! تم کو کیا لکھوں جو وہاں تمھارے دل پر گزرتی ہوگی، یہاں میری نظر میں ہے۔ خیر، دعائے مزید عمر و دولت۔

نجات کا طالب غالبؔ

(۸)


بھائی سے دو سوال ہیں ایک تو یہ کہ
مجموعۂ نثر کے خاتمہ کو کیا کروں وہ مبنی تھا
اس حقیقت پر کہ نولکشور نواب ضیاء الدین خان
سے واسطے انطباع کے لے گیا جب یہ واقع نہ ہوا
تو اب اوسکو نکال ڈالوں اور اسکے جو کئی
نثریں اور ہیں وہ لکھ دوں
اوراق اشعار مرحوم زین العابدین خان مستعار
ہیں اس واسطے کہ تم اپنے ہاں کے مجموعے کی
تصحیح اس سے کر لو پھر یہ امر واقع ہوا یا ہونے
والا ہے
ترجمۂ ابوالفدا کی جلد واپس پہنچی ہے
جواب کا طالب غالب

بھائی سے دو سوال ہیں۔ ایک تو یہ کہ مجموعۂ نثر کے خاتمے کو کیا کروں۔ وہ مبنی تھا اِس حقیقت پر کہ نول کشور، نواب ضیاء الدین خاں سے واسطے انطباع کے لے گیا۔ جب یہ واقع نہ ہوا تو اب اُس کو نکال ڈالوں اور اُس کی جو کئی نثریں اور ہیں وہ لکھ دوں۔

اوراقِ اشعارِ مرحومی زین العابدین خاں مستعار ہیں' اس واسطے کہ تم اپنے ہاں کے مجموعے کی تصحیح اس سے کرلو۔ پھر یہ امر واقع ہوا یا ہونے والا ہے۔

"ترجمۂ ابوالفدا" کی جلد واپس پہنچی ہے۔

جواب کا طالب ۔ غالب

مرزا شہاب الدّین احمد خاں ثاقبؔ

(۱)

بھائی!

تمھارا خط حکیم محمود خاں صاحب کے آدمی کے ہاتھ پہنچا۔ خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ انصاف کرو، کتاب کوئی سی ہو اُس کا پتا کیوں کر لگے؟ لوٹ کا مال چوری چوری کوڑیوں کے ٹکڑوں میں بک گیا اور اگر سڑک پر بھی بکا تو میں کہاں جو دیکھوں؟ صبر کرو اور چپ ہو رہو۔

بر دل نفسِ اندہِ گیتی بسر آرید
گیرید، کہ گیتی ہمہ یکسر بسر آمد

آدمی تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ خدا کرے یہاں کا حال سن لیا کرتے ہو اگر جیتے رہے اور ملنا نصیب ہوا تو کہا جائے گا۔ ورنہ قصہ مختصر، قصہ تمام ہوا۔ لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں اور وہ بھی کون سی خوشی کی بات ہے جو لکھوں؟ اپنے گھر میں اور اپنے بچوں کو میری اور میرے گھر کی طرف سے دعا کہہ دینا اور تم کو بھی تمھاری اُستانی دعا کہتی ہیں۔

زیادہ زیادہ۔

دوشنبہ ۸ فروری ۱۸۵۸ء — از غالبؔ

(۲)

بھائی شہاب الدین خاں، واسطے خدا کے یہ تم نے اور حکیم غلام نجف خاں نے میرے دیوان کا کیا حال کر دیا ہے۔ یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں، خدا جانے کس ولد الزنا نے داخل کر دیے ہیں۔ دیوان تو چھاپے کا ہے۔ متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے ہیں اور اگر حاشیے پر ہوں تو میرے نہیں ہیں۔ بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جاویں تو یوں سمجھنا کہ کسی ملعون زن جلب نے اصل کلام کو چھیل کر یہ خرافات لکھ دیے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس مفسد کے یہ شعر ہیں اس کے باپ پر اور دادا اور پر دادا پر لعنت اور وہ ہفتاد پشت تک ولد الحرام۔ اس کے سوا اور کیا لکھوں؟ ایک تو لڑکے میاں غلام نجف، دوسرے تم، میری کم بختی بڑھاپے میں آئی کہ میرا کلام تمھارے ہاتھ پڑا۔

بعد ان سطروں کے لکھنے کے تمھارا خط پہنچا۔ یہ دوسرا حادثہ، مجھ کو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا۔ قضا و قدر کے امور میں دم مارنے کی گنجایش نہیں ہے۔ کہیں جاگیر پر جلد جلنے کی اجازت ہو جائے تاکہ سب یکجا باہم آرام سے رہو۔

اپنے کاتب کو کہہ دینا کہ یہ خرافات متن میں نہ لکھے، اگر لکھ دیے ہوں تو وہ ورق نکلوا ڈالنا۔ اور ورق اُس کے بدلے لکھوا کر لگا دینا۔ مناسب تو یوں ہے کہ تم کسی آدمی کے ہاتھ وہ دیوان، جو تمھارے کاتب نے نقل کیا ہے، میرے پاس بھیج دو، تاکہ میں اُس کو ایک نظر دیکھ کر پھر تم کو بھیج دوں۔ زیادہ زیادہ۔

آج میرے پاس ٹکٹ ہے نہ دام، معاف رکھنا۔ والسلام

۲ مارچ ۱۸۵۸ء — غالب

(۳)

بھائی!

تمھارا خط پہنچا۔ کوئی مطلب جواب طلب نہیں تھا کہ میں اُس کا جواب لکھتا۔ پھر سوچا

کہ مبادا تم آزردہ ہو، اِس واسطے آج یہ رقعہ تم کو لکھتا ہوں۔ میرا جی تو یہ چاہتا تھا کہ اب جو خط تمھیں لکھوں اُس کے آغاز میں یہ لکھوں کہ مبارک ہو تمھارے اب و عم مع الخیر اپنی جاگیر کو روانہ ہو گئے۔ اِنشاءَ اللہ تعالیٰ اب کے جو خط تم کو لکھوں گا اُس کا مضمون یہی ہو گا۔ خاطر جمع رکھنا اور اگر میرا خط دو چار دن نہ پہنچے تو مجھ کو اسی مضمون کے ظہور کا منتظر سمجھنا اور گلہ نہ کرنا۔

اور ہاں صاحب، تم جو خط لکھتے ہو تو اُس میں احمد سعید خاں کا کچھ ذکر نہیں لکھتے لازم ہے کہ اُس کی خیر و عافیت اور اُس کی بہن کی خیر و عافیت لکھتے رہا کرو۔ یہاں تمھاری پھوپی اور تمھارے دونوں بھتیجے اچھی طرح ہیں۔

والدعا۔

یکشنبہ ۱۲ اپریل ۱۸۵۸ء

از غالب

(۴)

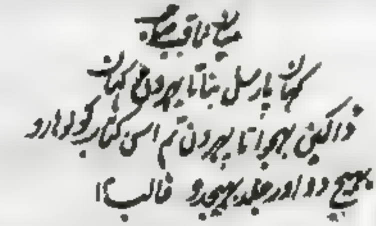
نورِ چشم شہاب الدین خاں کو دعا کے بعد معلوم ہو، یہ جو رقعہ لے کر پہنچتے ہیں اِن کا نام حسین علی ہے اور یہ سید ہیں۔ دوا سازی میں یگانہ، رکاب داری میں یکتا۔ جان محمد اِن کا باپ، ملازم سرکار شاہی تھا۔ اب اُن کا چچا میر فتح علی پندرہ روپیے مہینے کا الور میں نوکر ہے بہر حال، اُن سے کہا گیا کہ پانچ روپیے مہینا ملے گا اور لوہارو جانا ہو گا۔ انکار کیا کہ پانچ رُپیے میں، میں کیا کھاؤں گا، یہاں زن و فرزند کو کیا بھجواؤں گا؟ جواب دیا گیا کہ سرکار بڑی ہے۔ اگر کام تمھارا پسند آئے گا تو اضافہ ہو جائے گا۔ اب وہ کہتا ہے کہ خیر توقع پر یہ قلیل مشاہرہ قبول کرتا ہوں، مگر دونوں وقت روٹی سرکار سے پاؤں۔ بغیر اس کے کسی طرح سے نہیں جا سکتا۔

سنو میاں، حق بجانب اس غریب کے ہے۔ روٹی مقرر ہوئے بغیر بات نہیں بنتی۔ یقین ہے تم رپوٹ کرو گے تو اس امر کی منظوری کا حکم آ جائے گا، یہ قصہ فیصل ہوا۔ اب یہ کہتا ہے کہ دو ماہا مجھے پیشگی دو تا کہ کچھ کپڑا لتا بناؤں اور کچھ گھر میں دے جاؤں۔ راہ میں

روٹی اور سواری سرکار سے پاؤں" میں تو یہاں بھی حق بجانب سائل کے جانتا ہوں مگر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اپنی رائے اس باب میں لکھ نہیں سکتا۔ خیر تم یہی میرا رقعہ اپنے نام کا علائی مولائی کو بھیج دو۔

سہ شنبہ ۲۴ ستمبر ۱۸۶۱ء   غالب

(۵)



میاں ثاقب صاحب!

کہاں پارسل بناتا پھروں۔ کہاں ڈاک میں بھجواتا پھروں۔ تم اس کتاب کو لوہارو بھیج دو اور جلد بھیج دو۔

نیم روز دوشنبہ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۷۸ھ

مطابق ۳۰ ستمبر ۱۸۶۱ء   غالب

(۶)

تمھارے بھائی کا خط تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ "کلیاتِ اردو" جو تم نے خریدے ہیں ایک اُس میں سے چاہو، اپنے چچا کی نذر کرو۔ چاہو بھائی کو تحفہ بھیجو۔ میں نے اس وقت اُن کے نام کا خط لوہارو کو روانہ کیا ہے۔ بعد ارسال خط مولوی سدید الدین خاں صاحب میرے ہاں آئے۔ اثنائے حرف و حکایت میں، میں نے "شاہین" کی حقیقت پوچھی۔ جواب دیا کہ "ہاں عربی میں ایک بلجے کا نام "شاہین" ہے"، صورت اُس کی پوچھی گئی۔ کہا: "مجھے معلوم نہیں صراح میں، میں نے دیکھا ہے۔" تم جو مولانا علائی کو خط لکھو، یہ رقعہ ملفوف کر دو۔

غالب

(۷)

میاں مرزا شہاب الدین خاں!

اچھی طرح ہو؟ غازی آباد کا حال شمشاد علی سے سنا ہوگا۔ ہفتے کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں۔ وہاں قافلے کی گنجایش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے۔ چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا۔ میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیے۔ رات ہوگئی۔ شراب پی لی کباب کھائے۔ لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوایا۔ ترکاری نہ ڈلوائی۔ بارے آج تک دونوں بھائیوں میں موافقت ہے۔ آپس کے صلاح و مشورت سے کام کرتے ہیں۔ اتنی بات زاید ہے کہ حسین علی منزل پر اتر کر پاپڑ اور مٹھائی کے کھلونے خرید لاتا ہے۔ دونوں بھائی مل کر کھا لیتے ہیں۔ آج میں نے تمھارے والد کی نصیحت پر عمل کیا۔ چار بجے پانچ کے عمل میں ہاپوڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے بابوگڑھ کی سرائے میں آپہنچا۔ چارپائی بچھائی، اس پر بچھونا بچھا کر حقہ پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔ دونوں گھوڑے کوتل آگئے، دونوں لڑکے رتھ میں سوار آتے ہیں۔ اب وہ آئے اور کھانا کھا لیا اور چلے۔ تم اپنی استانی کے پاس جا کر یہ رقعہ سراسر پڑھ کر سنا دینا۔ شمشاد کو کتاب کے مقابلے اور تصحیح کی تاکید کر دینا۔

۸ اکتوبر ۱۸۶۵ء [۲]

(۸)

میاں!

وہ قاضی تو مسخرہ چوتیا ہے۔ ان کا خط دیکھ لیا۔ خیر، ہاں علاء الدین خاں کا خط گھنٹہ بھر بھانڈ کے طائفے کا تماشا ہے۔

اب تم کہو استاد میر جان کو کیوں کر بھیجو گے؟ اُن کو کہاں پاؤ گے؟ اور علاءالدین خاں نے حسب الحکم تمھارے چچا کے لکھا ہے:"لوہارو کی سواریاں آئی ہوئی، شاید کل یا پرسوں جائیں اس کی فکر آج کرو۔" امین الدین خاں بے چارہ اکیلا گھبراتا ہوگا۔ "چکیدن دہیم" "رمیدن دہیم" یہ غزل علاءالدین کو بھیج چکا ہوں۔ تم علاءالدین خاں کو لکھو کہ بڑے شرم کی بات ہے کہ:

ہردم آزردگیِ غیر سبب را چہ علاج

اس غزل کو حافظ کی غزل سمجھتے ہو۔ واہ۔ واہ، "غیر سبب" یہ کہاں کی بولی ہے؟:

از خواندنِ قرآنِ تو قاری، چہ فائدہ

عیاذاً باللہ۔ امیر خسرو "قرآن" کو کہ بہ سکون راے قرشت والف ممدودہ ہے۔ "قران" بروزن "پُران" لکھیں گے! یہ دونوں غزلیں دو گدھوں کی ہیں۔ شاید ایک نے مقطع میں حافظ اور ایک نے مقطع میں خسرو لکھ دیا ہو۔

ستمبر ۱۸۶۶ء

غالب

(۹)

رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے؟
ثاقب حرکت یہ کی ہے بے جا تم نے
حاجی کلّو کو دے کے بے وجہ جواب
غالب کا پکا دیا کلیجہ تم نے

(۱۰)

اے روشنیِ دیدہ شہاب الدین خاں
کٹتا ہے بتاؤ کس طرح سے رمضاں
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک
سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں ؟

مرزا حاتم علی مہر

(۱)

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے
سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اُس میں دم کیا ہے

علاقۂ محبتِ ازلی کو برحق مان کر اور پیوندِ غلامیِ جنابِ مرتضیٰ علی کو سچ جان کر ایک بات اور کہتا ہوں کہ بینائی اگرچہ سب کو عزیز ہے مگر شنوائی بھی تو آخر ایک چیز ہے۔ مانا کہ روشناسی اُس کے اجارے میں آئی ہے، یہ بھی دلیلِ آشنائی ہے۔ کیا فرض ہے کہ جب تک دید وا دید نہ ہولے، اپنے کو بیگانۂ یک دگر سمجھیں۔ البتہ ہم تم دوستِ دیرینہ ہیں اگر سمجھیں، سلام کے جواب میں خط بہت بڑا احسان ہے۔ خدا کرے وہ خط جس میں مَیں نے آپ کو سلام لکھا تھا، آپ کی نظر سے گزر گیا ہو۔ احیاناً اگر نہ دیکھا ہو تو اب مرزا تفتہؔ سے لے کر پڑھ لیجیے گا اور خط کے لکھنے کے احسان کو اُس خط کے پڑھ لینے سے دو بالا کیجیے گا۔

ہائے میجر جان جاکوب، کیا جوان مارا گیا ہے۔ سچ اُس کا یہ شیوا تھا کہ اُردو کی فکر کو مانع آتا اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا۔ بندہ نواز یہ بھی انھی میں ہے کہ جن کا میں ماتمی

ہوں۔ ہزار ہا دوست مر گئے، کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں۔ جیوں تو کوئی غم خوار نہیں۔ مروں تو کوئی عزادار نہیں۔

غزلیں آپ کی دیکھیں۔ سُبحَانَ اللہ، چشمِ بد دور۔ اردو کی راہ کے تو سالک ہو۔ گویا اس زبان کے مالک ہو۔ فارسی بھی خوبی میں کم نہیں۔ مشق شرط ہے، اگر کہے جاؤ گے، لطف پاؤ گے۔ میرا تو گویا[2] بہ قول طالبِ آملی اب یہ حال ہے بیت:

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی

دہن بر چہرہ زخمے بود، بہ شد

جب آپ نے بغیر خط کے بھیجے خط مجھ کو لکھا ہو تو کیوں کر مجھ کو اپنے خط کے جواب کی تمنا ہو؟ پہلے تو اپنا حال لکھیے کہ میں نے سنا تھا آپ کہیں کے صدر امین ہیں۔ پھر آپ اکبر آباد میں کیوں خانہ نشین ہیں؟ اس ہنگامے میں آپ کی صحبت حکام سے کیسی رہی۔ راجا بلوان سنگھ کا حال بھی لکھنا ضرور ہے کہ کہاں ہیں اور وہ دو ہزار روپیہ مہینا جو اُن کو سرکار انگریزی سے ملتا تھا، اب بھی ملتا ہے یا نہیں؟

ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اُس بہارستان پر کیا گزری۔ اموال کیا ہوئے؟ اشخاص کہاں گئے؟ خاندانِ شجاع الدولہ کے زن و مرد کا انجام کیا ہوا؟ قبلہ و کعبہ حضرت مجتہد العصر کی سرگذشت کیا ہے؟ گمان کرتا ہوں کہ بہ نسبت میرے تم کو کچھ زیادہ آگہی ہوگی۔ امیدوار ہوں کہ جو آپ پر معلوم ہے وہ مجھ پر مجہول نہ رہے۔ پتا مسکنِ مبارک کا کشمیری بازار سے زیادہ نہیں معلوم ہوا، ظاہراً اسی قدر کافی ہوگا، ورنہ آپ زیادہ لکھتے۔

مرزا تفتہ کو دعا کہیے گا اور اُن کے اُس خط کے پہنچنے کی اطلاع دیجیے گا، جس میں آپ کے خط کی انھوں نے نوید لکھی تھی۔ والسلام

اوائل جولائی ۱۸۵۸ء[8]

(۲)

خود شکوہ دلیلِ رفعِ آزار بس ست
آید بزبان ہر آنچہ از دل بردد

بندہ پرور! فقیر شکوے سے بُرا نہیں مانتا، مگر شکوے کے فن کو سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ شکوے کی خوبی یہ ہے کہ راہِ راست سے منہ نہ موڑے اور مہذا دوسرے کے واسطے جواب کی گنجایش نہ چھوڑے۔ کیا میں یہ نہیں کہ سکتا کہ مجھ کو آپ کا فرخ آباد جانا معلوم ہو گیا تھا، اس واسطے آپ کو خط نہیں لکھا تھا۔ کیا میں یہ نہیں کہ سکتا کہ میں نے اس عرصے میں کئی خط بھجوائے اور وہ اُلٹے پھر آئے؟ آپ شکوہ کا ہے کو کرتے ہیں، اپنا گناہ میرے ذمے دھرتے ہیں۔ نہ جاتے وقت لکھا کہ میں کہاں جاتا ہوں، نہ وہاں جا کر لکھا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ کل آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ آج میں نے اُس کا جواب بھجوایا۔ کہیے اپنے دعوے میں صادق ہوں یا نہیں؟ بس دردمندوں کو زیادہ ستانا اچھا نہیں۔ مرزا تفتہ سے آپ، فقط اُن کے خط نہ لکھنے کے سبب سرگراں ہیں۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ اِن دنوں میں کہاں ہیں؟ آج توکلت علی اللہ، سکندر آباد خط بھیجتا ہوں دیکھوں کیا دیکھتا ہوں۔ ۲

(۳)

بھائی صاحب!

از روے تحریر مرزا تفتہ، آپ کا چھپے کتابوں کی تزئین کی طرف متوجہ ہونا معلوم ہوا۔ پھر بھائی منشی نبی بخش صاحب نے دو بار لکھا کہ میں بہ اجمال لکھتا ہوں، مفصل مرزا حاتم علی صاحب نے لکھا ہو گا۔ یارب، اُن کے دو خط آ گئے۔ مرزا صاحب نے اگر لکھا ہوتا تو اُن کا خط کیوں نہ آتا؟ اپنے حسنِ اعتقاد سے یوں سمجھا کہ نہ لکھنا یہ مقتضاے یک دلی ہے۔ جب اپنا کام سمجھ لیے تو مجھ کو لکھنا کیا ضرور ہے؟ مگر اس کو کیا کروں کہ جواب طلب باتوں کا جواب نہیں۔

مطبع اخبار ''آفتاب عالم تاب'' میں یکم ستمبر ۱۸۵۸ء حال سے حکیم احسن اللہ خاں کا نام لکھوا

دینا اور دو لمبروں کا اخبار ایک بار بھجوا دینا اور آیندہ ہر ہفتے اس کے ارسال کا طور ٹھہرا دینا۔ کیوں صاحب! یہ امر ایسا کیا دشوار تھا کہ آپ نے نہ کیا، اور اگر دشوار تھا تو اس کی اطلاع دینی کیا دشوار تھی؟ ابھی شکایت نہیں کرتا، پوچھتا ہوں کہ آیا یہ امور مقتضی شکایت ہیں یا نہیں۔ مرزا تفتہ کے ایک خط میں یہ قصہ لکھ چکا ہوں۔ کیا انھوں نے بھی وہ خط تم کو نہیں پڑھایا؟ ہر چند عقل دوڑائی، کوئی درنگ کی وجہ خیال میں نہ آئی۔ اب حصولِ مدعا سے قطعِ نظر، میں یہ سوچ رہا ہوں کہ دیکھوں چھے مہینے بعد، برس دن بعد، اگر مرزا صاحب خط لکھتے ہیں تو اس امرِ خاص کا جواب کیا لکھتے ہیں؟ میں بھی شاعر ہوں۔ اگر کوئی مضمون ہوتا تو میرے بھی خیال میں آجاتا۔ کوئی عذر ایسا میرے ذہن میں نہیں آتا کہ قابلِ سماعت کے ہو۔ میں بھی تو دیکھوں تم کیا لکھتے ہو۔

شنبہ ۲۰ ستمبر ۱۸۵۸ء غالب

(۴)

مرا بہ سادہ دلیہائے من تواں بخشید
خطا نمودہ ام و چشمِ آفریں دارم

کل دوشنبے کا دن، بیس ستمبر کی تھی۔ صبح کو میں نے آپ کو شکایت نامہ لکھا اور بیرنگ ڈاک میں بھیج دیا۔ دوپہر کو ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ تمھارا خط اور ایک مرزا تفتہ کا خط لایا۔ معلوم ہوا کہ جس خط کا جواب میں آپ سے مانگتا ہوں، وہ نہیں پہنچا۔ کچھ شکوے سے شرمندگی اور کچھ خط کے نہ پہنچنے سے حیرت ہوئی۔ دوپہر ڈھلے مرزا تفتہ کے خط کا جواب لکھ کر ٹکٹ نکالنے لگا۔ بکس میں سے وہ تمھارے نام کا خط نکل آیا۔ اب میں سمجھا کہ خط لکھ کر بھول گیا ہوں اور ڈاک میں نہیں بھیجا۔ اپنے نسیاں کو لعنت کی اور چپ ہو رہا۔ متوقع ہوں کہ میرا قصور معاف ہو۔ بعد چاہنے عفوِ جرم کے آپ کے کل کے خط کا جواب لکھتا ہوں۔

سبحان اللہ! جلدوں کی آرایش کے باب میں کیا اچھی فکر کی ہے۔ میرے دل میں بھی ایسی ہی ایسی باتیں تھیں۔ یقین ہے کہ متاعِ شاہوار ہو جائیں گی۔ اہار مہرہ اگر ہو جائے گا تو حرف خوب

چمک جائیں گے۔ اس کا خیال اُن چار جلدوں میں بھی رہے۔ بارہ روپیے کی ہنڈوی پہنچتی ہے۔ روپیہ وصول کر کر مجھ کو اطلاع دیجے گا، ورنہ میں مشوش رہوں گا۔

حضرت، یہاں دو خبریں مشہور ہیں۔ اُن کے باب میں آپ سے تصدیق چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ لوگ کہتے ہیں کہ آگرے میں اشتہار جاری ہو گیا ہے اور ڈھنڈورا پٹ گیا ہے کہ کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا اور بادشاہی عمل ہندوستان میں ہو گیا۔ دوسری خبر یہ ہے کہ: جناب اڈمنسٹن صاحب بہادر گورمنٹ کلکتے کے چیف سکرتر اکبر آباد کے لفٹنٹ گورنر بہادر ہو گئے۔ خبریں دونوں اچھی ہیں، خدا کرے سچ ہوں اور سچ ہونا ان کا آپ کے لکھنے پر منحصر ہے۔

ہاں صاحب! ایک بات اور ہے اور وہ محلِ غور ہے۔ میں نے حضرت ملکۂ معظمۂ انگلستان کی مدح میں ایک قصیدہ اِن دنوں میں لکھا ہے۔ "تہنیتِ فتحِ ہند اور عمل داریِ شاہی" ساٹھ بیت ہے۔ منظور یہ تھا کہ کتاب کے ساتھ قصیدہ ایک اور کاغذ مذہب پر لکھ کر بھیجوں، پھر یہ خیال میں آیا کہ دس سطر کے مسطر پر کتاب لکھی گئی ہے، یعنی چھاپا ہوئی ہے، اگر یہ چھے صفحے یعنی تین ورق اور چھپ کر اُس کتاب کے آغاز میں شامل جلد ہو جائیں تو بات اچھی ہے۔ آپ اور منشی نبی بخش صاحب اور مرزا تفتہ، منشی شیو نرائن صاحب سے کہہ کر اس کا طور درست کریں اور پھر مجھ کو اطلاع دیں تو میں مسودہ آپ کے پاس بھیج دوں۔ جب کتاب چھپ چکے تو یہ چھپ جائے۔ دو باتیں ہیں: ایک تو یہ کہ چھپے بعد کتاب کے، اور لگایا جائے پہلے کتاب سے؛ دوسرے یہ کہ اس کی سیاہ قلم کی لوح الگ ہو اور پہلے صفحے پر جس طرح کتاب کا نام چھاپتے ہیں، اُس طرح یہ بھی چھاپا جائے کہ "قصیدہ در مدح جناب ملکۂ انگلستان خلد اللہ ملکہا"۔ میرا نام کچھ ضرور نہیں۔ کتاب کے پہلے صفحے پر تو ہو گا۔

ہنڈوی کی رسید اور اس مطلبِ خاص کا جواب باصواب یعنی نویدِ قبول جلد لکھیے۔

سہ شنبہ ۲۱ ستمبر ۱۸۵۸ء

(۵)

بھائی صاحب!

خدا تم کو دولت و اقبال روز افزوں عطا کرے اور ہم تم ایک جگہ رہا کریں۔ خدا کرے قصیدے کے چھاپے کی منظوری اور ہنڈوی کی رسید آئے۔ گویا صفر کے مہینے میں عید آئے۔ ہنڈوی کا روپیہ جب چاہو تب منگواؤ اور کتابوں کی لوحیں اور جلدیں موافق اپنی رائے کے بنوالو۔

اب آپ دو ورقے کا ڈاک میں بھیجنا موقوف رکھیں اور کتابوں کی درستی پر ہمت مصروف رکھیں۔ قصیدے کے مسودے کا ورق مرزا تفتہ کے خط میں پہنچ گیا ہوگا۔ آپ نے اور مرزا تفتہ نے اور بھائی نبی بخش صاحب نے قصیدے کو دیکھا ہوگا۔ قصیدے کا شاملِ کتاب ہونا بہت ضرور ہے پر دیکھا چاہیے صاحبِ مطبع کو کیا منظور ہے، اگر وہ کاغذ کی قیمت کا عذر کریں گے تو ہم پانچ سات روپے سے اور بھی اُن کا بھرنا بھریں گے۔

جناب اڈمنسٹن صاحب بہادر سے میں صورت آشنا نہیں۔ کبھی میں نے اُن کو کہیں دیکھا نہیں خطوں کی میری اُن کی ملاقات ہے اور نامہ و پیام کی یوں بات ہے کہ جب کوئی نواب گورنر جنرل بہادر نئے آتے ہیں تو میری طرف سے ایک قصیدہ بہ طریقِ نذر جاتا ہے۔ بے ذریعہ جناب صاحب بہادر ایجنٹ دہلی اور نواب لفٹنٹ گورنر بہادر آگرہ بھیجتا ہوں اور صاحب سکرتر بہادر گورمنٹ کا خط اُس کی رسید میں بہ سبیلِ ڈاک پاتا ہوں۔ جب جناب لارڈ کیننگ بہادر نے کرسی گورنری پر اجلاس فرمایا تو میں نے موافق دستور کے قصیدہ ڈاک میں بھجوایا۔ اڈمنسٹن صاحب بہادر چیف سکرتر کا جو مجھ کو خط آیا تو انھوں نے باوجود عدم سابقہ معرفت میرا القاب بڑھایا۔ قبل ازیں "خاں صاحب بسیار مہربان دوستاں" میرا القاب تھا۔ اس قدر شناس نے ازراہِ قدر افزائی "خاں صاحب مشفق بسیار مہربانِ مخلصاں" لکھا۔ اب فرمائیے، اُن کو کیوں کر اپنا محسن اور مربی نہ جانوں؟ کیا کافر ہوں جو احسان نہ مانوں؟

برخوردار مرزا تفتہ کو دعا کہتا ہوں۔ بھائی! اب میں اس کا منتظر رہتا ہوں کہ تم اور

مرزا صاحب مجھ کو لکھو کہ "تو صاحب" "دستنبو" کا چھاپا تمام کیا گیا اور قصیدہ چھاپ کر ابتدا میں لگا دیا گیا۔ "مادہ تاریخ میں کیا برائی ہے جو تمھارے جی میں یہ بات آئی ہے کہ مجھ سے بار بار پوچھتے ہو؟ مادہ اچھا ہے، قطعہ لکھ لو اور خاتمۂ کتاب پر لگا دو۔ ایک قطعہ مرزا صاحب کا، ایک قطعہ تمھارا، یہ دونوں قطعے رہیں اور اگر وہاں کوئی اور صاحب شاعر ہوں تو وہ بھی کہیں۔ اس عبارت سے یہ نہ سمجھنا کہ روے سخن ساری خدائی کی طرف ہے، بلکہ خاص یہ اشارہ بھائی کی طرف ہے۔ مولانا حقیر کو توجہ اس باب میں چاہیے اور اُن کا نام بھی اس کتاب میں چاہیے۔

اس خط کو لکھ کر بند کر چکا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ میرے مشفق منشی شیو نراین صاحب کا خط لایا بارے قصیدے کا مسودہ پہنچ گیا اور منشی صاحب نے اُس کا چھاپنا قبول کیا۔ یہ تشویش بھی رفع ہوگئی۔ آپ اُن سے میرا سلام کہیے گا اور یہ کہیے گا:

شکر رافتہاے تو چندانکہ رافتہاے تو

اور یہ اُن کو اطلاع دیجیے گا کہ اخبار کا لفافہ ہرگز مجھ کو نہیں پہنچا، ورنہ کیا امکان تھا کہ میں اُس کی رسید نہ لکھتا۔

۲۹ ستمبر ۱۸۵۸ء غالب

(۶۱)

بندہ پرور۔ آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ آپ کی مہر انگیز اور محبت خیز باتوں نے غمِ بے کسی بُھلایا۔ کہاں دھیان لڑا ہے! کہاں سے "دستنبو" کی مناسبت کے واسطے "ید بیضا" ڈھونڈھ نکالا ہے۔ آفریں۔ آفریں۔ صد ہزار آفریں! تیسرا مصرع اگر یوں ہو تو فقیر کے نزدیک بہت مناسب ہے:

نامہ خود سال خویش داد نشاں"

مرزا تفتہ کا خط ہاترس سے آیا۔ اُن کے لڑکے بالے اچھے ہیں۔ آپ گھبرائیں نہیں، وہ آئے کے آئے ہیں، اگر تمھیں بغیر اُن کے آرام نہیں تو اُن کو بغیر تمھارے چین کہاں؟

صاحب بندہ اثنا عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمے پر بارہ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا

کرے کہ میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو۔ ہم تم ایک آقا کے غلام ہیں۔ تم جو مجھ سے محبت کروگے یا میری غم گساری میں محنت کروگے۔ کیا تم کو غیر جانوں جو تمھارا احسان مانوں۔ تم سراپا مہر و وفا ہو۔ واللہ اسم بامسمٰی ہو۔

مبالغہ اس کتاب کی تصحیح میں اس واسطے کرتا ہوں کہ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے۔ صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے۔ اگر غلط ہو جائے تو پھر وہ عبارت نری خرافات ہے۔ بارے بہ سبب التفات بھائی منشی نبی بخش صاحب کے صحتِ الفاظ سے خاطر جمع ہے۔ متوقع ہوں کہ وہ تکلیف سہیں اور ختم کتاب تک متوجہ رہیں۔ منشی شیونرائن صاحب نے کاپی میرے دیکھنے کو بھیجی تھی۔ سب طرح میرے پسند آئی۔ چنانچہ اُن کو لکھ بھیجا ہے، اگر ہو سکے تو سیاہی ذرا اور بھی رنگت کی اچھی ہو۔

حضرت چار جلدیں یہاں کے حکام کو دوں گا اور دو جلدیں ولایت کو بھیجوں گا۔ اللہ اللہ! کیا غفلت ہے اور کیا اعتماد ہے زندگی پر بہر حال یہ ہوس تھی اور شاید اب بھی ہو کہ ان چھے جلدوں کی کچھ تزئین اور آرایش کی جاوے۔ آپ اور بھائی صاحب اور اُن کا فرزندِ رشید منشی عبداللطیف اور منشی شیونرائن یہ چاروں صاحب فراہم ہوں اور بہ اجلاس کونسل یہ امر تجویز کیا جاوے کہ کیا کیا جائے۔ معہٰذا دو دو روپیے کتاب سے زیادہ کا مقدور بھی نہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ چار جلدیں چھے روپیے میں اور دو جلدیں چھے روپیے میں تیار ہوں۔ پھر سوچتا ہوں کہ یارب آرایش کی گنجایش کہاں؟ ناچار چار کتابوں کی جلد ڈیڑھ ڈیڑھ روپیے کی اور دو کتابیں کی جلد تین تین روپیے کی بنائی جائے۔ قصہ مختصر، کچھ کیا جائے یا یہی کہ دیا جائے کہ تیری رائے کونسل میں مقبول اور صرف چھے جلدوں کی تیاری منظور ہوئی۔ بارہ روپیے بھیج دیے۔

مطالب اور مقاصد تمام ہوئے اور ہم تم بہ زبانِ قلم باہم دگر ہم کلام ہوئے۔

ستمبر ۱۸۵۸ء

(۷)

بھائی صاحب!

آپ کے خامۂ مشکبار کی صریر نے کتابوں کی نرخ طلائی کا آوازہ یہاں تک پہنچایا بلکہ

مجھ کو اُن کی لوحوں کا ہر خط طلائی مانندِ شعاعِ آفتاب نظر آیا۔ کیا پوچھنا ہے اور کیا کہنا ہے۔ مجھ کو تو یہ موجب اِس مصرع کے :

خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تست

دل میں خوش ہو کر چپ رہنا ہے۔

حضرت مدح کو ایک موقع ضرور ہے، مجھ کو آپ کے حکم کا بجا لانا منظور ہے۔ اس نذر کے پہنچنے کے بعد جب کوئی اُن کا عنایت نامہ آئے گا تو بندۂ درگاہ مدح گستری کا جوہر دکھائے گا۔ اُس نظم میں آپ کا ذکرِ خیر بھی آجائے گا۔ اب یہ تو فرمایئے کہ مدتِ انتظار کب انجام پائے گی' اور کتابوں کی روانگی کی خبر مجھ کو کب آئے گی؟ آپ کی فرطِ توجہ کا سب طرح یقین ہے سیاہ قلم کی پانچوں لوحیں بھی اگر بن گئی ہوں تو کچھ عجب نہیں ہے۔ جلدوں کا بنانا البتہ چھاپے کے اختتام پر موقوف ہے۔ معلوم تو ہوتا ہے کہ بھائی نبی بخش صاحب اور ہمارے شفیق منشی شیو نرائن صاحب کی ہمت اُس کے جلد انجام ہونے پر مصروف ہے۔ یارب! اسی اکتوبر کے مہینے میں یہ کام انجام پا جائے' اور چالیس جلدوں کا پشتارہ میرے پاس آجائے۔ مرزا تفتہ کو کیا دوں اور کیا لکھوں مگر دعا دوں اور دعا لکھوں۔

صاحب' اب ڈھیل نہ کرو۔ کام میں تعجیل کرو :

اے ز فرصت بے خبر' در ہر چہ باشی زود باش

خدا کرے نثر کی تحریر انجام پا گئی ہو اور قصیدے کے چھاپنے کی نوبت آ گئی ہو قصیدے کا نثر سے پہلے لگانا' از راہِ اکرام و اعزاز ہے۔ ورنہ نثر میں اور صنعت' اور نظم کا اور انداز ہے۔ یہ اُس کا دیباچہ کیوں ہو؟ بلکہ صورت ان دونوں کے اجتماع کی یوں ہو کہ سررشتۂ آمیزش توڑ دیا جائے اور قصیدے کے اور "دستنبو" کے بیچ میں ایک ورق سادہ چھوڑ دیا جائے۔

رائے امید سنگھ کا کوئی خط اگر اندور سے آیا ہو تو مجھ کو بھی آگہی دو۔ چاہو تم ہی ابتدا کرو اور ایک خط اُن کو لکھو اور اُس کا پرداز اِس بات پر رکھو کہ اب وہ کتابیں تیار ہونے کو آئی ہیں'

آپ کی خدمت میں کہاں بھیجی جائیں اور کیا پتا لکھا جائے؟ یہ خط جواب طلب ہو جائے گا اور اُن کو جواب لکھنا پڑے گا۔

اکتوبر ۱۸۵۵ء
غالبؔ

(۸)

بھائی صاحب!

مطبع میں سے سادہ کتابیں یقین ہے کہ آج کل پہنچ جائیں اور پس و پیش سات جلدیں آپ کی بنوائی ہوئی بھی آئیں۔ بالفعل ایک اور عقدہ سررشتہ خیال میں پڑا ہے یعنی از روے اخبار "مفید خلائق" ذہن یوں لڑا ہے کہ اس ہفتے میں جناب اڈمنسٹن صاحب بہادر آگرے آئیں گے اور وسادۂ لفٹنٹ گورنری پر اجلاس فرمائیں گے۔ اِس صورت میں اغلب ہے کہ ولیم میور صاحب بہادر اُن کی جگہ چیف سکرتر بن جائیں گے۔ پھر دیکھیے کہ یہ محکمۂ لفٹنٹ گورنری میں اپنا سکرتر کس کو بنائیں گے۔ میر منشی اس محکمے کے تو وہی منشی غلام غوث خاں بہادر رہیں گے۔ دیکھیے ہمارے منشی مولوی قمر الدین خاں کہاں رہیں گے۔ بہر حال آپ سے یہ استدعا ہے کہ پہلے کتابوں کا احوال لکھیے اور پھر جدا جدا جواب ہر سوال کا لکھیے۔ جب تک اڈمنسٹن صاحب بہادر چیف سکرتر تھے تو یہ خیال میں تھا کہ اُن کی نذر اور نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر یعنی دو کتابیں مع اپنے خط کے اُن کے پاس بھیجوں گا، اب حیران ہوں کہ کیا کروں؟ آیا اُن کی جگہ سکرتر کون ہوا؟ اور یہ جو لفٹنٹ گورنر ہوئے تو انھوں نے سکرتر کس کو کیا؟ میر منشی لفٹنٹ گورنر کا کون رہا اور گورنر جنرل کا میر منشی کون ہے؟ جو آپ کو معلوم ہو وہ اور جو نہ معلوم ہو وہ دریافت کر کر لکھیے۔ قمر الدین خاں کا حال ضرور، منشی غلام غوث خاں کا حال پر ضرور۔ بھائی! میرے سر کی قسم، اِس خط کا جواب ضرور لکھنا اور مفصل لکھنا اور ایسا واضح لکھنا کہ مجھ سا کند ذہن اچھی طرح اُس کو سمجھ لے۔ زیادہ کیا لکھوں؟

اوائل نومبر ۱۸۵۵ء
غالبؔ

(۹)

مرزا صاحب!

میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے؟ اتنا تو کہو کہ یہ کیا بات تمھارے جی میں آئی ہے؟ برسوں ہو گئے کہ تمھارا خط نہیں آیا، نہ اپنی خیر و عافیت لکھی، نہ کتابوں کا بیورا بھجوایا۔

ہاں مرزا تفتہ نے ہاترس سے یہ خبر دی ہے کہ پانچ ورق پانچ کتابوں کے آغاز کے اُن کو دے آیا ہوں اور انھوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے۔ یہ تو بہت دن ہوئے جو تم نے مجھ کو خبر دی ہے کہ دو کتابوں کی طلائی لوح مرتب ہو گئی ہے، پھر اب اُن دو کتابوں کی جلدیں بن جانے کی کیا خبر ہے؟ اور ان پانچ کتابوں کے تیار ہونے میں درنگ کس قدر ہے؟ مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ تمھاری چالیس کتابیں بعد منہائی لینے سات جلدوں کے اسی ہفتے میں تمھارے پاس پہنچ جائیں گی۔ اب حضرت ارشاد کریں کہ یہ سات جلدیں کب آئیں گی۔ ہر چند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو۔ خدا کرے اُن تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز آگے پیچھے یہ سات جلدیں آپ کی عنایت بھی آئیں تا خاص و عام کو بجا بجا بھیجی جائیں

میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ نواب ضیاء الدین خاں اور نواب حسین مرزا جمع کر لیتے تھے، جو میں نے کہا انھوں نے لکھ لیا۔ اُن دونوں کے گھر لُٹ گئے۔ ہزاروں روپیے کے کتاب خانے برباد ہو گئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا، یقین کہنا کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں

اور صلے میں اُس کے اس خط کا جواب چاہتا ہوں۔ غزل:

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے
لے کے، دل، دلستاں روانہ ہوا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما
کام گر رک گیا روا نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

اوائل نومبر ۱۸۵۸ء

(۱۰)

بھائی صاحب!

تینتیس کتابیں بھیجی ہوئی برخوردار منشی شیو نرائن کی کل جمعے کے دن، ۱۲ نومبر کو پہنچیں۔ کاغذ اور سیاہی اور خط کا حسن دیکھ کر میں نے از روئے یقین جانا کہ طلائی کام پر یہ کتابیں

طاؤسِ بہشت بن جائیں گی۔ حوریں اُن کو دیکھ کر شرمائیں گی۔ یہ تو سب درست، مگر دیکھیے مجھ کو اُن کا دیکھنا کب تک میسّر ہو؟ آپ پر گمان تساہل کا گزرے، یہ تو کیوں کر ہو؟ ہاں صحاف جلد کے بنانے کی نسبت سے میرے حق کا جلّاد نہ بن جائے۔ یعنی مدتِ مناسب سے زیادہ دیر نہ لگائے۔

اور ہاں حضرت، کچھ ایسی پختگی ارسال کے وقت کر لیجیے گا کہ وہ پارسل آشوبِ تلف سے محفوظ رہے۔ بہت عزیز اور بہت کام کی چیز ہے۔ مجھ کو وہ ایک ایک مجلد اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ یا الٰہی! یہ خط راہ میں ہو اور وہ ساتوں کتابوں کا پارسل تیرے حفظ و امان میں مجھ تک پہنچ جائے اور یہ نہ ہو تو بھلا یہ ہو کہ اس خط کا جو جواب لکھیے اُس میں یہ مرقوم ہو کہ آج ہم نے کتابوں کا پارسل روانہ کیا ہے:

یارب ایں آرزوی من چہ خوش است
تو بدیں آرزو مرا برساں

مرسلۂ شنبہ ۱۳ نومبر ۱۸۵۸ء

(۱۱)

بھائی جان!

کل جو جمعہ، روزِ مبارک و سعید تھا، گویا میرے حق میں روزِ عید تھا۔ چار گھڑی دن رہے نامۂ فرحت فرجام اور چار گھڑی کے بعد وقتِ شام، بیت:

سات جلدوں کا پارسل پہنچا
واہ کیا خوب برمحل پہنچا

آدمی کو موافق اُس کی تمنا کے آرزو برآنی بہت محال ہے۔ میری آرزو ایسی برآئی کہ وہ برتر از وہم و خیال ہے۔ یہ بناؤ تو میرے تصور میں بھی نہیں گزرتا تھا، میں تو صرف اس قدر خیال کرتا تھا کہ جلدیں بندھی ہوئی، دو کی لوحیں زریں اور پانچ کی لوحیں سیاہ قلم

کی ہوں گی۔ واللہ اگر تصور میں بھی گزرتا ہو کہ کتابیں اس رقم کی ہوں گی۔ جب تک جہاں ہے تم جہاں میں رہو۔ ائمۂ اطہار علیہم السلام کی امان میں رہو۔ میرا مقصود یہ تھا کہ ایک کتاب مثل اُن پیارہ کے بن جائے، نہ یہ کہ دو کتابوں کا سارنگ دکھلائے۔ اب میں حیران ہوں کہ آیا شمار ائمہ نے ان بارہ روپیوں میں برکت دی یا کچھ تمھارا روپیہ زیادہ صرف ہوا۔ دو پارسلوں کا محصول، دو رجسٹریوں کا محصول، تین کتابوں کی لوحیں طلائی، یہ ساری بات اُس روپے میں کیوں کر بن آئی؟ اور کس طرح معلوم کروں؟ کس سے پوچھوں؟ خدا کرے تم تکلف نہ کرو اور اس امر کے اظہار میں توقف نہ کرو۔ خفقانی آدمی کو بغیر حال معلوم ہوئے آرام نہیں آتا۔ جہاں محبتیں دینی اور روحانی ہوں، وہاں تکلف کام نہیں آتا۔ زیادہ اس سے کہ شکرگزار ہوں اور شرمسار ہوں، کیا لکھوں؟

چارہ خاموشیست چیزے را کہ از تحسین گذشت

۲۰ نومبر ۱۸۵۵ء

(۱۲)

بندہ پرور!

آپ کا خط کل پہنچا۔ آج جواب لکھتا ہوں۔ داد دینا کتاشتاب لکھتا ہوں مطالب مندرجہ کے جواب کا بھی وقت آتا ہے، پہلے تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم و اندوہ کا شکوہ گزار پایا ہے۔ پس اگر کسی بے درد پر دل آیا ہے تو شکایت کی کیا گنجائش ہے بلکہ یہ غم تو نصیبِ دوستان درخورِ افزایش ہے۔ یہ قولِ غالب علیہ الرحمۃ، بیت:

کسی کو دے کے دل، کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

ہے ہے حسنِ مطلع:

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوا تو دوست جس کا دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

افسوس ہے کہ اس غزل کے اور اشعار یاد نہ آئے اور اگر خدانہ خواستہ باشد غمِ دنیا ہے تو بھائی ہمارے ہم درد ہو۔ ہم اس بوجھ کو مردانہ اُٹھا رہے ہیں، تم بھی اُٹھاؤ۔ اگر مرد ہو۔ بہ قولِ غالب مرحوم، شعر:

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریہ سحری ہے، نہ آہِ نیم شبی ہے

"سحر ہوگی، خبر ہوگی" اس زمین میں وہ شعر یعنی:

تمھارے واسطے، دل سے مکاں کوئی نہیں بہتر
جو آنکھوں میں تمھیں رکھوں، تو ڈرتا ہوں نظر ہوگی

کتنا خوب ہے، اُردو کا کیا اچھا اسلوب ہے، قصیدے کا مشتاق ہوں۔ خدا کرے جلد چھاپا جاوے تو ہمارے دیکھنے میں بھی آئے۔ "کیا کہیے"، "بھلا کہیے"۔ یہ زمین ایک بار یہاں طرح ہوئی تھی مگر بحر اور ہی تھی:

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے
تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو، تو کیا کہیے
رہے نہ جان، تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان، تو خنجر کو مرحبا کہیے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

اور وہ جو "فعلاتن، فعلاتن فعلاتن فعلن" یہ بحر ہے اُس میں ایک میرا قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتے میں کہا تھا۔ تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین صاحب ایک میرے دوست تھے، انھوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ، اپنے کفِ دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر اُن کو دیا

اور صلے میں وہ ڈلی اُن سے لی۔ اب سوچ رہا ہوں، جو شعر یاد آتے جاتے ہیں لکھتا جاتا ہوں۔

قطعہ :

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بہ دنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکینِ رُخِ دل کشِ لیلیٰ کہیے
حجر الاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض
نافہ، آہوے بیابانِ ختن کا، کہیے
صومعے میں اسے ٹھہرایے گر مُہرِ نماز
میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیے
مسی آلودہ سرانگشتِ حسیناں لکھیے
سرپستانِ پریزاد سے مانا کہیے

غرض کہ بیس بائیس پھبتیاں ہیں۔ اشعار سب کب یاد آتے ہیں۔ اخیر کی بیت یہ ہے :

اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

لو حضرت آپ کے خط کے جواب نے انجام پایا۔

اب میرا دردِ دل سنو۔ برخوردار منشی شیو نرائن نے میرے دو خطوں کا جواب نہیں لکھا اور وہ خطوط جواب طلب تھے۔ تم اُن کو میری دعا کہو اور کہو کہ میاں تیرا کام بند ہے۔ اس مطلبِ خاص کا جواب جلد لکھو، یعنی اگر وہ کتاب بن چکی ہے تو جلد بھیجو اور اگر اس کے بھیجنے میں دیر

ہے تو یہ لکھ بھیجو کہ وہ سیاہ قلم کی لوح کی ہے یا طلائی ؟

اواخر نومبر ۱۸۵۵ء[1]

(۱۳)

خدا کا شکر بجالاتا ہوں کہ آپ کو اپنی طرف متوجہ پاتا ہوں۔ مرزا تفتہ کا خط جو آپ نے نقل کر کر بھیج دیا ہے۔ میں نے منشی شیو نرائن کا بھیجا ہوا اصل خط دیکھ لیا ہے۔ اگر تم مناسب جانو تو ایک بات میری مانو۔ رقعاتِ عالم گیری یا انشاے خلیفہ" اپنے سامنے رکھ لیا کرو، جو عبارت اُس میں سے پسند آیا کرے وہ خط میں لکھ دیا کرو، خط مفت میں تمام ہو جایا کرے گا اور تمھارے خط کے آنے کا نام ہو جایا کرے گا۔ اگر کبھی کوئی قصیدہ کہا، اُس کا دیکھنا مشاہدہ اخبار پر موقوف رہا:

برأتِ عاشقاں بر شاخِ آہو

واقعی جو اخبار آگرے سے دلّی آتے ہیں، وہ میرے سامنے پڑھے جاتے ہیں۔ صاحب! ہوش میں آؤ اور مجھ کو بتاؤ کہ یہاں جو پارسیوں کی دکانوں میں "فرینچ" اور "شام پین" کے درجن دھرے ہوئے ہیں یا ساہوکاروں کے اور جوہریوں کے گھر روپے اور جواہر سے بھرے ہوئے ہیں۔ میں کہاں وہ شراب پینے جاؤں گا اور وہ مال کیوں کر اُٹھاؤں گا؟ بس اب زیادہ باتیں نہ بنایئے اور وہ قصیدے مجھ کو بھجوایئے:

میں نے کتابیں جا بہ جا بہ سبیلِ پارسل ارسال کی ہیں۔ اگرچہ پہنچنے کی خبر پائی ہے مگر نویدِ قبول ابھی کہیں سے نہیں آئی ہے۔ شعر:

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

دیکھنا بھائی اس غزل کا مطلع کیا ہے۔

جور سے باز آئیں، پر باز آئیں کیا؟
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا؟

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا؟
لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا؟
پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

غزل ناتمام ہے۔

ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم؟ جب اُٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جاکر، دل و جاں اور
لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور
ابرو سے ہے کیا، اُس نگہِ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر، مگر اُس کی ہے کماں اور
یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور
ہرچند سبک دست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

مرتا ہوں اُس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
جلّاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

دوشنبے کا دن، بیس دسمبر کی، صبح کا وقت ہے۔ انگیٹھی رکھی ہوئی ہے۔ آگ تاپ رہا ہوں اور خط لکھ رہا ہوں۔ یہ اشعار یاد آگئے، تم کو لکھ بھیجے۔ والسلام

دوشنبہ ۲۰ دسمبر ۱۸۵۸ء ۲

(۱۴)

بھائی صاحب!

تمہارا خط اور قصیدہ پہنچا۔ اصل خط تمہارا لفافے میں لپیٹ کر مرزا تفتہ کو بھیج دیا تاکہ حال اُن کو مفصل معلوم ہو جائے۔ بعد اس رپوٹ کے تم کو تہنیت دیتا ہوں۔ پروردگار بہ تصدقِ ائمہ اطہار یہ پیش آمدِ اقبال تم کو مبارک کرے اور منصب ہائے خطیر اور مدارجِ عظیم کو پہنچاوے۔ واقعی یہ کہ تم نے بڑی جرأت کی، فی الحقیقت اپنی جان پر کھیلے تھے۔ بات پیدا کی مگر اپنی مردی و مردانگی سے۔ دولت کا ہاتھ آنا مع نیک نامی، اس سے بہتر دنیا میں کوئی بات نہیں۔ اب یقین ہے کہ خدمتِ منصفی ملے اور جلد ترقی کرو۔ ایسا کہ سالِ آیندہ تک چشم بددور صدر الصدور ہو جاؤ۔

اللہ اللہ ایک وہ زمانہ تھا کہ "مغل" نے تمہارا ذکر مجھ سے کیا تھا اور وہ اشعار جو تم نے اُس کے حُسن کے وصف میں لکھے تھے، تمہارے ہاتھ کے لکھے ہوئے مجھ کو دکھائے تھے۔ اب ایک یہ زمانہ ہے کہ طرفین سے نامہ و پیام آتے جاتے ہیں۔ اِنشاءاللہ تعالیٰ وہ دن بھی آجائے گا کہ ہم تم باہم بیٹھیں اور باتیں کریں۔ قلم بیکار ہو جائے، زبان برسرِ گفتار آئے۔

انشاء اللہ خاں کا بھی قصیدہ میں نے دیکھا ہے۔ تم نے بہت بڑھ کر لکھا ہے اور اچھا

سماں باندھا ہے۔ زبان پاکیزہ، مضامین اچھوتے، معانی نازک، مطالب کا بیان دل نشیں۔ زیادہ کیا لکھوں۔

اپریل ۱۸۵۹ء [۲]

غالب

(۱۵)

شرطِ اسلام بود ورزشِ ایمان بالغیب
اے تو غائب زنظر، مہر تو ایمان من است

حلیۂ مبارک نظر افروز ہوا۔ جانتے ہو کہ مرزا یوسف علی خاں عزیز نے جو کچھ تم سے کہا، اُس کا منشا کیا ہے؟ کبھی میں نے بزمِ احباب میں کہا ہوگا کہ مرزا حاتم علی کے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ سنتا ہوں کہ وہ طرح دار آدمی ہیں اور بھائی تمھاری طرح داری کا ذکر میں نے مغل جان سے سنا تھا۔ جس زمانے میں کہ وہ نواب حامد علی خاں کی نوکر تھی اور اُس میں مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا تو اکثر مغل سے پہروں اختلاط ہوا کرتے تھے۔ اُس نے تمھارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھ کو دکھائے ہیں۔

بہ ہر حال، تمھارا حلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا۔ کس واسطے، میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اُس کی ستایش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے، ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آگئے کیا کہوں جی پر کیا گزری۔ بہ قول شیخ علی حزیں :

تا دسترسم بود، زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر

نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام۔ ملا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا، بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑہ، منہ پر ڈاڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی، اُسی دن سر منڈایا۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم کیا بک رہا ہوں۔

صاحب! بندے نے "دستنبو" جناب اشرف الامرا جارج فریڈرک ایڈمنسٹن[۲] صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی نذر بھیجی تھی۔ سو اُن کا فارسی خط محررۂ دہم مارچ مشتمل بر تحسین و آفرین و اظہارِ خوشنودی بطریقِ ڈاک آگیا۔ پھر میں نے تہنیت میں لفٹنٹ گورنری کے قصیدۂ فارسی بھیجا۔ اُس کی رسید میں نظم کی تعریف اور اپنی رضامندی پر متضمن خط فارسی بہ سبیلِ ڈاک مرقومہ چہار دہم آگیا۔ پھر ایک قصیدہ فارسی مدح و تہنیت میں جناب رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں بہ واسطۂ صاحب کمشنر بہادر دہلی بھیجا تھا۔ کل اُن کا مہری خط بہ ذریعۂ صاحب بہادر دہلی آگیا۔ پنشن کے باب میں ابھی کچھ حکم نہیں۔ اسباب توقع کے فراہم ہوتے جاتے ہیں۔ دیر آید درست آید۔ اناج کھاتا ہی نہیں ہوں۔ آدھ سیر گوشت دن کو اور پاؤ بھر شراب رات کو ملے جاتی ہے:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

اگر ہم فقیر سچے ہیں اور اس غزل کے طالب کا ذوق پکا ہے تو یہ غزل اس خط سے پہلے پہنچ گئی ہوگی۔ رہا سلام، وہ آپ پہنچا دیں گے۔

اواخر اپریل ۱۸۵۹ء

(۱۶)

جناب مرزا صاحب!

دلّی کا حال تو یہ ہے، شعر:

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر، سو ہے

یہاں دھرا کیا ہے جو کوئی لُوٹے گا۔ وہ خبر محض غلط ہے اگر کچھ ہے تو بدیں نمط ہے کہ چند روز چند گوروں نے اہلِ بازار کو ستایا تھا۔ اہلِ قلم اور اہلِ فوج نے بہ اتفاق رائے ہم دگر ایسا بندوبست کیا کہ وہ فساد مٹ گیا۔ اب امن و امان ہے۔

ناسخ مرحوم جو تمھارے اُستاد تھے میرے بھی دوست صادق الوداد تھے، مگر یک فنے تھے۔ صرف غزل کہتے تھے۔ قصیدے اور مثنوی سے اُن کو کچھ علاقہ نہ تھا۔ سُبحان اللہ تم نے قصیدے میں وہ رنگ دکھایا کہ انشا کو رشک آیا۔ مثنوی کے اشعار جو میں نے دیکھے، کیا کہوں کیا حظ اٹھایا۔ بیت:

خدا سے میں بھی چاہوں از رہِ مہر
"فروغِ میرزا حاتم علی مہر"

اگر اسی انداز پر انجام پائے گی تو یہ مثنوی کارنامۂ اُردو کہلائے گی۔ خدا تم کو جیتا رکھے۔ تمھارا دَم غنیمت ہے۔ صاحب! میں تم سے پوچھتا ہوں کہ "معیار الشعرا" میں تم نے اپنا خط کیوں چھپوایا؟ تمھارے ہاتھ کیا آیا؟ سنو تو سہی اگر سب کا کلام اچھا ہو تو امتیاز کیا رہے؟

۶ اپریل ۱۸۵۹ء

(۱۷)

مرزا صاحب!

ہم کو یہ باتیں پسند نہیں پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی ہے۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانعِ فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو۔ شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے، کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے کیسی اشک

فشانی۔ کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجالاؤ۔ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو "چنا جان" نہ سہی "منا جان" سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے، اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجا منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ! چشم بددُور وہی ایک حور، بھائی ہوش میں آؤ، کہیں اور دل لگاؤ۔ بیت:

زنِ نو کن اے دوست در ہر بہار
کہ تقویم پارینہ ناید بکار

مرزا مظہر کے اشعار کی تضمین کا مسدس دیکھا۔ فکر سراپا پسند، ذکر بہمہ جہت ناپسند، اپنے نام کا خط مع اُن اشعار کے مرزا یوسف علی خاں عزیز کے حوالے کیا۔

مکرمی نواب محمد علی خاں صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں۔ پروردگار اُن کو سلامت رکھے۔ مولوی عبدالوہاب صاحب کو میرا سلام۔ دم دے کے مجھ سے فارسی عبارت میں خط لکھوایا۔ میں منتظر رہا کہ آپ لکھنؤ جائیں گے، وہ عبارت جناب قبلہ و کعبہ کو دکھائیں گے۔ اُن کے مزاجِ اقدس کی خیر و عافیت مجھ کو رقم فرمائیں گے۔ میں کیا جانوں کہ حضرت میرے وطن میں جلوہ افروز ہیں:

یار در خانہ و ما گردِ جہاں میگردیم

اب مجھے اُن سے یہ استدعا ہے کہ دستخطِ خاص سے مجھ کو خط لکھیں اور لکھنؤ نہ جانے کا سبب اور جناب قبلہ و کعبہ کا حال جو کچھ معلوم ہو وہ اُسی خط میں درج کریں۔

جون ۱۸۶۰ء غالب

(۱۸)

جناب مرزا صاحب۔ آپ کا غم افزا نامہ پہنچا۔ میں نے پڑھا۔ یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔

انھوں نے جو میرے سامنے اس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا۔ یعنی اُس کی اطاعت اور تمھاری اُس سے محبت، سخت ملال ہوا اور رنج کمال ہوا۔ سنو صاحب شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں، یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جاوے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اُس کے سامنے مری تھی۔ تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری، بلکہ تم اُس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی مغلچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں، اُس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی "مغلچہ" ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا اُن دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی، کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں۔ مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ با آں کہ یہ کوچہ چھٹ گیا۔ اس فن سے میں بیگانۂ محض ہو گیا۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اُس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمھارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور اب ہنگامۂ عشقِ مجازی چھوڑو۔ بیت:

سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی
عشقِ محمدؐ بس است و آلِ محمدؐ

اللہ بس، ماسوا ہوس

جون ۱۸۶۱ء غالب

(۱۹)

صاحب میرے!

عہدۂ وکالت مبارک ہو۔ موکلوں سے کام لیا کیجے، پریوں کو تسخیر کیا کیجے۔ مثنوی پہنچی۔ جھوٹ بولنا میرا شعار نہیں، کیا خوب بول چال ہے۔ انداز اچھا، بیان اچھا، روزمرہ صاف، حبشنوں کا استغاثہ کیا کہوں کیا مزا دے رہا ہے:

بگم صاحب پھسوڑے میں پھنسایا
چھٹا بیگم نے بے حرمت کرایا!

اِس مثنوی نے اگلی مثنویوں کو تقویم پارینہ کر دیا۔ "بیانِ بخشایش" ہم گنہ گاروں تک کیوں پہنچے گا۔ مگر ہاں اِس راہ سے :

کہ مستحقِ کرامت گناہ گار انند

بخشش کا متوقع ہوں، میں ابھی تک یہ بھی نہیں سمجھا کہ وہ نسخہ نظم ہے یا نثر ہے اور مضمون اُس کا کیا ہے ؟

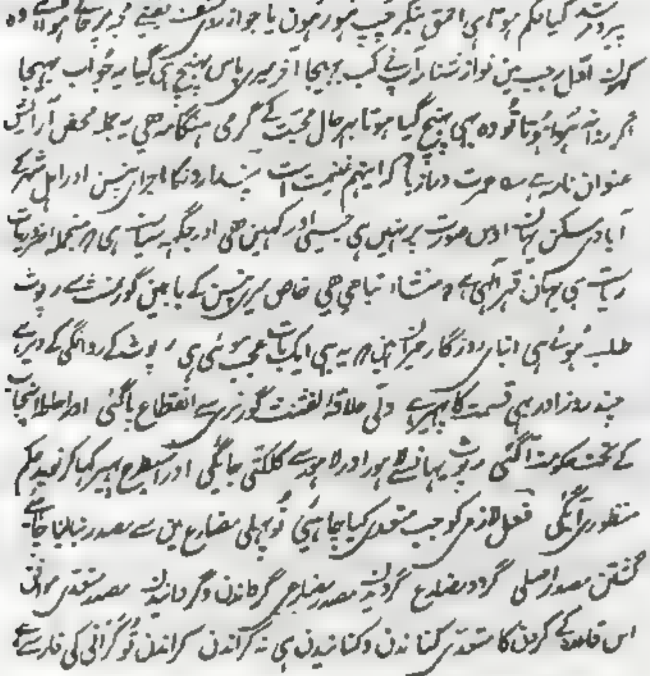
مرزا یوسف علی خاں آٹھ آٹھ دس دس مہینے سے مع عیال و اطفال اسی شہر میں مقیم ہیں۔ ایک ہندو امیر کے گھر پر مکتب کا ساطور کر لیا ہے۔ میرے مسکن کے پاس ایک مکان کرایے کو لے لیا ہے، اُس میں رہتے ہیں، اگر اُن کو خط بھیجو تو میرے مکان کا پتا لکھ دینا اور یہ بھی آپ کو معلوم رہے کہ میرے خط کے سرنامے پر محلے کا نام لکھنا ضرور نہیں۔ شہر کا نام اور میرا نام قصہ تمام ۔ ہاں یارِ عزیز کے خط پر میرے مکان کے قریب کا پتا ضرور ہے۔

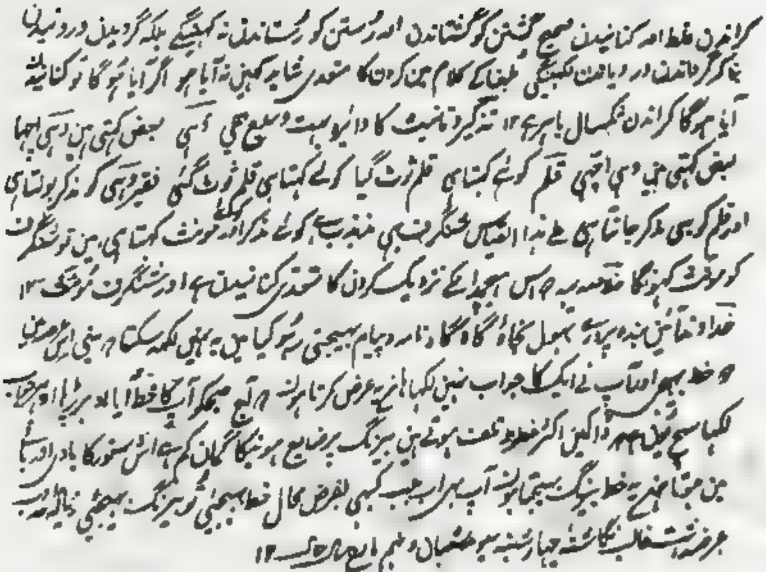
دو روز سے "شعاعِ مہر" کو دیکھ رہے ہیں۔ اکثر تمھارا ذکرِ خیر رہتا ہے۔ وہ تو اب ہر وقت یہیں تشریف رکھتے ہیں۔ رات کو تو پہر چھے گھڑی کی نشست ہر روز رہتی ہے۔ ابھی یہیں سے اُٹھ کر مکتب کو گئے ہیں تم کو سلام کہتے ہیں اور "شعاعِ مہر" کے مداح اور "بیانِ بخشایش" کے مشتاق ہیں۔

جنوری سنہ ۱۸۶۱ء

مولانا محمد نعیم الحق آزاد

(۱)


پیر و مرشد کیا حکم ہوتا ہے احمق بنکر چپ ہو رہوں یا جواز مدعی کشف تعینے محرر جاء ہوتے وہ
کمترین اقبال جب میں نواز نستار آپنے کب بھیجا آخر میرے پاس پہنچ ہی گیا یہ جواب بھیجا
اگر رستہ میں ہوا ہوتا تو وہ بھی پہنچ گیا ہوتا بہر حال محبت کے گرمی ہنگامہ بھی یہ جملہ محض آرائش
عنوان نامہ ہے بس صورت دماغ پا کر اپنی ہم غنیمت ہے آپ ہمارے ذکا اجزائے جنس اور اہل شہر کے
آبادی مسکن بنایا اور صورت یہ نہیں ہے جیسی اور کہیں بھی اور جگہ بنایا ہے از منجملہ اخریات
ریاست ہی یہاں قہر الٰہی ہے دہشتا تباہی بھی خاص کر یہ جنس کہ باہمی گورنمنٹ سے روش
طلب ہوتے ہی انبار روزگار مرا آتش ہوا یہ بھی ایک بات عجب سی ہے روش کے روانگی کہ در پے
چند روز اور بھی قسمت کا پھیر ہے دلی علاقہ لفٹنٹ گورنر سے انقطاع پا گئی اور اطلاع پنجاب
کے تحت حکومت آگئی روش یہاں سے پور اور لاہور سے کلکتی جا لگی اور اسطرح پھیر کیا کرنید حکم
منظور ہو گئی فعل لازمی کو جب متعدی کیا چاہیے تو پہلے مضارع میں سے مصدر بنایا جائے
گشتن مصدر اصلی گردد مضارع گردانیدن مصدر مضارعی گرداندن و گردانیدن مصدر متعدی ہوتی
اس قاعدہ کے گردن کا متعدی گرداندن و گردانیدن ہے گرانیدن گراندن تو گرانی کی قدر سے
جیسے چلنے کے فارسے چلانیے ماورہ شوخی طبع و ظرافت ہے تاسمیں سمجھتے نہ لطف ہے


گرامر و غلط اور کنایہ صحیح گفتن کو گفتاندن اور رستن کو رستاندن نہ کہیئے بلکہ گردیدن و رویدن
بناکر گرداندن اور رویاندن لکھیئے طبعا کے کلام میں گرو دن کا متعدی شاید کہیں نہ آیا ہو اگر آیا ہوگا تو کنایۃً
آیا ہوگا گرداندن ٹکسال باہر ہے ۱۲ تذکیر و تانیث کا دائرہ بہت وسیع بھی ہے بعض کہتے ہیں دہی اچھا
بعض کہتے ہیں وہی اچھی قلم کو نے کہتا ہے قلم ٹوٹ گیا کوئی کہتا ہے قلم ٹوٹ گئی فقیر دہی کو مذکر بولتا ہے
اور قلم کو بھی مذکر جانتا ہے البتہ شنگرف بھی متذبذب ہے کوئی مذکر اور کوئی مونث کہتا ہے میں تو شنگرف
کو مونث کہونگا مقصد یہ ہے کہ اس ہیچمدان کے نزدیک گردن کا متعدی کتا نیدن ہے اور شنگرف مونث ہے ۱۲
خداوند نعمت بندہ پرور ہیں بھول گئے کہ ادھر سے نامہ و پیام بھیجنے میں دیر ہوگیا میں یہ نہیں لکھ سکتا ہوں کہ
خط بھیجا اور آپ نے ایک کا جواب نہیں لکھا ہاں یہ عرض کرتا ہوں کہ آج مجھکو آپ کا خط آیا اور پڑھا اور جواب
لکھا سچ تو یہ ہے کہ اکثر خطوط تلف ہوتے ہیں بیرنگ پر ضایع ہونیکا گمان کم ہے
میں جواب ہے یہ خط بیرنگ بھیجتا ہوں آپ بھی ایسا ہی جب کبھی بالفرض محال خط بھیجیں تو بیرنگ بھیجیں
مرقومۂ غالب نگاشتہ چہارشنبہ سیوم شعبان ۱۲

پیر و مرشد!

کیا حکم ہوتا ہے، احمق بن کر چپ ہو رہوں یا جو از روے کشفِ یقینی مجھ پر حالی ہوا ہے، وہ کہوں۔ اوّل رجب میں نوازش نامہ آپ نے کب بھیجا؟ آخر میرے پاس پہنچ ہی گیا یہ جواب بھیجا' اگر روانہ ہوا ہوتا تو وہ بھی پہنچ گیا ہوتا۔ بہ ہر حال محبت کی گرمیِ ہنگامہ ہے۔ یہ جملہ محض آرایشِ عنوان نامہ ہے:

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است

پنسداروں کا اجراے پنسن اور اہلِ شہر کی آبادی مسکن یہاں اُس صورت پر نہیں ہے جیسی اور کہیں ہے۔ اور جگہ سیاست ہے کہ منجملۂ ضروریاتِ ریاست ہے، یہاں قہرِ الٰہی ہے کہ منشاے تباہی ہے خاص میرے پنسن کے باب میں گورمنٹ سے رپوٹ طلب ہوئی ہے۔ ابناے روزگار حیران ہیں کہ یہ بھی ایک بات عجیب ہوئی ہے۔ رپوٹ کی روانگی کی دیر ہے چند روز اور بھی قسمت کا پھیر ہے۔ دلّی علاقۂ لفٹنٹ گورنری سے انقطاع پاگئی اور احاطہ پنجاب کے تحت حکومت آگئی۔ رپوٹ یہاں سے لاہور اور لاہور سے کلکتے جائے گی اور اسی طرح پھیر کھاکر نویدِ حکمِ منظوری آئے گی۔

فعل لازمی کو جب متعدی کیا چاہیے تو پہلے مضارع میں سے مصدر بنالینا چاہیے۔ "گشتن" مصدرِ اصلی "گرود" مضارع "گردیدن" مصدرِ مضارعی "گرداندن" و "گردانیدن" مصدر متعدی۔ موافق اس قاعدے کے "کردن" کا متعدی "کناندن" و "کنانیدن" ہے۔ نہ "کراندن"۔ "کراندن" تو کرانے کی فارسی ہے۔ جیسے "چلنے کی فارسی" چلیدن" اور یہ شوخیِ طبع و ظرافت ہے۔ نہ اِس میں صحت ہے نہ لطافت ہے۔ "کراندن" غلط اور "کنانیدن" صحیح۔ "گشتن" کو "گشتاندن" اور "رُستن" کو "رُستاندن" نہ کہیں گے بلکہ "گردیدن" و "روئیدن" بناکر "گرداندن" و "رویاندن" لکھیں گے۔ بلغا کے کلام میں "کردن" کا متعدی شاید کہیں نہ آیا ہو۔ اگر آیا ہوگا تو "کنانیدن" آیا ہوگا۔ "کراندن" ٹکسال باہر ہے۔

تذکیر و تانیث کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ "دہی" بعض کہتے ہیں "دہی اچھا" بعض کہتے ہیں "دہی اچھی"۔ "قلم" کوئی کہتا ہے "قلم ٹوٹ گیا"۔ کوئی کہتا ہے "قلم ٹوٹ گئی"۔ فقیر "دہی" کو مذکر بولتا ہے اور "قلم" کو بھی مذکر جانتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ "شنگرف" بھی مذبذب ہے۔ کوئی مذکر اور کوئی مونث کہتا ہے۔ میں تو شنگرف کو مونث کہوں گا۔ خلاصہ یہ کہ اس ہیچمدان کے نزدیک "کردن" کا متعدی "کنانیدن" ہے اور "شنگرف" مونث۔

خداوندا! آئینِ بندہ پروری بھول نہ جاؤ، گاہ گاہ نامہ و پیام بھیجتے رہو۔ کیا میں یہ نہیں لکھ سکتا کہ میں نے اس عرصے میں دو خط بھیجے اور آپ نے ایک کا جواب نہیں لکھا۔ ہاں یہ عرض کرتا ہوں کہ آج صبح کو آپ کا خط آیا، اِدھر پڑھا اُدھر جواب لکھا۔ سچ یوں ہے کہ ڈاک میں اکثر خطوط تلف ہوتے ہیں۔ بیرنگ پر ضائع ہونے کا گمان کم ہے۔ اس دستور کا بادی اور بانی میں ہوتا ہوں، یہ خط بیرنگ بھیجتا ہوں۔ آپ بھی اب جب کبھی بہ فرضِ محال خط بھیجیے تو بیرنگ بھیجیے۔ زیادہ حدِ ادب

نگاشتہ چہار شنبہ سیوم شعبان سنہ ۱۲۷۵ھ

ونہم مارچ سالِ حال سنہ ۱۸۵۹ء

عرضداشت غالب

(۲)

بندہ پرور!

آج میں نے وہ انگریزی عرضی روانہ کردی اور صبح کو آپ کا کہار مسودہ اور میرے محسن کا رقعہ آپ کے نام کا مجھ کو دے گیا۔ اس عنایت کے شکر میں، کیا خدمت بجا لاتا۔ بارے ایک رباعی بھیجتا ہوں۔ اس کو آپ پڑھ کر اور لطف اُٹھا کر، راجا صاحب کی خدمت میں بھجوا دیجے۔

"امید بہ تشدیدِ میم و تخفیفِ میم دونوں طرح مستعمل ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جنابِ ممدوح اس کو زحاف سمجھیں۔ پہلے اور دوسرے مصرع میں بہ تخفیفِ میم ہے اور تیسرے مصرع کا میم مشدّد ہے۔

غالب

فرقانی میرٹھی

[illegible]

قافیہ کیا ہے نہ ایک جگہ بلکہ دو جگہ نہ ایک قاآنی نے بلکہ بہت
اساتذہ نے بھلا میں تم سے پوچھتا ہوں آب کجا شراب کجا
کے ساتھ تابکجا کا قافیہ جائز رکھوگے یقین ہے نہ رکھوگے
اب ہم نہ حافظ پر اعتراض کریںگے نہ اس امر خاص میں تتبع کر
سکتے ہیں قصہ مختصر میں نے مانا قاطع القاطع نے ان دو فاؤں
میں ایک اعتراض دفع کیا آگے کیا کریگا اور دفع اعتراض بھی
اس طرح سوا ایک شخص کے دوسرے کے کلام سے سند نہ لیا
داد کا طالب غالب

واقعی فخر گرگانی نے لکھا ہے اور اُس کا قول سند مکمل ہے لیکن یہ معلوم رہے کہ متقدمین ازراہِ تحکم وزبردستی بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔ متاخرین نے ترک کر دیا ہے، جیسے میرو مرزا" لہو" کو "لوہو" اور طرف کے مرادف "اور" بہ وزن "شور" لکھتے تھے، متاخرین نے ترک کر دیا۔

بھائی! میں کیا کہوں، یہ بزرگوار کیا کیا کچھ کہہ گئے ہیں۔ ماقبل شین مصدری مکسور ہوتا ہے۔ "نازش" و "سازش" اور اس کے نظائر بہت ہیں۔ خاقانی کے ہاں "کاہش" "حاصل بالمصدر" کا ستش کا اور "نگاہش" "ضمیر کے شین کے ساتھ قافیہ کیا ہے۔ نہ ایک جگہ بلکہ سو جگہ، نہ ایک خاقانی نے بلکہ بہت اساتذہ نے۔

بھلا، میں تم سے پوچھتا ہوں "آب کجا" "شراب کجا" کے ساتھ "تا بہ کجا" کا قافیہ جائز رکھو گے؟ یقین ہے کہ نہ رکھو گے۔ اب ہم نہ حافظ پر اعتراض کریں گے، نہ اس امرِ خاص میں تتبع کر سکتے ہیں۔ قصہ مختصر، میں نے مانا "قاطع القاطع" نے دو سو فاقوں میں ایک اعتراض دفع کیا۔ آگے کیا کرے گا؟ اور دفعِ اعتراض اس طرح کہ سوائے ایک شخص کے دوسرے کے کلام سے سند نہ ملے۔

۱۸۶۶ء

دادکا طالب۔ غالب

مولانا عبّاس رفعت

(۱)

حضرت قصیدۂ حمد کا کیا کہنا ہے میں لسان کم عواطفی اور قواعد سے اچھی
طرح آشنا نہیں فارسی اشعار میں جا بجا الفاظ میں اختلاف تھا
اسکو درست کر دیا ۔۔ آپکا کرم نامہ آیا کہ میں نے اسکا جواب نہیں
لکھا یہ خط کل مجھے ملا یا آج جواب بھیجا یا اور ہمیشہ ایسا ہی ہوگا ۔۔
شغل نگارش نظم و نثر مدت سے متروک ہے نثر یہ ہے کہ کمزوری ضمیر تو زبان
اُردو سے حوالۂ قلم کرنا ہوتا میرا ہر خط مکالمہ ہے نہ کہ سلسلہ نظم قسم تو اگر
دل میں خیال بھی گزرتا ہو کہ کہا جاتا ہے کہنا کیسا ہی
نقلیں انکی بد قلمی بہت سی ہو گئی ہیں میں نے دیکھی ہے جس پر لکھا
مفتی محمد قلی مرحوم کی تصنیف ہے تو میری نظر سے بھی گزری تھی مگر
میں نے سنا ہے مولوی محمد باقر مرحوم نے اپنے مطبع میں اسکو چھاپا تھا مگر
کتاب فروشوں سے کہہ دونگا اگر دستیاب ہو تو آپکی خدمت میں بھیج دونگا
والسلام مع الاکرام جمعہ ۲۴ محرم ۲ ماہ اگست سال سینتالیس فیض نسب

حضرت !

قصیدۂ عربی کا کیا کہنا ہے، میں اس لسان کے غوامض اور قواعد سے اچھی طرح آشنا نہیں، فارسی اشعار میں جہاں جہاں املا یا انشا میں اختلاف تھا، اُس کو درست کر دیا۔

آپ کا کون سا خط آیا کہ میں نے اُس کا جواب نہیں لکھا۔ یہ خط کل میں نے پایا، آج جواب بھجوایا اور ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔

شغلِ نگارشِ نظم و نثر مدت سے متروک ہے۔ نثر یہ کہ مکنونِ ضمیر کو زبانِ اُردو سے حوالۂ قلم کرتا ہوں۔ میرا ہر خط مکالمہ ہے نہ مراسلہ، نظم، قسم لو، اگر دل میں خیال بھی گزرتا ہو کہ کہا چاہیے، کہنا کیسا۔

"تقلیب المکاید" قلمی بہت دن ہوئے کہ میں نے دیکھی ہے۔ جب میرٹھ میں مفتی محمد قلی خاں مرحوم نے تصنیف کی تھی تو میری نظر سے بھی گزری تھی۔ پھر میں نے سنا کہ مولوی محمد باقر مرحوم نے اپنے مطبع میں اُس کو چھاپا۔ بہ ہر حال کتاب فروشوں سے کہہ دوں گا، اگر آجائے گی تو آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔

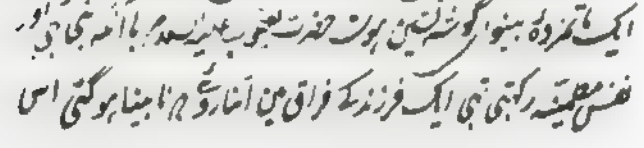
والسلام مع الاکرام

جمعہ، ۲۴ محرم سنہ ۱۲۷۸ھ[۲]

۲ ماہ اگست سال رستاخیز سنہ ۱۸۶۱ء غالب

۱۲۷۸

(۲)


صاحب میرے کرم فرما میرے قدر شناس [illegible] ستائش کے نہیں ہوں
ایک ماتم زدہ بینوا گوشہ نشین ہوں حضرت یعقوب علیہ السلام با آنکہ نبی تھے اور
نفس مطمئنہ رکھتے تھے ایک فرزند کے فراق میں اتنا روئے کہ نابینا ہو گئے اس

طغیان قلزم خون میں میرے ہزار معشوق ایسے ڈوبے کہ اونکا پتا نہیں ملتا کہ
کیا ہو گئے ہزار آدمی کا ماتمدار ہوں چالیس چالیس پچاس پچاس برس کے یار
بچھڑ گئے کوئی مجھکو باپ کہتا تھا کوئی مرشد جانتا تھا سب کہاں کچھ لالہ و گل
میں نمایاں ہو گئیں صورتیں کیا خاک میں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں یاد تھیں ہمکو
بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں بہر حال
ایک مردۂ متحرک ہوں ایک پانو رکاب میں ایک پانو زمین پر ارجعی الی ربک
کی آواز دلنواز کا منتظر ہاں خدمتگزاری احباب میں قاصر ہوں استجازت
کی حاجت نہیں جب چاہیئے مسودات اپنے بھیجدیجئے میں بعد حک و اصلاح
بھیجدیا کرونگا یہ آپنے بڑی مہربانی فرمائی کہ اپنے مسکن کا پتا لکھدیا ورنہ
میں ارسال جواب میں متحیر اور متردد رہتا مرزا یوسف علی خاں آپکو سلام کہتے
ہیں نجات کا طالب غالب"

صبح یکشنبہ ۴ ربیع الثانی و ۲۴ نومبر سال حال

صاحب میرے، کرم فرما میرے، قدرداں میرے، میں قابل کسی ستایش کے نہیں ہوں۔ ایک ماتم زدہ بے نوائے گوشہ نشیں ہوں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام باآں کہ نبی تھے اور نفسِ مطمینہ رکھتے تھے، ایک فرزند کے فراق میں اتنا روئے کہ نابینا ہو گئے۔ اس طغیانِ قلزمِ خوں میں میرے ہزار معشوق ایسے ڈوبے کہ اُن کا پتا نہیں ملتا کہ کیا ہو گئے۔ ہزار آدمی کا ماتم دار ہوں۔ چالیس چالیس، پچاس پچاس برس کے یار بچھڑ گئے۔ کوئی مجھ کو باپ کہتا تھا، کوئی مرشد جانتا تھا:

سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں
صورتیں کیا خاک میں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

بہ ہر حال ایک مردۂ متحرک ہوں۔ ایک پاؤں رکاب میں ایک پاؤں زمین پر۔ ارجعی الی ربک کی آوازِ دلنواز کا منتظر۔ ہاں خدمت گزاریِ احباب میں حاضر ہوں۔ استجازت کی حاجت نہیں۔ جب چاہیے مسودات اپنے بھیج دیجیے۔ میں بعد حک و اصلاح بھیج دیا کروں گا۔

یہ آپ نے بڑی مہربانی فرمائی کہ اپنے مسکن کا پتا لکھ دیا ورنہ میں ارسالِ جواب میں متحیر اور متردد رہتا۔ مرزا یوسف علی خاں آپ کو سلام کہتے ہیں۔

صبح یکشنبہ ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۷۸ھ

۱۰ نومبر سالِ حال ۱۸۶۱ء نجات کا طالب غالب

محمود مرزا

برخوردار اقبال نشان محمود میرزا کو دعا پہنچے بھائی مین تمہارا خط دیکھہ کر بہت
خوش ہوا خط تمہارا اچھا ہے خدا کرے خط سرنوشت بھی اچھا ہو خدا کی قسم تمہارے سہرے کے
دیکھنے کی بہت خوشی تھی مگر نہ آسکا اگر جیتا رہا اور اسباب نے مساعدت کی تو اکتوبر
مہینے جاڑو نمین آؤنگا اور تم لوگونکو دیکھونگا ۱۲

پھوڑا اب اچھا ہو گیا ہے خاطر جمع رکھو چھ مہینے کی دقت رہ گئی تھی پہلے جو دفع ہو گئی
اب بڑھاپے مین وہ پھر کہان سے آئی بیٹا تیرے سر کی قسم اگر مین لنگ باندھے ہوئے ننگا
بیٹھا ہون تو میری شکل آکہہ کر بڑھیا کے سے ہو گئی شاید ہو لکے چھوکرے سے اور جاؤ جب
مجکو دیکھو گے تب جانو گے کہ کیا حال ہے ۱۲

تمہارے چچا اللہ میان کی سست خود پرست جندی ہی بات ہے کچھ سمجھتے ہی نہیں کچھ نہ اخبار کا مطلب
سمجھیں نہ میرا حال نہ میرا مقدمہ نہ جو کچھ واقع ہوا اوسکو سمجھے اب مین نے اونکو ایک خط جداگانہ
لکھا ہے اپنی طرف سے اظہار حال مین کوئی دقیقہ باقی نہین رکھا خدا کرے سمجھ جائین لیکن
مجھے توقع نہیں ہے کہ سمجھیں ۱۲

تم نے اپنی والدہ کے اور اپنے بھائی کے اور خداداد اور رفیع الدین کے خیر و عافیت نہ لکھی اب
جو اس خط کا جواب لکھو تو اون سب کی خیر و عافیت لکھو غالب سہ شنبہ ۲۲ ذی الحجہ سال حال

برخوردار، اقبال نشان محمود مرزا کو دعا پہنچے۔ بھائی میں تمھارا خط دیکھ کر بہت خوش ہوا۔
خط تمھارا اچھا ہے۔ خدا کرے خطِ سرنوشت بھی اچھا ہو۔ خدا کی قسم تمھارے سہرے کے دیکھنے کی

بہت خوشی تھی مگر نہ آسکا۔ اگر جیتا رہا اور اسباب نے مساعدت کی تو اکتوبر نومبر یعنی جاڑوں میں آؤں گا اور تم لوگوں کو دیکھوں گا۔

پھوڑا اب اچھا ہوگیا ہے۔ خاطر جمع رکھو۔ چھے مہینے کی دن رات کی ٹیس نے جو روح تحلیل کی ہے، اب بڑھاپے میں وہ پھر کہاں سے آئے۔ بیٹا تیرے سر کی قسم، اگر میں لنگ باندھے ہوئے ننگا بیٹھا ہوں تو میری شکل آکھ کی بڑھیا کی سی ہوگی۔ شاید ہوا کے جھوکے سے اُڑ جاؤں۔ جب مجھ کو دیکھو گے تب جانو گے کہ کیا حال ہے۔

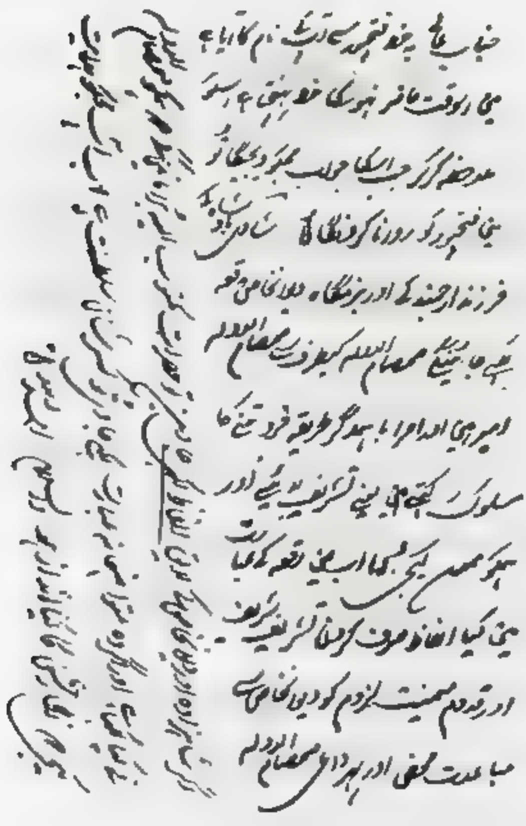
تمھارے چچا اللہ میاں کے مست خود پرست بندے ہیں۔ بات ہے کچھ، سمجھتے ہیں کچھ نہ اخبار کا مطلب سمجھے، نہ میرا حال، نہ میرا مقدمہ، نہ جو کچھ واقع ہوا اُس کو سمجھے۔ اب میں نے اُن کو ایک خط جداگانہ لکھا ہے۔ اپنی طرف سے اظہارِ حال میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ خدا کرے سمجھ جائیں لیکن مجھے توقع نہیں کہ سمجھیں۔

تم نے اپنی والدہ کی اور اپنی بھاوج کی اور خدا داد اور رفیع الدین کی خیر و عافیت نہ لکھی۔ اب جو اس خط کا جواب لکھو تو اُن سب کی خیر و عافیتیں لکھو۔

سہ شنبہ، ۲۳ ذی قعدہ، ۱۲۷۹ھ[۲]

۱۳ مئی سالِ حال ۱۸٦۳ء غالبؔ

عبدالحق



جنابِ عالی!

یہ خط فتح پور سے آپ کے نام کا آیا ہے' میں اس وقت حاضر نہ ہوسکا، خط بھیجتا ہے۔ اس کو ملاحظہ کر کر جب اس کا جواب مجھ کو دیجیے گا تو میں فتح پور کو روانہ کروں گا۔

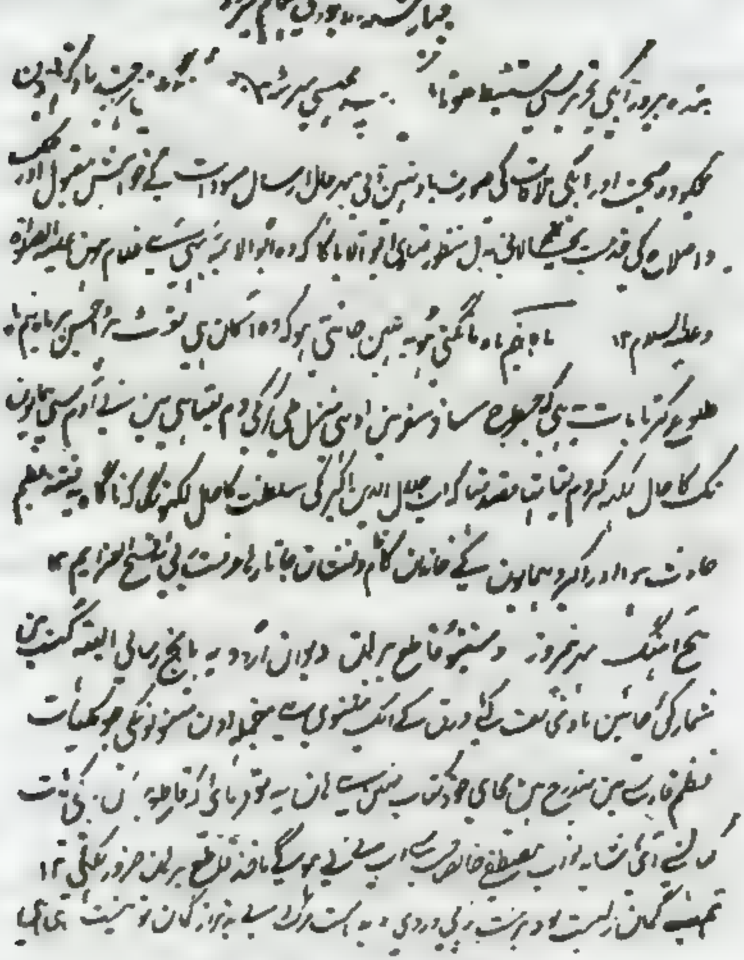
شادی بادشاہ کے فرزندِ ارجمند کی اور بزم گاہ دیوانِ خاص' رقعے لکھے جائیں گے صمصام الدولہ

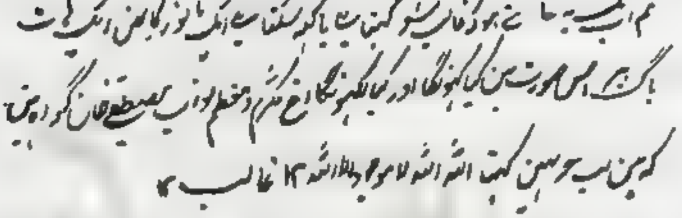
کی طرف سے صمصام الدولہ امیر ہیں اور امرا باہم دگر طریقۂ فروتنی کا سلوک رکھتے ہیں یعنی تشریف لایئے اور ہم کو ممنون کیجے۔ پس اب میں رقعے کی عبارت میں کیا الفاظ صرف کروں؟ تشریف شریف اور قدومِ میمنت لزوم کو دیوانِ خاص سے مباعدتِ محض اور پھر داعی صمصام الدولہ اگر شہزادے اور دیوانِ خاص کے لائق الفاظ لکھے جاویں تو حضرات مکتوب الیہ بُرا مانیں گے کہ ہم کو صمصام الدولہ نے کیا لکھا ہے اور اگر وہ متواضعانہ عبارت لکھی جاوے تو کسرِ شانِ سلطنت ہے۔ اب آپ مجھ کو ہدایت کیجے کہ نگارش کا کیا انداز ہو۔ والسلام۔

اسد اللہ

۱ مئی، ۱ مارچ ۱۸۵۲ء

حکیم محب علی




تم اب تک یہ جانتے ہو کہ غالب شعر کہتا ہے یا کہہ سکتا ہے ایک پاؤں رکاب میں ایک ہاتھ
باگ پر۔ اس صورت میں کیا کہوں گا اور کیا لکھوں گا اخ مکرم و معظم نواب مصطفےٰ خاں گواہ ہیں
کہ میں اب شعر نہیں کہتا اللہ اللہ لاموجود الا اللہ ۱۲ غالب ۱۲

بندہ پرور! آپ کی تحریر سے مستنبط ہوتا ہے کہ آپ مجھ سے میرٹھ میں ملے تھے مگر میں ہر چند یاد کرتا ہوں مجھ کو وہ صحبت اور آپ کی ملاقات کی صورت یاد نہیں آتی۔ بہرحال ارسالِ سوادِ کی خواہش مقبول اور حک و اصلاح کی خدمت بجالانی بہ دل منظور۔ تمھارے ابو الآباء کا کہ وہ ابو الائمہ بھی ہے، غلام ہوں، علیہِ الصّلوٰۃُ وعلیہِ السّلامُ۔

"ماہِ نیم ماہ" مانگتے ہو۔ یہ نہیں جانتے ہو کہ وہ آسمان ہی ٹوٹ پڑا، جس پر ماہِ نیم ماہ طلوع کرتا۔ بات یہ ہے کہ جس طرح مسافر سفر میں آدھی منزل طے کر کے دم لیتا ہے۔ میں نے آدم سے ہمایوں تک کا حال لکھ کر دم لیا تھا۔ قصد تھا کہ اب جلال الدین اکبر کی سلطنت کا حال لکھوں گا کہ ناگاہ یہ فتنۂ عظیم حادث ہوا اور اکبر و ہمایوں کے خاندان کا نام و نشان جاتا رہا۔ عَرَفْتُ رَبّی بِفَسْخِ العَزائِم "پنج آہنگ" "مہرِ نیمروز" "دستنبو" "قاطعِ برہان" "دیوانِ اردو" یہ پانچ رسالے البتہ کتب میں شمار کیے جائیں۔ "بادِ مخالف" کئی ورق کی ایک مثنوی ہے۔ منجملہ اُن مثنویوں کے، جو "کلیاتِ نظمِ فارسی" میں مندرج ہیں۔ بجائے خود کتاب نہیں ہے۔ ہاں یہ تو فرمائیے کہ "قاطعِ برہان" آپ کے ہاتھ کہاں سے آئی؟ شاید نواب مصطفےٰ خاں صاحب سے آپ نے لی ہو گی۔ ماخذِ "قاطعِ برہان" ضرور لکھیے۔

گمانِ زیست بود بر منت ز بے دردی
بد است مرگ و لے بدتر از گمانِ تو نیست

ہے ہے! تم اب تک یہ جانتے ہو کہ غالبؔ شعر کہتا ہے یا کہہ سکتا ہے۔ ایک پاؤں رکاب میں، ایک ہاتھ باگ پر۔ اس صورت میں کیا کہوں گا اور کیا لکھوں گا؟ اخ مکرم و معظم نواب مصطفےٰ خاں گواہ ہیں کہ میں اب شعر نہیں کہتا۔ اللہ اللہ لَاموجُودَ اِلّااللہُ۔

چہار شنبہ ۱۸ جنوری ہنگامِ نیمروز؟ — غالبؔ ۱۲

مولوی ضیاء الدّین خاں ضیا دہلوی

بخدمت مولوی صاحب معظم و مسلم جناب عرب و عجم مولوی ضیاء الدین خاں صاحب دہلوی ممبر آنریبل کمیشن)

جناب مولوی صاحب میں نے ایام الطفولیت نسبی میں شرح ملّا تک پڑھا تھا جب کہ لڑکپن اور اوائل جوانی کو [illegible]

نحو و منطق کی راہ میں منہمک ہو گیا فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا ناگاہ ایک

شخص وارد شہر ہوا جو ساسان پنجم کی نسل میں سے تھا منطق و فلسفہ میں مولانا فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن

موحد و موبد صافی تھا میرے شہر میں وارد ہوا اور لغات فارسی بحث اور غوامض فارسی آمیختہ ہو جاتا

اوس سے میرا جانا ہوتے سوناگہ بر جزو گیا ذہن متوجہ تھا زبان دری سے ہو نزدیکی اور اُستاد با مبالغہ

تا ماسب عہد و بزرگ جمہور تھا حقیقت اس زبان کی دلنشین و خاطر نشان ہو گئی"

اہل پارس جو قدم عالم کے قائل ہیں وہ مثل ہنود کے آفرینش عالم کا آغاز و انجام و معروف نہیں تب

ہمارے مذہب کے موافق بھی کیومرث وغیرہم کی سلطنت کو دو چار ہزار برس سے کم نہ گزرے ہونگے تاکہ اور

نجوم اور طب اور فقہ اور انشا اور انشاد کونسا علم اور کونسا فن ہوگا جو اوس گروہ میں نہ ہوگا سکندر جب

ایران پر مسلط ہوا تو ارسطو نے کتابخانہ دارا سے بہت سے علوم یونانی زبان میں نقل کئے الغرض اوس

گروہ کو کبھی جنکا کلام علم حکمت میں حکمای یونان کا ماخذ ہو اگر ابو علی سینا و ابو نصر [illegible] کتابخانہ

سے کتب حکمای یونانیہ لیکر مطالب حکمی کو زبان عربی میں نقل نکرتا تو اونکا بر عربی سوا مسائل فقہیہ [illegible]

علم معقول کا نشان نہ پایا جاتا"

دو تین ہزار برس قبل آج سے کہ عرب و عجم بیگانہ محض تھے اہل پارس اپنی لغات علم بلکہ علوم منقولہ کو

کس زبان میں شرح کیا کرتے تھے اور تعلیم و تعلّم و سوال و جواب کا مدار کن الفاظ پر ہوگا بےشبہہ وہ الفاظ

پارسی ہونگے جب خلیفہ ثانی کے عہد میں یزدجرد مارا گیا اور پارس پر اعراب مسلط ہوئے درفش کاویانی

کا جواہر آمود چیرا پارہ پارہ ہو کر غازیان اسلام میں بٹ گیا کتابخانے پارس کے کیا بادشاہی اور کیا

امرا اور رعایا کی چولہے میں جھونک گئے یعنی اونسے حمام [illegible] جیسا کہ میں نے ایک جگہ اپنے رقعہ کو فارسی عبارت

میں لکھا ہے [illegible] کتابخانہا پارسیان [illegible] گرمابہ بغداد شد [illegible] احکام آتش پرستی

ہم بہ آتش باز گشت اگرچہ بابت خاص اہل عرب کے حق میں [illegible] مین اہل پارس بھی

اعراب کے شریک ہیں بالجملہ اعیان عجم و بلغاء عرب میں امتزاج و اختلاط و مہر و محبت و قرب و قرابت

پیدا ہوئے اختلاف مذہب ارتشبہ گیا تھا امور ریاست و سیاست بالطبع و صوابدید فریقین ہونے لگی تھی
طبیعتیں تھیں در آنکہ فارسی و عربی کو باہم ربط دیگر ایک اُردو پیدا کیا سچ ہے انتہ وہ زبان نکلی کہ نہ
عربی فارسی میں وہ مزا نہ عربی میں وہ ذوق زبان فارسی کے قواعد کے کتب اکثر ہو گئی تھی اور بر
طرہ یہ ہے عربی کے قواعد جزیں جزیں جلیل القدر سالہا مرتب ہو گئی تھی اور ہوتے جاتے تھے بیچارہ فارسی زبان
غریب الوطن بے سر و سامان نہ اسکا کوئی فرہنگ اسکی قوانین کا کوئی رسالہ نہ علم پارسی کا کوئی عالم جو
دو چار ہزار لغت و اسم و فعل زبان زد اہل عصر ہونگی فارسی کا صرف کہاں فارسی کا نحو کہاں فارسی
زبان اعراب کو شرح جامی نام رکھدیا منور التہذیب کہکر بکلا شمس البہار کہکر ہلا دیا اور ...
[illegible] کہکر بلبلیا تو یہی ہوا کہ گر فریقین موجد اردو زبان ہوئے تھے وہ تسمیہ قواعد فارسی کی طرف
متوجہ نہیں ہوئے تشنہ باتشنہ ہجر بعین ہو سنا کہ لوگ فارسی کے فرہنگ لکھنے پر متوجہ ہوئے
نہ ایک [illegible] بلکہ ہزار دو ہزار ... فراہم ہو گئیں جہانتک قسمتی ... کہنوں الغیاث ہے
علاوہ کتب ... اور کوئی روشن جو ... اور کہاں تک کہوں کون کون سی کتابیں آتی ہیں
تحریر قواعد انشا ہو گیا میں اون سبکو یا اونمیں سے محقق فلاں و ... کو اپنا مطاع کیونکر جانوں اور
کسی دلیل سے اونکی تحکم کو مانوں ۱۲

بلکہ سیاق سابق جو جانتی تھی کہ فاعل کسکو کہتی ہیں اور جمع کسی حرف کا نام ہے امر کا صیغہ کون جانور ہے
اور اسم جامد کس قسم کے جانور کو کہتے ہیں اونہوں نے کچھ نہ کہا ہوگا کہ دانا و بینا صیغہ امر اسم فاعل اور
ناگاہ و گریان صیغہ [illegible] فاعل یا حالیہ ہے ایک ... نے کہدیا کہ الف نون افادہ معنی فاعلیت کرتا ہے
ایک صفت ... الف نون حالیہ ہے خدا جانے اہل پارسی صیغہ امر کو اپنی زبان میں کیا کہتے ہونگے اور
الف فاعل و کا اونکے لسان میں کیا نام ہوگا آخر یہ فن امور دینی میں سے تو نہیں ہے جو امام اعظم کا قول
کو نمانے وہ مرتد ہے قوت قیاسی کا مادہ اور وہی تہا ہکو مبدا فیاض سے یہ قوت عطا نہیں ہوئی
اور یہ الف نون حالیہ کی وجوہ کا اعتراف ... منفرد نہیں ہوئے لبقول تمہارے الحد اخاص ہے
یہی سوال ہے عقیدہ ہے کہ الف نون حالیہ موجود ہے یا نہیں سائل کا جو جواب وہی تمام ہوا جہاں

تم نے فرمایا کہ سابقین افتان و خیزان کے الف نون کو حالیہ لکھ گئی لاحقین نے کہ الف نون فاعل کا
ہے آخر ایک تردد اگر پیدا ہوا تو تسمیہ میں پیدا ہوا متاخرین کا قول متقدمین کے کلام کا ناسخ اور
الف نون حالیہ کی وجوہ کا متحمل تو نہیں ہوا بہر حال ہم یہ کہہ کہ بعض لوگ اسی الف نون کو فاعل
کا الف نون بتاتے ہیں اور بعض الف نون حالیہ کہتے ہیں قصہ مختصر کاغذ استفتا مع دستخط
حضرات بالا دستخط کل میرے پاس بھیج دیجئے ۱۲

تہوڑی سے تقریر اگرچہ خارج از بحث ہے لیکن اسواسطے وہ تقریر تحریر میں لاتا ہوں کہ پھر مجھے کچھ کہنا
نہ پڑے اہل پارس کے منطق میں روز و ... مع نفائس وہ بہت ہیں کہ اسے سمجھ ساتھ مختص ہیں
ہم اہل عرب نے بلکہ ... مین اونکو کیسے متہم کروں فرہنگ نگاران ہند نے یہ نام ... اپنے
قیاس سے رکہی ہم افادہ معنی فاعلیت لینے الف نون قیاسکو نہیں مانتے الف نون حالیہ کہتی الف نون کا

ہے نہ مطابقت رکھتی ہو فارسی میں اسم فاعل فرموت پر ہے یا گوئیا یا گو یا صیغہ امر ہو کر
یا بعد جو الف نون ہے وہ حالیہ ہے ان فعل کا ایک توہم سا گزرتا ہے سو اگر بہ امعان نظر دیکھیے
تو ویسا ہی ایک وہم مفعولیت کا بھی پایا جاتا ہے پس نظر اس بات پر کہ فاعلیت کی حالت
اور مفعولیت کی حالت معاً پائی جاتی ہے یہ الف نون حالیہ ہے اور اسی وجہ سے اثبات میں
قواعد نحو عربیہ کا محتاج نہیں خاص افتادنی دیکھو نہ افتندہ مستعمل ہے یہ مثل گوئیا
افتاں مسموع و موجود ہے مثل گویا افتاں صیغہ فاعل کہا نہ گیا اور دوسری دلیل یہ ہے کہ افتاں
کو ہم اسم فاعل جب جانیں کہ افتاں بمعنی افتندہ اہل زباں کی بیت میں مالک ملک اردو
فارسی و عربی ہیں اون کے نظم و نثر میں آیا ہو تا اصل مادہ افتاں جو افت ہے موجود نہیں
افتاں کہا نہ بمعنی فاعل نکل آیا مگر ان گرنے کے لیے جس طرح ہو وہ افتاں ہے اور وہ حالت
نہ بحسب فعل میرزا کیو مرادیں میں سے کیوں نہ بنایا صیغہ فاعل متروک رہا صرف صیغہ مفعول
یعنی مردہ پر قناعت کی اور یہ جو قبلہ اہل سخن فردوسی طوسی علیہ الرحمہ کا ہاں آیا ہے
میراں کی ہے دیرگز میر مجازی ہی میر ہے اور بعد اس کے متاخرین میں سے ہی عبدالقادر بیدل
کہتا ہے سو بمیرزا سرکشی ناپاک تا یکدم بیا ساقی بلکہ از رحم میں ہر گرانی آدمیکو کہتے ہیں
ای فلک کے عدو فرجاک سودا کہتا ہے سو جیتا رہیگا کب تلک از غم مرکہیں یہ بیدل
مجازی ہی خلاصہ یہ کہ الف نون فاعل بجائے نہ فارسی تحت ہے تھا نہ فارسی آمیختہ عربی میں ہے قیاس کو
میں مانتا نہیں الف نون جہاں اسماء جامد کے آگے ہے جمع کا ہے اور جہاں صیغہ امر کے آگے



ہے حالیہ ہے والسلام مع الوف الاحترام
یہ رقعہ بعد پڑھنے کے یا نقل لینے کے
استفتا کے کاغذ کے ساتھ مجھکو واپس
بھیجئے نجات کا طالب غالب

(۱)

بہ خدمت مولوی صاحب معظم مسلّم علمائے عرب و عجم، مولوی ضیاء الدین خاں صاحب ضیاء دہلوی نبیرہ نواب سابق بستی دارا پور۔

جناب مولوی صاحب!

میں نے ایام دبستاں نشینی میں شرح مائۃ عامل تک پڑھا۔ بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور و عیش و طرب میں منہمک ہو گیا۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری

طبیعی تھا۔ ناگاہ ایک شخص وارد ہوا کہ ساسانِ پنجم کی نسل میں سے، معہذا منطق و فلسفے میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن موحد و صوفی صافی تھا میرے شہر میں وارد ہوا اور لطائفِ فارسی بحت اور غوامض فارسی آمیختہ بہ عربی، اُس سے میرے حالی ہوئے۔ سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ ذہن معوج نہ تھا۔ زبان دری سے پیوند ازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپِ عہد و بزرجمہرِ عصر تھا حقیقت اس زبان کی دل نشیں و خاطر نشاں ہوگئی۔

اہلِ پارس جو قدم عالم کے قائل ہیں، وہ مثلِ ہنود کے آفرینشِ عالم کا آغاز و انجام و سرو بن نہیں بتاتے، ہمارے مذہب کے موافق بھی کیومرث وغیرہم کی سلطنت کو دو چار ہزار برس سے کم نہ گزرے ہوں گے۔ تاآنہ اور نجوم اور طب اور فقہ اور انشا اور انشاد کون سا علم اور کون سا فن ہوگا، جو اس گروہ میں نہ ہوگا۔ سکندر جب ایران پر مسلط ہوا تو ارسطو نے کتاب خانۂ دارا سے بہت سے علوم یونانی زبان میں نقل کیے۔ اللہ اللہ، اُس گروہ کو دیکھیے جن کا کلام علم حکمت میں حکمائے یونان کا ماخذ ہو۔ اگر ابو علی سینا، قابوس وشمگیر کے کتاب خانے سے کتبِ حکمائے یونانیہ لے کر مطالبِ حکمی کو زبانِ عرب میں نقل نہ کرتا تو اکابر عرب میں سوائے مسائلِ فقہیہ شرعیہ، علمِ معقول کا نشان نہ پایا جاتا۔

دو تین ہزار برس قبل آج سے، کہ عرب و عجم بیگانۂ ہم دگر تھے۔ اہلِ پارس اپنے مطالبِ علم بلکہ علومِ متنوعہ کو کس زبان میں شرح کیا کرتے تھے اور تعلیم و تعلّم و سوال و جواب کا مدار کن الفاظ پر ہوگا؟ بے شبہ وہ الفاظ پارسی ہوں گے۔

جب خلیفۂ ثانی کے عہد میں یزدجرد مارا گیا اور پارس پر اعراب مسلط ہوئے۔ درفشِ کاویانی کا جواہر آمود چمڑا، پارہ پارہ ہو کر غازیانِ اسلام پر بٹ گیا۔ کتاب خانے پارس کے، کیا کیا امرا اور رعایا کے، چولھے میں جھونکے گئے یعنی اُن سے حمام گرم ہوئے، جیسا کہ میں نے ایک جگہ اس واقعے کو فارسی عبارت میں لکھا ہے۔ وہی ہذا۔

"کتاب خانہائے پارسیاں، افروزینۂ گلخنِ گرمابہ ہائے بغداد شد۔ ہمانا احکامِ آتش

پرستی ہم بہ آتش بازگشت۔"

اگرچہ بلاغت خاص اہلِ عرب کے حصّے میں آئی لیکن فصاحت میں اہلِ پارس بھی اعراب کے شریک ہیں۔ بالجملہ اعیانِ عجم و بلغاے عرب میں امتزاج و اختلاط و مہر و محبت و قرب و قرابت پیدا ہوئی۔ اختلافِ مذہب اُٹھ گیا تھا، امورِ ریاست و سیاست بہ صلاح و صواب دیدِ فریقین ہونے لگے تھے۔ طبیعتیں تھیں درّاک۔ فارسی و عربی کو باہم ربط دے کر ایک اردو پیدا کیا۔ سُبحَانَ اللہ، وہ زبان نکلی کہ نہ نری فارسی میں وہ مزا، نہ نری عربی میں وہ ذوق۔ زبان فارسی کے قواعد کے کتب خاکستر ہو گئے تھے۔ اُس پر طرّہ یہ کہ عربی کے قواعد کے بڑے بڑے جلیل القدر رسالے مرتّب ہو گئے تھے اور ہوتے جاتے تھے۔ بے چارہ فارسی زبان، غریب الوطن، بے سر و سامان۔ نہ اس کی کوئی فرہنگ، نہ اس کے قوانین کا کوئی رسالہ، نہ علمِ پارسی کا کوئی عالم باقی۔ دو چار ہزار لغت و اسم و فعل زبان زدِ اہلِ عصر ہوں گے۔ فارسی کا صَرف کہاں، فارسی کا نحو کہاں؛ فارسی زبان اعراب کی لونڈی، جو چاہا نام رکھ دیا۔ ضوء النہار کہہ کر پکارا۔ شمس النہار کہہ کر یاد کیا۔ او لونڈی، اری چھوکری کہہ کر بلا لیا۔ سو بھی جو اکابرِ فریقین، موجدِ اُردو زبان ہوئے تھے۔ وہ تشمیہ قواعدِ فارسی کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ ۸۰۰ھ یا ۹۰۰ھ ہجری میں ہوسناک لوگ فارسی کے فرہنگ لکھنے پر متوجہ ہوئے۔ نہ ایک، نہ دو، بلکہ ہزار دو ہزار فرہنگیں فراہم ہو گئیں۔ یہاں تک کہ قتیل نو مسلم لکھنوی اور غیاث الدین ملاے مکتب دار رام پوری اور کوئی روشن علی جون پوری، اور کہاں تک کہوں، کون کون، جس کے جی میں آئی وہ متصدیِ تحریرِ قواعدِ انشا ہو گیا، میں اُن سب کو یا اُن میں سے مختص فلاں و بہماں کو اپنا مطاع کیوں کر جانوں؟ اور کس دلیل سے اُن کے تحکّم کو مانوں؟

پارسیانِ سابق جو جانتے نہ تھے کہ فاعل کس کو کہتے ہیں اور جمع کس مرض کا نام ہے، امر کا صیغہ کون جانور ہے اور اسمِ جامد کس قسم کے پتھر کو کہتے ہیں، انھوں نے کبھی نہ کہا ہو گا کہ "دانا" و "بینا" صیغۂ اسمِ فاعل اور "نالاں" و "گریاں" صیغۂ فاعل یا حالیہ ہے۔ ایک جماعت نے کہہ دیا کہ الف

نون افادۂ معنیٔ فاعلیت کرتا ہے۔ ایک صف پکار اُٹھی کہ الف نون حالیہ ہے۔ خدا جانے اہلِ پارس صیغۂ امر کو اپنی زبان میں کیا کہتے ہوں گے اور الف فاعل کا اُن کی لسان میں کیا نام ہوگا۔ آخر یہ فن امورِ دینی میں سے تو نہیں ہے کہ جو امام اعظم کے قول کو نہ مانے وہ مرتد ہے۔ قوتِ قیاس کا مادّہ اوروں میں تھا۔ ہم کو مبداء فیاض سے یہ قوت عطا نہیں ہوئی اور پھر الف نون حالیہ کے وجود کے اعتراف میں، میں ہی منفرد نہیں ہوں۔ بہ قول تمھارے اور اشخاص بھی ہیں۔ سوال اسی قدر ہے کہ الف نون حالیہ موجود ہے یا نہیں؛ سائل کا تو جواب وہیں تمام ہوا، جہاں تم نے فرمایا کہ سابقین "افتاں" و "خیزاں" کے الف نون کو حالیہ لکھ گئے۔ لاحقین نے کہا کہ یہ الف نون فاعل کا ہے۔ خیر ایک تردّد اگر پیدا ہوا تو تسمیہ میں پیدا ہوا۔ متاخرین کا قول، متقدمین کے کلام کا ناسخ اور الف نون حالیہ کے وجود کا مبطل تو نہیں ہوا۔ بہر حال یہی لکھ دو کہ بعض لوگ اس الف نون کو فاعل کا الف نون بتاتے ہیں اور بعض الف نون حالیہ کہتے ہیں۔

قصہ مختصر، کاغذ استفتا مع دستخطِ حضرات یا بے دستخط کل میرے پاس بھیج دیجے۔

تھوڑی سی تقریر اگرچہ خارج از مبحث ہے لیکن اس واسطے وہ تقریر تحریر میں لاتا ہوں کہ پھر مجھے کچھ کہنا نہ پڑے۔ اہلِ پارس کے منطق میں "رواں" و "دواں" مع نظائر، کہ وہ بہت ہیں، کسی اسم کے ساتھ مختص نہیں۔ اہلِ عرب نے بلکہ توبہ توبہ، میں اُن کو کیوں متہم کروں، فرہنگ نگارانِ ہند نے یہ نام موافق اپنے قیاس کے رکھے۔ ہم افادۂ معنیٔ فاعلیت لینے والوں کے قیاس کو نہیں مانتے۔ الف نون حالیہ کہنے والوں کی ہم نے مطابقت رائے کی ہے۔

فارسی میں اسم فاعل دو صورت پر ہے۔ "یا گوینده" "یا گویا" صیغہ ہائے امر کے مابعد جو الف نون ہے وہ حالیہ ہے۔ ہاں فعل کا ایک توہّم سا گزرتا ہے۔ سو اگر یہ امعانِ نظر دیکھیے تو ویسا ہی ایک وہم مفعولیت کا بھی پایا جاتا ہے۔ پس نظر اس بات پر کہ فاعلیت کی حالت اور مفعولیت کی حالت معاً پائی جاتی ہے۔ یہ الف نون حالیہ ہے اور اپنے وجود کے اثبات میں قواعدِ نحو عربیہ کا محتاج نہیں۔ خاص "افتادن" میں دیکھو کہ نہ "افتنده" مستعمل ہے مثل گوینده

نہ آفتا، مسموع و موجود ہے۔ مثل گویا "افتاں" صیغۂ فاعل کہاں سے آگیا؟

اور دوسری دلیل یہ ہے کہ "افتاں" کو ہم اسم فاعل جب مانتے کہ "افت" "وبیفت" بہ معنی امر، اہلِ زبان کی، یعنی جو مالک ملکۂ اردوے فارسی و عربی ہیں۔ اُن کی نظم و نثر میں آیا ہوتا۔ اصل مادّہ "افتاں" جو "اُفت" ہے، موجود ہی نہیں۔ "افتاں" کہاں سے بہ معنیٔ فاعل نکل آیا؟ مگر ہاں گرنے کی حالت جس پر طاری ہو وہ "افتاں" ہے۔ ازروے حالت نہ بہ حسبِ فعل "میرندہ" کہو، "مردن" میں سے کیوں نہ بنایا؟ صیغۂ فاعل متروک رہا۔ صرف صیغۂ مفعول یعنی "مردہ" پر قناعت کی اور یہ جو قبلۂ اہلِ سخن فردوسی طوسی علیہ الرحمۃ کے ہاں آیا ہے:

میراں کسے را وہر گز ممیر

مجاز ہے، امر بھی اور تعدیہ بھی، متاخرین میں سے بھی عبدالقادر بیدل کہتا ہے:

بمیر اے سرکشِ ناپاک تا یک دم بیاسائی

بلکہ اردو میں بھی "گراں جاں" آدمی کو کہتے ہیں: "ابے فلاں کے فلاں مرچک" سودا کہتا ہے:

جیتا رہے گا کب تلک اے خضر مر کہیں

یہ سب بہ طریقِ مجاز ہے۔

خلاصہ یہ کہ الف نون فاعل نہ فارسی بحت میں تھا، نہ فارسیِ آمیختہ بہ عربی میں ہے۔ قیاس کو میں مانتا نہیں۔ الف نون جہاں اسماے جامد کے آگے ہے، جمع کا ہے اور جہاں صیغہ ہاے امر کے آگے ہے، حالیہ ہے۔ والسلام بالوفِ الاحترام۔

یہ پہلا رقعہ بعد پڑھنے کے یا نقل لینے کے استفتا کے کاغذ کے ساتھ مجھ کو واپس مل جائے۔

نجات کا طالب۔ غالب
مہر: اسداللہ ۱۲۳۱ھ

(۲)

مولوی صاحب جمیل المناقب، مولوی ضیاء الدین خاں صاحب کی خدمت میں بعد سلام عرض کیا جاتا ہے کہ میں عالم نہیں، مگر شرفِ علم اور فضیلتِ علما میرے دل نشیں ہے اور علم کو زبان

عربی میں منحصر جانتا ہوں۔ اللہ اللہ علم عربی کی وسعت۔ صرف نحو، منطق، فلسفہ، تفسیر، حدیث، فقہ پانچ سات برس تک آدمی اس کو تحصیل کر سکتا ہے۔ یعنی طب و نجوم وہیئت و ہندسہ و ریاضی اور اس کے سوا اور علوم سب عربی زبان میں ہیں۔ فارسی زبان، بعد تباہ ہونے یزدجرد کی سلطنت کے، مٹتی گئی۔ یہاں تک کہ "بہ قدر ایک بولی کے رہ گئی۔ پارسی جو مہراسپ کے عہد سے یزدجرد کے عصر تک تھی، مفقود بلکہ معدوم ہے۔ خاطر نشان رہے کہ یہ پارسی زبان جو اب ہند و عرب و عجم میں مروج ہے،" واضع اس کے اکابر عرب و عظمائے عجم ہیں۔ ان واضعوں نے اس کے قواعد منضبط نہیں کیے۔ گویا ان دونوں گروہوں کے علما نے بہ اتفاق رائے ہم دگر اس کو ضرور نہ جانا۔ اب جو میاں انجو اور عبدالرشید اور ٹیک چند اور آرزو رسائل قواعدِ فارسی تصنیف کر گئے ہیں۔ اس کے سوا کہ قواعد منضبطۂ عربی پر منطبق کر دیا ہے اور کیا کمال کیا ہے؟ بعینہٖ یہی حال اردو کا ہے۔ واضعوں نے قواعد منضبط نہ کیے۔ اب میاں روشن علی جون پوری اور ان کے امثال و نظائر ہزار در ہزار رسالے تالیف کر رہے ہیں۔ خیر، یہ جملۂ معترضہ تھا۔ علم فارسی میں کلام ہے۔ اگر متعلم فہم درست اور ذہنِ رسا رکھتا ہو تو سال بھر میں تحصیل تمام ہے۔ ابوالفضل و سہ نثر ظہوری، سکندر نامہ و یوسف و زلیخا و السلام مع الاکرام۔

ہاں، اس زبان کے دقائق و لطائف جاننے کو طبیعت کا لگاؤ کہ وہ موہبتی ہے، اصل محکم اور اس کے بعد رودکی سے لے کر قاآنی تک کا کلام غور سے دیکھنا۔

یہ شخص ایران کا تھا۔ فاضل تھا، اس کی رحلت کو دس بارہ برس ہوئے ہوں گے۔

کل جو آپ نے میری زبانی کچھ کلام مجھ سے فرمایا تھا، وہ تقریر ناقل کی بدلی ہوئی ہے۔ میرا قول یہ ہے کہ: عربی کے زور سے فارسی کا علم حاصل نہیں ہو سکتا اور انتہا اس کی جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں، ویسی نظم و نثر ہے۔ اس علم فارسی کا منشا مناسبتِ طبع اور مشاہدۂ کلامِ اہلِ زبان ہے۔ وہ وہبی یہ کسبی۔

ایک مجلد "درفشِ کاویانی" نذر کرتا ہوں۔ تخطیۂ اہلِ فرہنگ و تصحیحِ لغات کو بھاڑ میں

ڈالو۔ جہاں سے فوائد شروع ہیں، وہاں سے ہر فائدے کو بہ غور پڑھو۔ ترکیبِ کلماتِ فارسی بتاتا ہوں اور وہی تحریر میں لاتا ہوں۔ نہ تم جاہل ہو نہ نامنصف۔ یقین ہے کہ اپنی جگر کاوی کی داد تم سے پاؤں گا۔ آغازِ فوائد کے ورق میں کاغذ واسطے نشان کے رکھ دیا ہے۔

جنوری ۱۸۶۶ء نامہ سیاہ اسد اللہ

(۳)

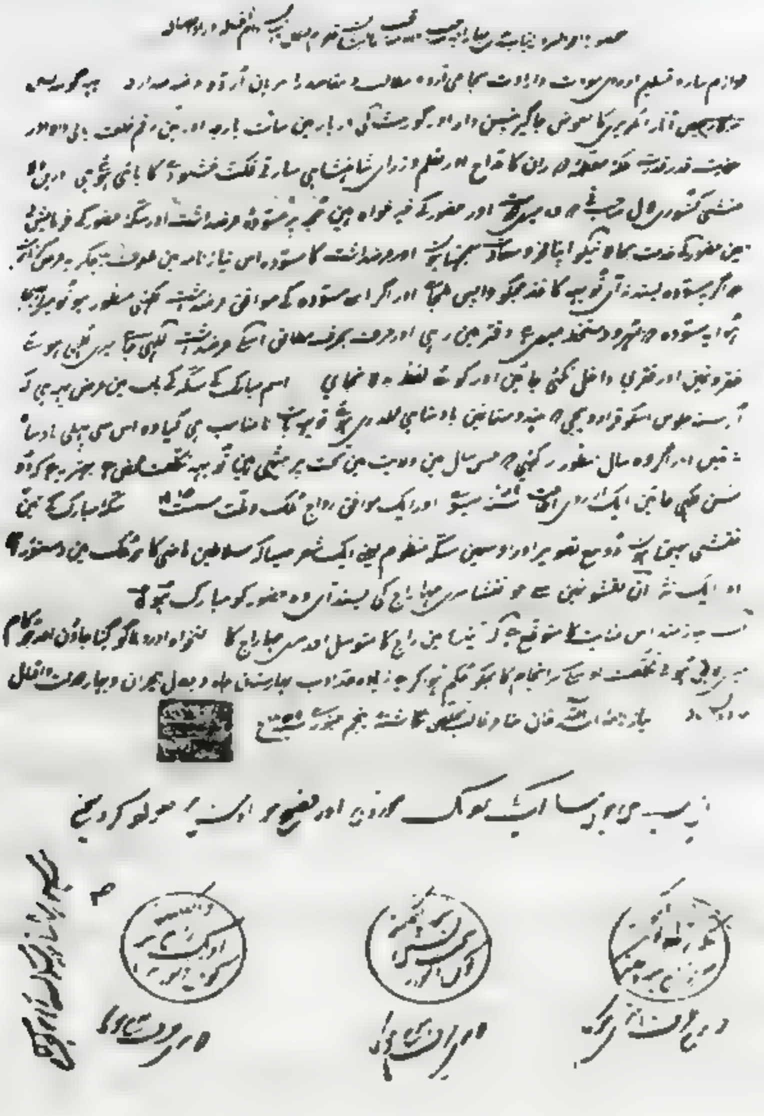
جناب مولوی صاحب کرم از شما و کمی از ما اچھوں کے ساتھ
سب بھلائی کرتے ہیں بروں کے ساتھ نیکی کرنی
جوانمردی ہے اگر اپاہج نہوتا فوراً آپکے پاس پہنچتا اب
متوقع ہوں کہ آج اسوقت یا اور وقت مگر آج ہی
آپ تشریف لائیں اور ضرور تشریف لائیں شام
تک چشم براہ رہونگا عنایت کا طالب غالب
۲۷ فروری ۱۸۶۶ء

جناب مولوی صاحب!

کرم از شما و کمی از ما۔ اچھوں کے ساتھ سب بھلائی کرتے ہیں، بروں کے ساتھ نیکی کرنی جواں مردی ہے۔ اگر اپاہج نہ ہوتا، فوراً آپ کے پاس پہنچتا۔ اب متوقع ہوں کہ آج اس وقت یا اور وقت مگر آج ہی آپ تشریف لائیں اور ضرور تشریف لائیں۔ شام تک چشم بہ راہ رہوں گا۔

۲۷ فروری ۱۸۶۶ء عنایت کا طالب۔ غالب

مہاراجا سردار سنگھ والیِ بیکانیر



بحضور وافر السرور، جناب سری مہاراجا صاحب، والا مناقب، عالی شان، قلزمِ فیض و احسان، دام اقبالہ وزاد افضالہ!

لوازمِ نیاز و تسلیم، از روے مودت وارادت بجامی آرد و مطالب و مقاصد را بہ زبانِ اردو عرضہ می دارد۔

یہ گوشہ نشین سرکار فیض آثار انگریزی کا بہ عوض جاگیر پنسن دار اور گورمنٹ کے دربار میں سات پارچہ اور تین رقم خلعت پانے والا اور حضرت قدر قدرت ملکۂ معظمۂ دوراں کا مدّاح اور بہ قلمِ وزراے شاہنشاہی سارٹی فکٹ خوشنودی کا پائے ہوئے ہے۔ دریں ولا، منشی کشوری لال صاحب نے، کہ وہ میرے دوست اور حضور کے خیر خواہ ہیں، مجھ پر مسودۂ عرضداشت اور سکّۂ حضور کی فرمایش کی، میں حضور کی خدمت بجالانے کو اپنا فخر و سعادت سمجھتا ہوں اور عرضداشت کا مسوّدہ اس نیاز نامے میں ملفوف بھیج کر یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر یہ مسودہ پسند نہ آئے تو یہ کاغذ مجھ کو واپس مل جائے اور اگر اسی مسوّدے کے موافق عرضداشت لکھنی منظور ہو تو میرا بھیجا ہوا یہ مسوّدہ کہ بہ مہر و دستخط میرے ہے، دفتر میں رہے اور حرف بہ حرف مطابق اس کے عرض داشت لکھی جائے۔ میرے لکھے ہوئے فقروں میں اور فقرے داخل نہ کیے جائیں اور کوئی لفظ بدلا نہ جائے۔ اسمِ مبارک کے سکّے کے باب میں عرض یہ ہے کہ اگر سنہ جلوس اس کو قرار دیجے کہ ہندوستان میں بادشاہی عمل داری ہوئی تو یہ بات نامناسب ہے۔ کیا وہ اس سے پہلے بادشاہ نہ تھیں؟ اور اگر وہ سال منظور رکھیے کہ جس سال میں ولایت میں تخت پر بیٹھی ہیں تو یہ تکلفِ محض ہے۔ بہتر یہ ہے کہ دو سنہ لکھے جائیں۔ ایک از روے اطاعت ۱۸۵۹ء عیسوی اور ایک موافق رواجِ ملک و ملّت سنبت ۱۹۱۵ء۔ سکۂ مبارک کے تین نقشے بھیجتا ہوں۔ دو مع تصویر، اور اُس میں سکۂ منظوم یعنی ایک شعر جیسا کہ سلاطینِ ماضی کا ہر ملک میں دستور ہے اور ایک نثر، ان نقشوں میں سے جو نقشہ سری مہاراج کی پسند آئے، وہ حضور کو مبارک ہو۔

اب نیاز مند اس عنایت کا متوقع ہے کہ آیندہ میں راج کا متوسل اور سری مہاراج

کا دولت خواہ اور دعا گو گنا جاؤں اور جو کام میرے لائق ہو، بے تکلف اس کے سرانجام کا مجھ کو حکم ہوا کرے۔

زیادہ حد ادب۔

بہارستانِ جاہ و جلال بے خزاں و بہارِ دولت و اقبال، جاوداں باد۔ نیاز نامۂ اسد اللہ خاں شاعر، غالب تخلص

نگاشتۂ پنجم، جنوری، سنہ ۱۸۵۹ء

غالب کی مہر

خان بہادر نظام جنگ
نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں
۱۲۶۷ھ

ان سب میں جون سا آپ کے نزدیک موزوں اور فصیح ہو، اس پر صواد کر دیجے

وکٹوریہ
ملکہ زماں کوین
سریر آرائے ہند و انگلینڈ

دوسری طرف ہندی ہوگی

ہند و انگلینڈ
تخت نشین
کوین وکٹوریہ

دوسری طرف ہندی ہوگی

و انگلینڈ ۴
اورنگ آرائے ہند
کوین وکٹوریہ

دوسری طرف ہندی ہوگی

تیسری تجویز پر سرکار نے پسند کر کے صواد کیا

شہزادہ بشیر الدّین

(۱)

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

آج منگل، ۱۶ جون ۱۸۶۷ء بارہ بجے عنایت نامہ آیا۔ سرنامہ دیکھ کر سفیدۂ صبح مراد سمجھا۔ ننگا ایک چھوٹی سی خس کی ٹٹی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ خط پڑھ کر وہ حال طاری ہوا کہ اگر ننگا نہ ہوتا تو گریبان پھاڑ ڈالتا۔ اگر جان عزیز نہ ہوتی تو سر پھوڑتا اور کیوں کر اس غم کی تاب لاتا کہ میں نے اپنے کو کھچوا کر بصورتِ تصویر آپ کی خدمت میں بھیجا۔ لفافہ انگریزی، اقبال نشاں شہاب الدین خاں سے لکھوا کر، بیرنگ ارسال کیا۔ اس فرمان میں اُس لفافہ کی رسید نہ پائی۔ ظاہرا ڈاک پر ڈاکو گرے اور میرے پیکرِ بے روح کے ٹکڑے اڑا دیے۔ بے تاب ہو کر یہ عبارت حضرت کی لکھی ہوئی لفافے میں لپیٹ کر روانہ کی۔ اب جب آپ اور لفافہ بھیجیں گے تو مطالبِ باقی کا جواب مع اوراقِ اشعار بھیجوں گا۔

زیادہ حد ادب۔

سہ شنبہ ۱۶ جون ۱۸۶۷ء

(۲)

درپرستش ستم و درکار مجوئی استوار
بادشہ را بندہ کم خدمت پرخوار ہست

حضرت پیر و مرشد برحق، روز افزونی کاہش اب اس حد کو پہنچی ہے کہ :

تقسیم جزو لا یتجزیٰ محال ہے

آگے باد زمہریر نے لہو خشک کر دیا تھا، اب آتشِ دوزخ نے رہا سہا جلا دیا۔

کل آپ کا عنایت نامہ آیا۔ آپ جو رقم فرماتے ہیں کہ تو نے میرے خط کا جواب نہیں بھیجا۔ مجھ کو باوصفِ استیلائے نسیان خیال میں آتا ہے کہ میں حضرت کے فرمان کا جواب لکھ چکا ہوں۔ ڈاکی اب ڈاکو ہو گئے ہیں۔ اگر وہ لفافہ ڈاک میں تلف ہو گیا ہو تو کچھ بعید نہیں۔ متوقع ہوں کہ اُس کا نہ پہنچنا میری نارسائیِ بخت کی تاثیر سمجھا چاہیے۔ میں مجرم نہ ٹھہروں۔

زیادہ حد ادب۔

روز شنبہ ۱۱ اپریل ۱۸۶۹ء — نجات کا طالب۔ غالب

(۳)

پیر و مرشد! سلامت۔

اعضا فرسودہ اور بودے ہو گئے۔ روح اُن میں دوڑتی نہیں پھرتی مگر ابھی مفارقت نہیں کر گئی۔ خدا جانے کس حکمت میں ہے۔ اعضا نکمے ہو گئے۔ اب وہ کام جو اُن سے متعلق تھے، بند ہو گئے۔ آپ کا حکم ماننا اور آپ کی خدمت بجالانی دل سے تعلق رکھتی ہے، وہ لطیفۂ غیبی یعنی روح کے کام ہیں، جب تک وہ باقی ہے، سرانجام پائے جائیں گے۔

"خاکم بدہن" واسطے اقوال کے ہے۔ جب کوئی کلمہ مکروہِ طبع کہتے ہیں تو "خاکم بدہن" کہہ لیتے ہیں۔ عمر خیام :

بر خاک بریختی مے ناب مرا
خاکم بدہن مگر تو مستی ربیتے

اور "خاکم بسر" اور "خاکم بفرق" عام ہے، جیسا کہ میں ایک شہزادے کے مرثیے میں کہتا ہوں:

اے اہلِ شہر مدفنِ ایں دودمان کجاست
"خاکم بہ فرق" خوابگہِ خسروان کجاست

استاد:

"خاکم بسر" کہ عاشقِ کار آزمودہ ام
دانم کہ با رقیب بخلوت چہا رود

آپ کے ہاں اور مولوی روم کے ہاں "خاکم بدہن" کا موقع نہیں، جیسا کہ مولوی معنوی نے نہیں لکھا، حضرت بھی اپنے ہاں نہ لکھیں:

فرق است درمیانہ کہ بسیار نازک است

نجات کا طالب۔ غالب

(۴)

حضرت پیرو مرشد برحق، سلامت۔

تقصیر معاف، میں مدعی اور آپ مدعا علیہ بھی اور حاکم بھی۔ وجہ استغاثہ یہ کہ آپ نے مجھے اپنے حلقۂ ارادت سے خارج کر دیا۔ عرائض جواب طلب کا جواب نہیں۔ ایک عنایت نامہ سابق میں: "اب زہل میرود بر پرچنگ۔" یہ جملہ لکھا ہوا تھا۔ میں اس کو پڑھ بھی نہ سکا۔ معنی سمجھنے تو علاوہ رہے۔ میں نے عریضہ لکھا اور جملے کی حقیقتِ حال کا انکشاف چاہا، اب تک جواب نہیں پہنچا۔ جی گھبرا رہا ہے۔ جب تک اس کا جواب نہ پاؤں گا آرام نہ آئے گا۔

برخوردار اقبال نشاں مرزا شہاب الدین خاں بہادر کی زبانی آپ کے مزاجِ مبارک کی خیر و عافیت سنی، مگر وہ جو تحریرِ دستخطی سے تسلی ہوتی ہے، وہ کہاں! حضرت، اب تو خالصاً للہ والرسول، میرا گناہ معاف اور دستخطِ خاص سے مجھ کو اس جملے کے معنی لکھ بھیجیے۔

زیادہ حد ادب۔ عفو جرم کا طالب۔ غالب

حکیم غلام مرتضیٰ خاں

خان صاحب جمیل المناقب حکیم غلام مرتضیٰ خاں صاحب کو غالبِ دردمند کا سلام۔

خوب یاد کیجیے کہ میں نے کبھی کسی امر میں آپ کو تکلیف نہیں دی۔ اب ایک طرح کی عنایت کا سائل ہوں۔ حاملِ ہذا المکتوب پنڈت جے نرائن میرا یہ خط لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ ان کے بزرگ نواب احمد بخش خاں کی سرکار میں مناصبِ عالیہ اور عہدہ ہائے جلیلہ رکھتے تھے۔ اب موقع یہ آیا ہے کہ جستجوے نوکری میں پٹیالے آتے ہیں۔ آپ کو میرے سر کی قسم جہاں تک ہو سکے، سعی کر کے ان کو موافق اُن کی عزت کے کوئی منصب، کوئی عہدہ دلوا دو گے تو میں یہ جانوں گا کہ تم نے مجھے نوکر رکھوا دیا ہے۔ بڑا احسان مند ہوں گا۔

۱۳ شوال سنہ ۱۲۸۱ھ

۱۲ مارچ سنہ ۱۸۶۵ء

نجات کا طالب۔ غالب

مرزا باقر علی خاں کامل

(۱)

اقبال نشاں باقر علی خاں کو غالبِ نیم جاں کی دعا پہنچے۔ بہت دن ہوئے کہ تمھارا خط آیا مگر تم نے اپنے مکان کا پتا تو لکھا ہی نہ تھا۔ فقط الور کا نام لکھ کر، میں کیوں کر خط بھیجتا؟ بارے اب شہاب الدین خاں کی زبانی پتا معلوم ہوا۔ سو اب میں تم کو خط لکھتا ہوں۔ جینا بیگم اچھی طرح ہے۔ میرے پاس آتی رہتی ہے اور تمھارے گھر میں سب طرح خیر و عافیت ہے۔ اکتوبر مہینے کی تمھاری تنخواہ، تمھارے گھر بھیج دی۔

مرزا حسین علی خاں بندگی عرض کرتا ہے۔

تحریر تاریخ ۱۶ نومبر ۱۸۶۷ء

اسد اللہ

(۲)

نورِ چشم و راحتِ جاں مرزا باقر علی خاں کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔ تمھارا خط جو میرے خط کے جواب میں تھا، وہ مجھ کو پہنچا۔ اُس میں کوئی بات جواب طلب نہ تھی۔ اس خط میں ایک نئے امر کی تمھیں اطلاع دیتا ہوں۔ وہ امر یہ ہے کہ میں نے اگلے مہینے میں "سبد چیں" کی ایک جلد مع عرضی اقبال نشاں مرزا تفضل حسین خاں کی معرفت الور کو بھجوائی تھی۔ سو اب کے ہفتے میں حضور پر نور مہاراو راجا بہادر کا خط انھی کی معرفت مجھ کو آیا۔ حضور نے از راہِ بندہ پروری و قدر افزائی، القاب بہت بڑا مجھے

لکھا اور خط میں فقرے بہت عنایت اور التفات کے بھرے ہوئے درج کیے۔ تم تو وہیں ہو، تم کو اس کی اطلاع ہو گئی تھی یا نہیں؟ اور اگر ہو گئی تھی تو تم نے مجھ کو کیوں نہیں لکھا۔ اب میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ کبھی دربار میں کچھ میرا بھی ذکر آتا ہے یا نہیں؟ اور اگر آتا ہے تو کس طرح آتا ہے؟ حضور سن کر کیا فرماتے ہیں؟

۷ دسمبر ۱۸۶۷ء غالب

(۳)

اقبال نشاں مرزا باقر علی خاں کو غالب نیم جاں کی دعا پہنچے۔ تمھارا خط آیا۔ تمھارے روزگار کی درستی آگے سن چکا تھا، اب تمھارے لکھنے سے دیکھ بھی لی۔ دل میرا خوش ہوا اور تم خاطر جمع رکھو جیسا کہ مہاراج نے تم سے کہا ہے، تمھاری ترقی ان شاء اللہ تعالیٰ جلد ہو گی۔

مجھ سے جو تم گلہ کرتے ہو خط کے نہ بھیجنے کا۔ بھائی! اب میری انگلیاں نکمّی ہو گئی ہیں اور بصارت میں بھی ضعف آ گیا ہے۔ دو سطریں نہیں لکھ سکتا۔ اطراف و جوانب کے خطوط آئے ہوئے دھرے رہتے ہیں۔ جب کوئی دوست آ جاتا ہے، میں اُس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔ پرسوں کا تمھارا خط آیا ہوا دھرا تھا۔ اب اس وقت مرزا یوسف علی خاں آ گئے، میں نے اُن سے یہ خط لکھوا دیا۔

تمھاری دادی اچھی طرح ہے، تمھارا بھائی اچھی طرح ہے۔ تمھارے گھر میں سب طرح خیر و عافیت ہے۔ تمھاری لڑکی اچھی طرح ہے۔ کبھی روز، کبھی دوسرے تیسرے میرے پاس آ جاتی ہے۔

۱۸۶۷ء

میر احمد حسین میکش

(۱)

بھائی میکش!

آفریں، ہزار آفریں۔ تاریخ نے مزا دیا۔ خدا جانے وہ خُرمے کس مزے کے ہوں گے، جن کی تاریخ ایسی ہے۔ دیکھو صاحب:

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

تاریخ دیکھی، اُس کی تعریف کے خرمے کھائیں گے اُس کی تعریف کریں گے۔

کہیں یہ تمھارے خیال میں نہ آوے کہ یہ حسنِ طلب ہے کہ ناحق تم دین محمد غریب کو دوبارہ تکلیف دو۔ ابھی رقعہ لے کر آیا ہے، ابھی خرمے لے کر آوے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم اگر بہ فرضِ محال تم یوں ہی عمل میں لاؤ گے اور میاں دین محمد صاحب کے ہاتھ خُرمے بھجواؤ گے تو ہم بھی کہیں گے۔ تازہ شے، بہتر بارہ سے بہتر۔

(۲)

میاں!

عجیب اتفاق ہے، نہ میں تمھارے دیکھنے کو آسکتا ہوں، نہ تم میرے دیکھنے کو قدم رنجہ فرما سکتے ہو۔ وہ قدم رنجہ کہاں سے کرو۔ سراپا رنجہ ہو۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ۔ یہ تعطیل کے دن

کیا ناخوش گزرے۔ یوسف مرزا سے میر سرفراز حسین سے تمھارا حال سن لیتا ہوں اور رنج کھاتا ہوں۔ خدا تمھارے حال پر رحم کرے اور تم کو شفا دے۔

خواہش یہ ہے کہ ناتوانی کا عذر نہ کرو اور اپنا حال اپنے ہاتھ سے لکھو۔

والدعا۔ اسد

سندِ جانشینی بنام نواب علاء الدین احمد خان علائی

بہ سنہ [illegible]

دانشہای بسزا و اندیشہ ہای رسا را بہ فرگاہ تنگبار و الا ایزد کہ باز دادہ اند جز اینمایہ آگہی کہ ہمہ ازوست یا ہمہ اوست در دیدہ ودانست ہر روی ہیچ دانشمند باشد دیدہ در نکشادہ اند خرد کہ آفریدہ نخستین باشد سزد کہ ہمہ داند و ہمہ بیند ہرآئینہ ہر چہ پس ازو بہ پیشگاہ پیدائی شتابد این توانا سروش چگونگی آن را بدیدار تواند شناخت سخن در آنست کہ آن ہستی بود را کہ پیش از وی بودہ است چگونہ تواند شناخت چون خرد فرو ماندہ تر از ماست ماکہ جز اندک بخشی از خرد نیاییم در دانستن خرد آفرین چون فرو نمانیم ہمانا این نہ بس باشد کہ خدا را آفریدگار و خرد را در آفرینش با سخن کہ پرتوی از شبستان خرد تواند بود ہمدم و ہمراز دانیم گوہر خرد را بہ ترازوی سخن بسنجیم و سلوای سخن را بہ ہنجار خرد آہنجیم اگر گفتار رستہ و دانش بہ ہمہ ایزدی فرہ و امیغی ارزانش است با اینہمہ در بایستہ ای این کار آموختن فرہنگ است از آموزگار و بہ پیروی راہ دان پیمودن راہ گفتار نمی نگری کہ برادرزادہ نامور ستودہ دل روشن گہر میرزا علاء الدین خان در بہ فر تاب خرد نداد راہ سخن بہ رہنمائی این فرت و در پیری و برنائی خویش بہ بزم ستایش سخن گستری جای من از من گرفت اینک چنانکہ در خویشاوندی و یگانگی مردم چشم منست بہ جا بالش ہنرمندی و فرزانگی جانشین منست آئین گفتار بہ تو ستد اندیشہ آن نوجوان نو دگر دیدگان را بہرہ دل دگر روباد

میر سرفراز حسین

(۱)

میری جان کے چین، المجتہد العہد میر سرفراز حسین!

تم کو اور تمھارے بھائی اور تمھارے دوست کو دعا اور پھر یہ بیان کہ میں غدر سے پہلے ہر دربار میں خلعت پاتا تھا۔ بعد غدر دربار اور خلعت اور ملاقات سکرتروں کی یہ سب موقوف، اب جو لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب آئے تو انھوں نے خود مجھے بلا بھیجا اور خلعت دیا اور فرمایا کہ یہ ہم اپنی طرف سے ازراہِ محبت دیتے ہیں اور یہ نوید علاوہ کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں بھی دربار اور خلعت کھل گیا۔ انبالے جاؤ گے تو پاؤ گے۔ میں انبالے نہ جا سکا۔ بالفعل نائب گورنر کے خلعت پر قناعت کی۔ اُس خلعت کو بہ شرطِ حیات اور وقت پر موقوف رکھا۔

ہملٹن صاحب الور میں آگئے۔ راجا صاحب دربار روز کرتے ہیں۔ اہلِ اغراض کے عرایض، جو حضور میں گزرتے ہیں، وہ حضور پنچوں کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ خریطہ یعنی حکم تحریری اختیار پانے کا ابھی نہیں آیا۔ یقین ہے کہ لارڈ صاحب بعد اختتامِ سفر جب شملہ پہنچیں گے تو خریطہ جاری ہوگا۔

آج جمعہ ساتویں شوال کی اور ستائیسویں مارچ کی ہے۔ چار گھڑی دن چڑھا ہے۔ میں یہ یہ خط لکھ کر بھیجتا ہوں۔ تم بھی پڑھو اور میر مہدی کو بھی پڑھا دو۔ اب شاید تھوڑے دنوں تک میں خط نہ لکھ سکوں۔ تفصیل اس کی یہ کہ رجب کے مہینے میں سیدھے ہاتھ پر ایک پھنسی ہوئی۔ پھنسی پھوڑا

ہوگئی۔ پھوڑا پھوٹ کر زخم بنا۔ زخم بگڑ کر غار ہوگیا۔ اب بقدر یک کف دست وہ گوشت مُردار ہوگیا۔ انبالے نہ جانے کی بھی یہی وجہ ہوئی۔ دو ہفتے سے انگریزی علاج ہوتا ہے۔ کالا ڈاکٹر روز آتا ہے۔ آج اُس نے ارادہ اس مُردار گوشت کے کاٹنے کا کیا ہے۔ اب وہ آتا ہوگا میں جلد جلد یہ لکھ کر روانہ کرتا ہوں تاکہ پھر ہاتھ کے پُرزے اڑا دوں۔

۷ شوال ۱۲۷۹ھ

مطابق ۲۷ مارچ ۱۸۶۳ء نجات کا طالب غالب

(۲)

نورِ چشم، راحتِ جان، میر سرفراز حسین!

جیتے رہو اور خوش رہو۔ تمھارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا، جو بوئے پیراہن نے یعقوب کے ساتھ کیا تھا۔ میاں یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان ہیں۔ توانا ہیں یا ناتواں ہیں، بڑے بیش قیمت ہیں، یعنی بہ ہر حال غنیمت ہیں۔ کوئی بھلا بھنا کہتا ہے :

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ
یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

وہی بالاخانہ ہے اور وہی میں ہوں، سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ میر سرفراز حسین آئے، وہ یوسف مرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا۔ بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں۔ اللہ اللہ اللہ۔ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوا، میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا۔

سنو غالب، رونا پیٹنا کیا۔ کچھ اختلاط کی باتیں کرو۔ کہو میر سرفراز حسین سے کہ یہ خط میر مہدی کو پڑھواؤ اور میرن صاحب کو بلاؤ، کل شام کو یا پرسوں شام کو میر اشرف علی صاحب میرے پاس آئے تھے۔ کہتے تھے کہ کل یا پرسوں پانی پت کو جاؤں گا۔ میں نے اُن کی زبانی کچھ پیام میرن صاحب کو بھیجا ہے، اگر بھول نہ جائیں گے، پہنچائیں گے۔ خلاصہ اُس کا یہ ہے کہ صاحب،

ابن نہیں ہے نہ ہو۔ غلام اشرف نہیں ہے، نہ ہو۔ اگر منظور کیجیے تو میں صوفی ہوں۔ ہمہ اوست کا دَم بھرتا ہوں بموجب مصرع کے:

دل بہ دست آور کہ حج اکبر است

تم سے کب انکار کرتا ہوں۔ اگر مرزا گوہر کی جگہ مانو تو خوش، اگر غلام اشرف جانو تو راضی۔ رات کو اپنے گھر میں باتیں بناؤ۔ دن کو مجھ سے جی بہلاؤ۔ قصہ مختصر آؤ اور جلد آؤ۔

سید انور کا جو حال لکھتے ہو، وہ سچ ہے، راج پوت ایسا ہی کچھ کرتے ہیں مگر مہاراجا مسلمانوں کا دَم بھرتے ہیں۔ کچھ دن جاتے ہیں کہ یہ لوگ پھر وہاں آتے ہیں۔ کیا مجمع برہم ہوا ہے؟ مجھ کو کیسا غم ہوا ہے۔ تم اس جرگے سے جدا ہو۔ تم کو اندیشہ کیا ہے؟ میر قربان علی صاحب جیسا لکھیں ویسا کرو۔

میر مہدی صاحب سارا خط پڑھ کر کہیں گے مجھ کو دعا بھی نہ لکھی، بھائی میری دعا پہنچے۔ میر نصیر الدین ایک دن میرے ہاں آئے تھے۔ اب میں نہیں جانتا یہاں ہیں یا وہاں۔ وہاں[۲] ہوں تو دعا کہنا۔ میرن صاحب کے نام تو اتنا کچھ پیام ہے۔ دعا سلام کی حاجت کیا؟ دیکھو ہم اپنا نام نہیں لکھتے۔ بھلا دیکھیں تو سہی تم جانتے ہو کہ یہ خط کس کا ہے؟

مرزا عبّاس بیگ

بھائی مرزا عباس بہادر!

میں حیران ہوں کہ تم سرکار کے کام کو کیوں کر انجام دیتے ہو اور مضامینِ قوانین کو کس طرح سمجھ لیتے ہو اور مقدماتِ مرجوعہ کس اسلوب سے فیصل کرتے ہو؟ مجھ کو نواب گورنر جنرل بہادر کا دربار کب نصیب ہوا۔ نہ انھوں نے دلّی میں دربار کیا، نہ میں انبالے گیا۔ میں نے تم کو لکھا کہ ادھر تو مجھ کو اپنے فرزند کی شادی میں شریک نہ ہونے کا رنج رہا، ادھر گورنمنٹ کے دربار میں حاضر نہ ہونے کا غم ہوا۔

اخبار میں، میں نے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب یعنی جناب منٹ گمری صاحب اور ان کے سکرتر تامس ڈگلس فورسایتھ صاحب کی اور اُن کے میر منشی پنڈت من پھول سنگھ صاحب کی تعریف چھپوائی۔ اس اخبار کی عبارت سے یہ بات کب نکلتی ہے کہ منشی نے مجھے خلعت دلوایا اور یہ بھی محلِ غور ہے کہ گورنر جنرل کے دربار میں خلعت پایا۔ بھکتے ہو اور پھر منشی من پھول سنگھ صاحب کو اس کا سبب جانتے ہو۔ وہ میر منشی لفٹنٹ گورنر کے ہیں، اُن کو گورنر جنرل کی سرکار میں کیا دخل۔ مجھ کو ہرگز دیدار نواب گورنر جنرل لارڈ الگن بہادر کا نصیب نہیں ہوا۔ ہاں جب نواب لفٹنٹ گورنمنٹ گمری بہادر اس شہر میں آئے تو مجھ کو یاد کیا۔

بہت عنایت فرمائی اور ایک شالی رومال سوزن کار اور ایک گلوبند سوزن کار اور ایک اوان کی فرد چار گز کی لمبی۔ یہ تین کپڑے مجھ کو دیے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ میرا موجب اعزاز و افتخار ہے۔ مگر میری جان اُلجھی ہوئی ہے۔ لارڈ صاحب کے دربار اور خلعت میں فرمایا اچھا اچھا۔ دوسرے دن لارڈ صاحب آئے ...! تیسرے دن میں لفٹنٹ گورنر پنجاب سے رخصت ہونے گیا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ میں ہمیشہ لارڈ صاحب کے دربار سے سنہری اساوری کے سات پارچے اور جیغہ سرپیچ مالائے مروارید، تین رقم ہمیشہ پایا کیا ہوں اور اب میرا دربار اور خلعت بند ہے۔ اس کا مجھ کو بڑا غم ہے۔ فرمایا کہ غم نہ کرو، تمھارا دربار اور خلعت کھل گیا۔ انبالے جاؤ گے تو دربار اور خلعت پاؤ گے۔ میں نے اپنا ہاتھ دکھایا اور کہا کہ حضرت، بوڑھا ہوں اور زخمی ہوں۔ انبالے کس طرح جاؤں۔ کہا خیر آیندہ دربار میں پاؤ گے۔

جو عرضی انگریزی تم نے میری طرف سے لکھ کر مجھ کو بھیجی تھی اور میں نے اپنی مہر کر کے، رجسٹری کروا کے کلکتے بھیجی تھی، اس کا کچھ میں نے جواب کبھی نہیں پایا۔ شاید یہ حکم اسی عرضی پر ہوا ہو لیکن اس عرضی کو گئے ہوئے بہت دن ہوئے اور دربار اور خلعت کے واگذاشت کا حکم اب صادر ہوا ہے۔ چنانچہ مولوی اظہار حسین خاں میر منشی کہتے تھے کہ لارڈ صاحب تمھارے دربار اور خلعت کے واگذاشت کا حکم دے کر کلکتے سے ادھر کو روانہ ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ نواب گورنر جنرل بہادر کا نام لارڈ الگن بہادر ہے اور چیف سکرتر بہادر کا کرنیل ڈوریٹڈ ہے بہادر نام ہے۔ ہارنگٹن صاحب شاید سالِ آیندہ میں سکرتر ہوں۔ یا پرایوٹ سکرتر ہوں یا کونسل کے ممبر ہوں۔ بہ ہر حال اگر تمھارے سبب سے یہ کام ہوا تو کیا غضب ہوا مگر اتنا جان لو کہ واگذاشت کا حکم سنتا ہوں کہ ہو گیا ہے! میرے پاس تحریر اس حکم کی نہیں پہنچی اور تعمیل بھی ابھی نہیں ہوئی۔ یعنی نہ میں دربار میں گیا نہ خلعت پایا۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی ملاقات اور اُن کا خلعت اور

امر ہے اور بات ہے۔ اس امر سے اور اس بات سے اس کو علاقہ نہیں۔

اب میں نے جناب کرنیل ڈورینڈ بہادر چیف سکرتر کو فارسی خط بھیجا ہے اور دو کاغذ انگریزی آمد ولایت، اس خط کے ساتھ بھیجے ہیں۔ جاننا چاہیے کہ گورمنٹ سے میرے واسطے تین دستور مقرری جاری ہیں۔ دربار، خلعت، خط۔ بعد غدر کے یہ تینوں دستور بند ہو گئے۔ اب دربار اور خلعت کی واگذاشت کی خبر سن کر سکرتر صاحب کو خط لکھا ہے۔ جواب کے آنے پر دل جمعی کا مدار ہے۔ اگر جواب آیا تو تم کو ضرور اطلاع دوں گا۔

واسطے خدا کے ان سطروں کو غور سے اور مطالب کو اچھی طرح سمجھ لینا اور غلط نہ سمجھنا۔ دوسرا ورق بنام محمود مرزا کے ہے۔ اس کو دینا اور اگر تمھارے پاس نہ ہو تو جہاں ہو وہاں بھیج دینا۔

مرقومۂ صبح سہ شنبہ ۲۳ ذی قعدہ ۱۲۷۹ھ

مطابق ۱۲ مئی ۱۸۶۳ء

ضروری جواب طلب راقم۔غالب

نواب یوسف مرزا

(۱)

کوئی ہے ؟ ذرا یوسف مرزا کو بلائیو۔ لو صاحب وہ آئے۔

میاں! میں نے کل خط تم کو بھیجا ہے مگر تمھارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے۔ اب سن لو تفضل حسین خاں اپنے ماموں موید الدین خاں پاس میرٹھ ہے، شاید دلّی آیا ہو مگر میرے پاس نہیں آیا۔ والد اُن کے غلام علی خاں اکبرآباد میں ہیں۔ مکتب داری کرتے ہیں۔ لڑکے پڑھاتے ہیں، روٹی کھاتے ہیں۔

تم لکھتے ہو کہ پچاس محل واجد علی شاہ کے، کلکتے گئے۔ تمھارے ماموں محمد قلی خاں کے خط میں لکھتے ہیں کہ شاہِ اودھ بنارس آ گئے۔ اس خبر کو اُس خبر کے ساتھ منافات نہیں ہے۔ اُدھر سے آپ بنارس کو چلے ہوں، ادھر سے بیگمات کو وہاں بلایا ہو مگر میری جان ہم کو کیا؟:

عالم ہمہ مرگ ما، چہ دریا، چہ سراب

اواخر اپریل ۱۸۵۶ء

(۲)

اے میری جان، اے میری آنکھیں:

ز ہجران طفلے کہ در خاک رفت

چہ نالی کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا۔ یہاں رہ کر کیا کرتا؟ ہرگز غم نہ کرو اور ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو۔ خدا تم کو جیتا رکھے۔ اولاد بہت۔ نانا، نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے؟ ہاں مظفرالدولہ کا غم من جملہ واقعاتِ کربلائے معلیٰ ہے۔ یہ داغِ ماتم جیتے جی نہ مٹے گا۔ والد کی خدمت بجا نہ لانے کا ہرگز افسوس نہ چاہیے۔ کچھ ہو سکتا ہو اور نہ کیا ہو تو مستحقِ ملامت ہوتے۔ کچھ ہو ہی نہ سکے تو کیا کرو۔ اب تو فکر یہ پڑی ہوئی ہے کہ رہیے کہاں اور کھائیے کیا؟

مولانا کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا، کچھ تم مجھ سے معلوم کرو۔ مرافعے میں حکم دوامِ حبس بحال رہا بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا۔ اُن کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے، کیا ہوتا ہے۔ جو ہونا تھا سو ہولیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

ناظر جی کو سلام کہنا اور کہنا کہ حال اپنا مفصل تم کو لکھ چکا ہوں۔ وہ "دہلی اُردو اخبار" کا پرچہ اگر مل جائے تو بہت مفید طلب ہے ورنہ خیر کچھ محلِ خوف و خطر نہیں ہے۔

حکامِ صدر ایسی باتوں پر نظر نہ کریں گے۔ میں نے سکّہ کہا نہیں اور اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں اور اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اُس کو نہ مٹا سکے؟ سُبْحَانَ اللّٰہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں، ہاں صاحب، گولہ انداز کا بہنوئی مددگار ہے اور شاعر کا سالا بھی جانب دار نہیں۔

لو حضرت! میر عنایت حسین صاحب کل آئے۔ میر ارتضیٰ حسین صاحب کا خط دے دیا۔ عینک لگا کر خوب پڑھا۔ کہہ گئے ہیں کہ اس کا جواب کل لاؤں گا۔ میں تو صبح کو یہ خط روانہ کرتا ہوں۔ وہ آج یا کل جب خط لاویں گے اُس کو جداگانہ لفافے میں روانہ کر دوں گا۔

منظفر مرزا دیکھیے کب تک آوے اور مجھ سے کیوں کر ملے۔

ایک لطیفہ پرسوں کا سنو۔ حافظ ممّو بے گناہ ثابت ہو چکے۔ رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ املاک اپنی مانگتے ہیں قبض و تصرف اُن کا ثابت ہو چکا ہے۔ صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہیں۔ مسل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا۔ حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا کہ میں۔ پھر پوچھا کہ حافظ ممّو کون؟ عرض کیا کہ میں اصل نام میرا محمد بخش ہے۔ ممّو ممّو مشہور ہوں۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم، حافظ ممّو بھی تم، سارا جہاں بھی تم، جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟ مسل داخل دفتر ہوئی۔ میاں ممّو اپنے گھر چلے آئے۔

ہاں صاحب، خواجہ بخش درزی کل سہ پہر کو میرے پاس آیا۔ میں نے جانا ایک ہاتھی کوٹھے پر چڑھ آیا۔ کہتا تھا کہ آغا صاحب کو میری بندگی لکھ بھیجنا۔

میرن صاحب آج کل پانی پت کو جایا چاہتے ہیں۔ میر کاظم علی ابن میر قلندر علی الور سے آئے ہوئے سلطان جی میں اترے ہوئے ہیں۔ دن پندرہ ایک ہوئے، محمد قلی خاں، میری ملاقات کو آئے تھے۔ علی جی میں رہتے ہیں۔ رضا شاہ پاٹودی گئے ہوئے ہیں۔ میر اشرف علی ابن میر اسد علی مرحوم نے رہائی پائی۔ ابھی املاک کی درخواست نہیں دی۔

ہماری بھابی صاحبہ یعنی زوجہ میر احمد علی خاں مغفور اپنی حویلی میں چین کر رہی ہیں۔ ایک آدھ دن میں جاؤں گا۔

خدا جانے جمعے کے دن ناظر جی کی درخواست پر کیا گزری۔ اِس وقت تک اُن کا کوئی خط نہیں آیا۔ دھیان لگا ہوا ہے، زیادہ کیا لکھوں۔

جون، جولائی ۱۸۵۹ء

(۳)

میری جان، خدا تیرا نگہبان۔

میں نے "گڑ پھنک" کو دام میں پھنسایا، پھر قفس میں بند کر کے یہ رقعہ لکھوایا۔

میر ارتضیٰ حسین کو فقط اُن کے نام کی جو عبارت ہے وہ پڑھا دینا تاکہ اُن کی خاطر جمع ہو جائے۔

مثنوی کبھی اصلاح نہ پائے گی، جب تک یہ سب نہ آئے گی۔ لاکھ باتیں بناؤ، مجھ کو غیرت دلواؤ۔ غزل جب تک پوری نہ ہو، قصیدہ جب تک تمام نہ ہو، مثنوی جب تک سب نہ لکھی ہو، کیوں کر اصلاح دی جائے؟

اپنے چھوٹے ماموں صاحب کو میرا سلام بہ اعتبار محبت کے اور بندگی بہ اعتبار سیادت کے اور دعا بہ اعتبار یگانگی اور استادی کے کہنا اور کہنا کہ بھائی اور کیا لکھوں؟ جس حکم کی نقل کے واسطے تم لکھتے ہو وہ اصل کہاں ہے کہ جس کی نقل لوں؟ ہاں زبان زدِ خلق ہے کہ قدیم نوکروں سے بازپرس نہیں، مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔

اے لو، کئی دن ہوئے کہ حمید خاں گرفتار آیا ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، حوالات میں ہیں۔ دیکھیے حکم اخیر کیا ہو۔ صرف نوندرائے کی مختارکاری پر قناعت کی گئی۔ جو کچھ ہونا ہے، وہ ہو رہے گا۔ ہر شخص کی سرنوشت کے موافق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے نہ قاعدہ ہے۔ نہ نظیر کام آئے، نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضیٰ خاں ابن مرتضیٰ خاں کی پوری دو سو روپیے کی پنشن کی منظوری کی رپوٹ گئی اور اُن کی دو بہنیں سو سو روپیے مہینا پاتے والیوں کو حکم ہوا کہ چوں کہ تمھارے بھائی مجرم تھے۔ تمھارا پنشن ضبط۔ بہ طریقِ ترحم دس دس روپیے مہینا تم کو ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کیا قہر ہوگا! میں خود موجود ہوں اور حکامِ صدر کا روشناس، پشم نہیں اکھیڑ سکتا۔ ترپن برس کا پنسن، تقرر اُس کا بہ تجویزِ لارڈ لیک و منظوری گورنمنٹ اور پھر نہ ملا ہے نہ ملے گا۔ خیر، ایک احتمال ہے ملنے کا۔

جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہوں۔ اُس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اِس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اُس کے نہ کہیں سے قرض کی امید ہے نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل، اگر رام پور سے کچھ آیا تو خیر، ورنہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

بعض لوگ یہ بھی گمان کرتے ہیں کہ اس مہینے میں پنسن کی تقسیم کا حکم آجائے گا۔ دیکھیے آتا ہے یا نہیں، اگر آتا ہے تو میں مقبولوں میں ہوں یا مردودوں میں۔

مظفر مرزا کا خط الور سے آگیا۔ بہ خیر و عافیت پہنچے۔ میر قاسم علی کا قافلہ بھی وہیں ہے میر قاسم علی کی بی بی الور کی تنخواہ میں سے بہ موجب سہام شرعیہ دو ثلث مظفر مرزا کو اور ایک ثلث اپنے کو تجویز کرتی ہے۔ ظاہرا بہ موجب تعلیم میر قاسم علی کے ہے۔

محررۂ جمعہ ۱۳ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ

۱۵ جولائی (سال حال) ۱۸۵۹ء   غالب

(۴)

میاں!

پرسوں قریب شام مرزا آغا جانی صاحب آئے۔ وہ اور اُن کے متعلق سب اچھی طرح ہیں۔ حسو بیگ ہانسی گئے۔ کل تمھارا خط آیا۔

بھائی تمھیں خارش کیوں ہوئی؟ حسین مرزا صاحب کیوں بیمار ہوئے؟ خدایا! ان آوارگانِ دشتِ غربت کو جمعیت، جب تو چاہے عنایت کر مگر تصدقِ مرتضیٰ علی کا، تندرست رکھ۔ اللہ اللہ! حسین مرزا کی ڈاڑھی سفید ہوگئی۔ یہ شدتِ غم و رنج کی خوبیاں ہیں۔ اس خط کے پہنچتے ہی اپنی اور اُن کی خیر و عافیت لکھنا۔ جہاں تم نے اپنے نام کا خط پڑھا وہاں کا حال یہ ہے:

بگفتند احوالِ ما برقِ جہانست
دمے پیدا و دیگر دم نہانست
گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم
گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

ہمارے خداوند ہیں، قبلہ و کعبہ ہیں، خدا اُن کو سلامت رکھے۔

آغا باقر کا امام باڑہ اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزا خانہ ہے، ایک بنائے قدیم رفیع

مشہور۔ اُس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہوگا؟ یہاں دو سڑکیں دوڑتی پھرتی ہیں۔ ایک ٹھنڈی سڑک اور ایک آہنی سڑک۔ محل اُن کا الگ الگ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارک بھی شہر میں بنے گا اور قلعے کے آگے، جہاں لال ڈگی ہے، ایک میدان نکالا جائے گا۔ محبوب کی دکانیں، بھیلیوں کے گھر، فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچہ سے خاص بازار تک، یہ سب میدان ہو جائے گا۔ یوں سمجھو کہ اَمّو جان کے دروازے سے قلعے کی خندق تک سوائے لال ڈگی اور دو چار کنوؤں کے آثارِ عمارت باقی نہ رہیں گے۔ آج جاں نثار خاں کے چھتّے کے مکان ڈھنے شروع ہو گئے ہیں۔ کیوں میں دلّی کی ویرانی سے خوش نہ ہوں؟ جب اہلِ شہر ہی نہ رہے، شہر کو لے کے کیا چولھے میں ڈالوں؟

حسین مرزا صاحب کو میرا سلام کہنا۔ یہ رقعہ پڑھا دینا۔ ان کا خط موسومۂ محمد قلی خاں آیا۔ کلو کے ہاتھ اُن کے گھر بھجوایا۔ اُن کا گھر کہاں؟ وہ تو میر احمد علی خاں مرحوم کی بی بی کے ہاں رہتے ہیں۔ وہ نہ تھے۔ جب بھابھی صاحب کو معلوم ہوا کہ میرے دیور کا آدمی ہے، انھوں نے مدعا دریافت کر کے خط رکھ لیا اور کلو سے کہا کہ بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ محمد قلی خاں علی جی گئے ہوئے ہیں خط اُن کے پاس بھجوا دوں گی۔ کل رضا شاد آئے تھے۔ میں نے اُن کو کہا تھا کہ تم میر احمد علی خاں کی بی بی کو تاکید کر دینا کہ خط ضرور کا ہے اُس کو بہ احتیاط پہنچا دینا۔

صاحب! تمھاری اُنّا کو میں کیا جانوں؟ کس پتے سے ڈھونڈوں؟ دَدا سے میں نے پوچھا، امیر النساء کو وہ نہ سمجھی، واجد علی کی ماں کر کے پہچانا۔ سو وہ کہتی تھی کہ واجد علی مع اپنی ماں کے پہاڑ گنج ہے۔

ہمشیرہ کی عرضی کے روانہ ہونے کا حال معلوم ہوا۔ تم سمجھو اگر وہ عرضی فی الحقیقت کمشنر نے بھیج دی ہے تو بے شک مدعائے سائلہ قبول کر کے بھیجی ہے۔ اگر خود نہ منظور کرتا تو کبھی نہ بھیجتا۔

باقر علی اور حسین علی اپنی دادی کے ساتھ ضیاء الدین خاں کی والدہ کے پاس قطب گئے ہوئے ہیں۔ ایاز اور نیاز علی اُن کے ساتھ ہیں۔ دو بندگیاں اور ایک دعا اور دو آداب

ملتوی۔ ودا اور کلو اور کلیان کی بندگیاں پہنچیں۔ قمرالدین خاں پرسوں آیا تھا۔ اب آئے گا تو دعا تمھاری اُس کو کہہ دوں گا۔

۲۸ جولائی ۱۸۵۹ء غالب

(۵)

حق تعالیٰ تمھیں عمر و دولت و اقبال و عزّت دے، خط محررۂ دوم محرم میں کوئی مطلب جواب طلب نہ تھا۔ مرزا حیدر صاحب کی رحلت کی خبر تھی اور بس۔

کل بدھ کا دن، دونوں مہینوں کی سترہ تاریخ تھی۔ صبح کے وقت مرزا آغا جانی صاحب آئے اور انھوں نے فرمایا کہ حسین مرزا کی حرم لکھنؤ سے آئی تھی۔ بی فتن کے ہاں اتری تھی، اب وہ پٹودی کو اپنے بیٹے کے پاس گئی۔ کہتی تھی کہ نصیبِ اعدا ناظر جی بہت بیمار ہیں۔ خدا خیر کرے۔ یوسف مرزا! میری جان نکل گئی۔ کیا کروں؟ کیوں کر خبر منگاؤں؟ یا علیؑ یا علیؑ یا علیؑ دس بارہ بار دل میں کہا ہوگا کہ مداری کا بیٹا دوڑا ہوا آیا اور تین خط لایا یعنی وہ نیچے حویلی میں تھا۔ ڈاک کے ہرکارے نے خط لاکر دیے۔ نیاز علی اوپر لے آیا۔ ایک خط یارِ عزیز کا اور ایک خط ہرگوپال تفتہ کا اور ایک خط ذوالفقارالدین حیدر مولوی کا۔ میاں قریب تھا کہ خوشی کے مارے مجھ کو رونا آجائے۔ بارے اُس خط کو میں نے آنکھوں سے لگایا، پھیلایا۔ اب تم تماشا دیکھو۔ تیرہ محرم کا خط سترہ کو مجھے پہنچا۔ اُس میں مندرج کہ جمعے کے دن انیس کو بہ سبیلِ ڈاک کلکتے جاؤں گا اور پھر حضرت مجھ سے مطالب کا جواب مانگتے ہیں، ہاں جب کلکتے پہنچ لیں گے اور وہاں سے مجھ کو خط بھیجیں گے اور اپنے مسکن کا پتا لکھیں گے، تب جو کچھ مجھ کو لکھنا ہوگا، لکھوں گا۔ آغا صاحب کو سب خط سنا دیا اور اُن کو اسی وقت کاشی ناتھ کے پاس بھیجا ہے تاکہ وہ اس کو گرمائیں اور شرمائیں اور کچھ سجاد مرزا کے واسطے بھجوائیں۔ ضیاءالدین خاں دو ہفتے سے یہاں ہیں۔ اپنے باغ میں اترے ہوئے ہیں۔ دو بار میرے پاس بھی دو دو گھڑی کے واسطے آئے تھے۔ کچھ اُن کو منظور ہے۔ رعایتِ اخلاص و محبتِ قدیم۔ خدا چاہے تو کچھ سجاد مرزا کو اور کلکتے سے اُن کے خط کے آنے کے بعد کچھ ناظر جی کو اُن سے بھجواؤں۔

میرا وہی حال ہے۔ بھوکا نہیں ہوں مگر کسی کی خدمت گزاری کی توفیق نہیں ہے۔ بُرے بھلے حال سے گزرے جاتی ہے۔ افسوس ہزار افسوس، جو تم سے اور ناظر جی سے میرے دل کا حال ہے، اگر کہوں تو کون باور کرے؟ اور وہ بات خود کہنے کی نہیں، کرنے کی ہے، سو کرنے کا مقدور نہیں۔

تفضل حسین خاں ابن غلام علی خاں میرٹھ میں اپنے ماموں کے پاس ہے۔ شہر میں آیا تھا۔ میرے پاس بھی آیا تھا۔ تمھارا سلام کہہ دیا۔ پرسوں پھر وہ میرٹھ گیا۔

بھائی فضلو عرب سرا میں رہتے ہیں۔ پرسوں سے آئے ہوئے ہیں۔ یہیں اُترے ہوئے ہیں۔ دوڑتے ہیں۔ عرضیاں دیتے پھرتے ہیں، کوئی سنتا نہیں۔ تم کو سلام کہتے ہیں۔

آمدورفت کا ٹکٹ موقوف ہو گیا۔ فقیر اور ہتھیار جس پاس ہو وہ نہ آئے اور باقی ہندو، مسلمان، عورت، مرد، سوار، پیادہ، جو چاہے چلا آئے، چلا جائے مگر بغیر آبادی کے ٹکٹ کے، رات کو شہر میں رہنے نہ پائے۔ وہ شور و غل تھا کہ سڑکیں نکلیں گی اور گوروں کی چھاؤنی شہر میں بنے گی۔ کچھ بھی نہ ہوا مرپٹ کر ایک جاں نثار خاں کے چھتّے کی سڑک نکلی ہے۔ دلّی والوں نے لکھنؤ کا خاکا اڑا رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ لاکھوں مکان ڈھا دیے اور صاف میدان کر دیا۔ میں جانتا ہوں ایسا نہ ہوگا۔ بات اتنی ہی ہے جو تم نے لکھی ہے۔ بہرحال، اب جو کچھ ہو لکھو اور ناظر جی کے روانہ ہو جانے کی خبر اور سجاد اور اکبر اور اُن کی ماں کی خیریت اور اپنے باپ کا حال لکھو۔

پنجشنبہ ۱۸ محرم الحرام ۱۲۷۶ھ

۱۸ اگست ۱۸۵۹ء

(۶)

میری جان!

شکوہ کرنا سیکھو۔ یہ باب میں نے تم کو ابھی پڑھایا نہیں۔ کوئی خط تمھارا نہیں آیا کہ میں نے

اُسی دن یا دوسرے دن جواب نہ لکھا ہو بلکہ میں ایسا جانتا ہوں کہ یہ جو تم نے مجھ کو شکایت نامہ بھیجا ہے۔ اُس کے بعد ایک خط میرا بھی تم کو پہنچا ہوگا۔ یہ خط کل آیا، آج میں اُس کا جواب لکھتا ہوں۔

سنو صاحب! تم جانتے ہو کہ میں چودہ پارچے کا خلعت ایک بار اور ملبوس خاص شالی رومال، دوشالہ ایک بار پیش گاہ حضرت سلطان عالم سے پاچکا ہوں مگر یہ بھی جانتے ہو کہ وہ خلعت مجھ کو دو بار کس کے ذریعے سے ملا ہے؟ یعنی جناب قبلہ وکعبہ حضرت مجتہد العصر مدظلہ العالی۔ اب آدمیت اس کی مقتضی نہیں ہے کہ میں بے اُن کے توسط کے مدح گستری کا قصد کروں۔ چناں چہ قصیدہ لکھ کر اور جیسا کہ میرا دستور ہے کاغذ کو بنوا کر حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں بھیج دیا ہے۔ یقین ہے کہ حضرت نے وہاں بھیج دیا ہوگا اور میں تم کو بھی لکھ چکا ہوں کہ میں نے قصیدہ لکھنؤ کو بھیج دیا ہے۔ اُسی خط میں یہ بھی تم کو لکھا ہے کہ حضرت زبدۃ العلما سید نقی صاحب اگر کلکتے پہنچ گئے ہوں تو مجھ کو اطلاع دو۔ داروغگیِ املاک کے باب میں جو مناسب اور معقول اور واقعی ہے، وہ میں بے پردہ عالی شان مظفر حسین خاں صاحب کے خط میں لکھتا ہوں۔ یہ ورق پڑھ کر اُن کی خدمت میں گزران دو اور جو وہ ارشاد کریں مجھ کو لکھو۔ تمہارے اس خط کے مطالبِ مندرجہ کا جواب ہو چکا۔ اس سے زیادہ میرے پاس کوئی بات اس وقت لکھنے کو نہیں ہے۔ مگر یہ کہ ایک خط تمہارے ماموں صاحب کے نام کا بھیج چکا ہوں۔ اگر وہ پہنچے گا اور خدا کرے پہنچے تو اس سے تم کو ایک حال معلوم ہوگا۔

شنبہ ۵ نومبر ۱۸۵۹ء غالب

(۷)

یوسف مرزا!

میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے؟ غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ

عزت، غمِ مرگ میں قلعۂ نامبارک سے قطعِ نظر کر کے اہلِ شہر کو گنتا ہوں مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، مرزا عاشور بیگ میرا بھانجا، اُس کا بیٹا احمد مرزا انیس برس کا بچہ، مصطفےٰ خاں ابن اعظم الدولہ۔ اُس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں۔ قاضی فیض اللہ۔ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا ہ لے لو، بھول گیا، حکیم رضی الدین خاں، میر احمد حسین میکش اللہ اللہ۔ اُن کو کہاں سے لاؤں ؟ غمِ فراقِ حسین مرزا، یوسف مرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب خدا اُن کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے، گھر اُن کے بے چراغ، وہ خود آوارہ، سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے۔ مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اُن اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔

حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا، اُس کی بیٹی، اُس کے چار بچے، اُس کی ماں یعنی میری بھاوج جے پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ اُن کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیا اور امرا کے ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں۔ اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے۔

اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں، ایک بی بی دو بچے، تین چار آدمی گھر کے۔ کلو، کلیان، ایاز یہ باہر، مداری کے جورو بچے بہ دستور، گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے گئے مہینا بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں۔ بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقامِ معلوم سے کچھ آئے جاتا ہے وہ بہ قدر سدّ رمق ہے محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں، دیو نہیں۔ بھوت نہیں، ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں ؟ بڑھاپا، ضعفِ قوے، اب مجھے دیکھو تو جانو کہ میرا کیا رنگ ہے۔ شاید کوئی دو چار گھڑی بیٹھتا ہوں ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ گویا صاحبِ فراش ہوں، نہ کہیں جانے کا ٹھکانا، نہ کوئی میرے پاس آنے والا — وہ عرق جو بہ قدر طاقت بنائے رکھتا تھا، اب میسر نہیں۔ سب سے بڑھ کر آمد آمد گورنمنٹ کا ہنگامہ ہے۔ دربار میں

جاتا تھا، خلعت فاخرہ پاتا تھا، وہ صورت اب نظر نہیں آتی۔ نہ مقبول ہوں، نہ مردود ہوں، نہ بےگناہ ہوں، نہ گناہ گار ہوں، نہ مخبر، نہ مفسد۔ بھلا اب تم ہی کہو کہ اگر یہاں دربار ہوا اور میں بلایا جاؤں تو نذر کہاں سے لاؤں؟ دو مہینے دن رات خونِ جگر کھایا اور ایک قصیدہ چونسٹھ بیت کا لکھا۔ محمد افضل مصور کو دے دیا۔ وہ پہلی دسمبر کو مجھ کو دے گا۔ یہ اس کا مطلع ہے:

زسالِ نو دگر آبے بروئے کار آمد
ہزار و ہشت صد و شصت در شمار آمد

اس میں التزام اپنی تمام سرگذشت کے لکھنے کا کیا ہے۔ اس کی نقل تم کو بھیجوں گا۔

میرے آقازادۂ روشن گہر جناب مفتی میر عباس صاحب کو دکھانا۔ اس بجھے ہوئے بلکہ مرے ہوئے دل پر کلام کا یہ اسلوب ہے۔

جہاں پناہ کی مدح کی فکر نہ کر سکا۔ یہ قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزرا نہ تھا۔ میں نے اسی میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کو بٹھا دیا۔ خدا نے بھی تو یہی کیا تھا۔ انوری نے بارہا ایسا کیا ہے کہ ایک کا قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دیا۔ میں نے اگر باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام کر دیا تو کیا غضب ہوا اور پھر کیسی حالت اور کیسی مصیبت میں کہ جس کا ذکر بہ طریق اختصار اوپر لکھ آیا ہوں۔ اس قصیدے سے مجھ کو عرضِ دستگاہِ سخن منظور نہیں، گدائی منظور ہے۔

بہر حال یہ تو کہو قصیدہ پہنچا یا نہیں پہنچا؟ پرسوں تمھارے ماموں کا خط آیا۔ وہ قصیدے کا پہنچنا لکھتے ہیں۔ کل تمھارا خط آیا، اُس میں قصیدے کے پہنچنے کا ذکر نہیں۔ اس تفرقے کو مٹاؤ اور صاف لکھو کہ قصیدہ پہنچا یا نہیں؟ اگر پہنچا تو حضور میں گزرا یا نہیں۔ اگر گزرا تو کس کی معرفت گزرا؟ اور کیا حکم ہوا؟ یہ امور جلد لکھو اور ہاں یہ بھی لکھو کہ املاک واقع شہر دہلی کے باب میں کیا حکم ہوا۔

میں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ کل میں نے فرد فہرستِ دیہات و باغات و املاک مع حاصل ہر یک باغ و دہ و ملک ناظر جی کو بھیج دی ہے۔ اس خط سے ایک دن پہلے وہ فرد پہنچے گی۔ یہ

فردکلکٹری کے دفتر سے لی ہے۔ مگر اتنا ہی معلوم رہے کہ شہر کی عمارت بہ سڑک میں نہیں آئی اور برسات میں ڈھ نہیں گئی، وہ سب خالی پڑی ہے۔ کرایہ دار کا نام نہیں۔ مجھ کو یہاں کی املاک کا علاقہ حسین مرزا صاحب کے واسطے مطلوب ہے۔ میں تو پنشن کے باب میں حکم اخیر سُن لوں، پھر رام پور چلا جاؤں گا۔ جمادی الاول سے ذی الحجہ تک آٹھ مہینے اور پھر محرم سے ۱۲۷۷ھ سال شروع ہوگا۔ اس سال کے دو، چار، حد دس گیارہ مہینے، غرض کہ انیس بیس مہینے ہر طرح بسر کرنے ہیں۔ ان میں رنج و راحت و ذلّت و عزّت، جو مقسوم میں ہے، وہ پہنچ جائے اور پھر "علی علی" کہتا ہوا ملکِ عدم کو چلا جاؤں گا۔ جسم رام پور میں اور روح عالمِ نور میں "یا علی، یا علی، یا علی۔"

میاں! ہم تمھیں ایک اور خبر لکھتے ہیں۔ برہما کا پتر دو دن بیمار پڑا۔ تیسرے دن مر گیا۔ ہے ہے۔ کیا نیک بخت غریب لڑکا تھا۔ باپ اُس کا شیوجی رام اُس کے غم میں مردے سے بدتر ہے۔ یہ دو مصاحب میرے یوں گئے۔ ایک مردہ، ایک دل افسردہ۔ کون ہے جس کو تمھارا سلام کہوں؟ یہ خط اپنے ماموں صاحب کو پڑھا دینا اور فرد اُن سے لے کر پڑھ لینا اور جس طرح اُن کی رائے میں آئے، اُس پر حصولِ مطلب کی بنا اُٹھانا اور ان سب مدارج کا جواب شتاب لکھنا۔ ضیاء الدین خاں رہتک چلے گئے اور وہ کام نہ کر گئے۔ دیکھیے آکر کیا کہتے ہیں؟ یا رات کو آگئے ہوں یا شام تک آجائیں۔ کیا کروں کس کے دل میں اپنا دل ڈالوں۔ بہ مرتضیٰ علی پہلے سے نیت میں یہ ہے کہ جو شاہِ اودھ سے ہاتھ آئے حصہ برادرانہ کروں۔ نصف حسین مرزا اور تم اور سجاد۔ نصف میں مفلسوں کا مدار۔ حیات خیالات پر ہے مگر اُسی خیالات سے اُن کا حسنِ طبیعت معلوم ہو جاتا ہے۔ والسلام خیر ختام۔

دوشنبہ دوم جمادی الاول ۱۲۷۶ھ

مطابق ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء وقت صبح

(۸)

میاں!

کل صبح کو تمھارے نام کا خط روانہ کیا، شام کو تمھارا ایک خط اور آیا۔ حضرت زبدۃ العلماء

کا اب تک وہاں نہ پہنچنا تعجب کی بات ہے۔ حق تعالیٰ اُن کو، جہاں رہیں، اپنے حفظ و امان میں رکھے جب چاہیں وہاں پہنچیں۔ میرا مقصود تو اتنا ہی ہے کہ قصیدہ گزرے اور کچھ ہمارے تمھارے ہاتھ آئے لیکن کل کے خط کی پشت پر جو سطریں ناظر جی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں اُس کے دیکھنے سے آس ٹوٹ گئی۔ کچھ ہاتھ آتا نظر نہیں آتا۔

املاک واقع شہرِ دہلی کے سوال کا جواب اب کے بار قلم انداز ہوا۔ مگر یہ اگر کہا جائے گا تو بے شک یہ جواب آئے گا کہ ہم نے تم کو عوض اُن مکانات کے یہ مکانات دیے۔ معاوضہ ہوگیا۔

بھائی! میں پہلے ہی جانتا تھا کہ یہ املاک قتل ہوئی اور وہ سوا لاکھ روپیہ جو علاوہ زرِ مقرر ملا ہے، وہ دلّی کی املاک کا خوں بہا ہے۔ پرسوں ناظر جی کے نام کے سرنامے میں فردِ فہرست مجموع املاک بھیج چکا ہوں۔ خیر یہ وار بھی خالی گیا۔ مولانا غالب علیہ الرحمۃ خوب فرماتے ہیں:

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اُس کی دیکھا چاہیے

تمھارے ماموں صاحب کی دستخطی تحریر نے جو میرا حال کیا ہے، وہ کس زبان سے ادا کروں۔ ہے ہے! حسین مرزا اور یہ کہے کہ میں کہاں جاؤں اور کیا کروں؟ اور مجھ کم بخت سے اُس کا جواب سرانجام نہ ہو سکے! بہت بڑا آسرا تھا اُس سرکار کا، خدمت نہ سہی، عہدہ نہ سہی علاقہ نہ سہی، سو ڈیڑھ سو روپے درماہہ مقرر ہو جانا کیا مشکل تھا۔ دلّی کے آدمی خصوصاً امرائے شاہی ہر شہر میں بدنام اتنے ہیں کہ لوگ اُن کے سائے سے بھاگتے ہیں۔ مرشد آباد بھی ایک سرکار تھی۔ حیدر آباد بہت بڑا گھر ہے مگر بے ذریعہ و واسطہ کیوں کر جاتے؟ اور جائے تو کس سے ملے؟ کیا کہے؟ ناچار وہیں رہو۔ کسی طرح شاہ اودھ کا سامنا ہو جائے اور میں کہاں کی صلاح بتاؤں؟

وہ صاحب رہتک گئے ہیں۔ کل یقین ہے کہ وہ آ گئے ہوں گے۔ نتیجہ تو ابھی خبر نہیں آئی۔

اگر مشیت الٰہی میں ہے تو دسمبر مہینے میں کچھ ظہور میں آجائے گا۔

نواب گورنر جنرل بہادر یقین ہے کہ آج آگرے میں رونق افروز ہوں۔ الور، جے پور، دھول پور، گوالیار، ٹونک، جاورہ چھے رئیسوں کی وہاں ملازمت کی خبر ہے۔ خیر، ہم کو کیا؟ لیث الدولہ حسین علی خاں بہادر کی خدمت میں میرا اسلام نیاز اور شکر یاد آوری۔

مرقومۂ صبح سہ شنبہ ۱۶ نومبر ۱۸۵۹ء

۳ جمادی الاول (بہ حساب جنتری) ۱۲۷۶ھ

(۹)

میاں!

تمھارا خط رام پور پہنچا اور رام پور سے دلّی آیا۔ میں تیئس شعبان کو رام پور سے چلا اور تیس شعبان کو دلی پہنچا۔ اُسی دن چاند ہوا۔ یکشنبہ رمضان کی پہلی۔ آج دوشنبہ نو رمضان کی ہے سوئنواں دن مجھے یہاں آتے ہوتے ہے۔

میں نے حسین مرزا صاحب کو رام پور سے لکھا تھا کہ یوسف مرزا کو میرے آنے تک الور نہ جانے دینا۔ اب اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ میرا خط اُن کو تمھاری روانگی کے بعد پہنچا۔ تم جو مجھ کو اپنے ماموں کے مقدمے میں لکھتے ہو، کیا مجھ کو اُن کے حال سے غافل اور اُن کی فکر سے فارغ جانتے ہو؟ کچھ بنا ڈال آیا ہوں اگر خدا چاہے تو کوئی صورت نکل آئے۔

اب تم کہو کہ کب تک آؤ گے۔ صرف تمھارے دیکھنے کو نہیں کہتا۔ شاید تمھارے آنے پر کچھ کام بھی کیا جائے۔ مظفر مرزا کا اور ہمشیرہ صاحبہ کا آنا تو کچھ ضرور نہیں۔ شاید آگے بڑھ کر کچھ حاجت پڑے۔ بہ ہر حال، جو ہوگا وہ سمجھ لیا جائے گا۔ تم چلے آؤ۔

ہمشیرہ عزیزہ کو میری دعا کہہ دینا۔ مظفر مرزا کو دعا پہنچے۔ بھائی تمھارا خط رام پور پہنچا۔ اِدھر کے چلنے کی فکر میں جواب نہ لکھ سکا۔ بخشی صاحبوں کا حال یہ ہے کہ آغا سلطان پنجاب کو گئے۔ جگراؤں میں منشی رجب علی کے مہمان ہیں۔ جعفر سلطان اور یوسف سلطان وہاں ہیں۔ نواب

مہدی علی خاں بہ قدرِ قلیل بلکہ اقل کچھ اُن کی خبر لیتے ہیں۔ میر جلال الدین خوش نویس اور وہ دونوں بھائی باہم رہتے ہیں۔ میں وہیں تھا کہ صفدر سلطان دلّی کو آئے تھے۔ اب جو میں یہاں آیا تو سنا کہ وہ میرٹھ گئے۔ خدا جانے رام پور جائیں یا کسی اور طرف کا قصد کریں۔ تباہی ہے، قہرِ الٰہی ہے۔ مجھ کو لڑکوں نے بہت تنگ کیا۔ ورنہ چند روز اور رام پور میں رہتا۔ زیادہ کیا لکھوں۔

مرقومۂ دوشنبہ ۹ رمضان ۱۲۷۶ھ

۲ اپریل ۱۸۶۰ء راقم۔ غالب

(۱۰)

آؤ صاحب! میرے پاس بیٹھ جاؤ آج یک شنبے کا دن ہے، ساتویں تاریخ شوّال کی، اور انیسویں اپریل کی۔ صبح کو بھائی فضلو جن کو میر کاظم علی بھی کہتے ہیں اور ہم نے "احتلام الدولہ" خطاب دیا ہے۔ وہ تین پاؤ کھجوریں اور ایک ٹین کا لوٹا اور دو سوت کی رسیاں لے کر بھٹیارے کے ٹٹو پر سوار ہو کر الور کو روانہ ہوئے۔

پہر دن چڑھے ڈاک کا ہرکارہ تمھارا خط میرے نام کا اور ایک حکم نامۂ محکمہ لاہور موسومہ میر کاظم علی لایا۔ یہاں تک لکھ چکا تھا کہ تمھارے ماموں صاحب مع سجاد مرزا تشریف لائے۔ تمھارا خط اُن کو دے دیا۔ وہ اُس کو پڑھ رہے ہیں اور میں یہ خط تم کو لکھ رہا ہوں۔

پہلے تو یہ لکھتا ہوں کہ حکم نامہ میر کاظم علی کو دے دینا اور میری طرف سے تعزیت کرنا کہ بھئی، بھائی صبر کرو اور چپ ہو رہو۔ تاریخ کے دو قطعوں میں ایک قطعہ "ماہرو خوش خرام" کی جگہ "مہ رخ خوش خرام" بنا دیا ہے قطعہ اچھا ہے۔ بہ شرطے آں کہ متوفیہ کا شوہر یہ الفاظ اپنی زوجہ کے واسطے گوارا کرے۔ خواجہ جان جھوٹ بولتا ہے والیِ رام پور کو اس پنشن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں۔ یہ کام خدا ساز ہے، یہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام۔

ناظر جی نے تمھارے قول کی تصدیق کی اور کہا کہ ہاں مسودہ عرضی کا میرے پاس آ گیا ہے۔ میں تم کو دکھاؤں گا۔ خیر، تم نے جو لکھا ہوگا، وہ مناسب ہوگا۔ خدا راس لائے اور کام بن جائے۔ انگو ندر ہیں لے۔ ساحب میرے دوست کے فرزند ہیں اور نیک بخت اور سعادت مند ہیں۔

میر کاظم علی وغیرہ کی تنخواہ میں میری سپارش کو دخل نہیں ہے۔ تم میر کاظم علی سے دریافت کر لو۔ ہاں، دو مقدموں میں، میں نے اُن کو دو خط لکھے مگر انھوں نے ایک کا بھی جواب نہیں لکھا اور اُن مقدموں میں کوشش بھی نہیں کی۔ اب اس کو سمجھ کر جو کچھ تم لکھو اُس کے موافق عمل میں لاؤں۔

ناظر جی صاحب اور سجاد مرزا اپنے گھر گئے۔ وہ تم کو دعا اور سجاد بندگی کہہ گیا ہے۔

اپنے آنے میں جلدی نہ کرو، ماں کی رضا جوئی کو سب امور پر مقدم جانو۔

میں ابھی رام پور نہیں جاتا۔ برسات بعد بہ شرط حیات جاؤں گا یعنی اواخر اکتوبر یا اوائل نومبر میں قصد ہے۔

یقین ہے کہ یہ خط، دو دن میر کاظم علی کے پہنچنے سے پہلے، تمھارے پاس پہنچے۔ اُن کے نام کا حکم نامہ بہت احتیاط سے اپنے پاس رہنے دینا۔ خبردار جاتا نہ رہے۔ جب وہ پہنچیں، تب اُن کے حوالے کرنا۔

صاحب! نہ خمس، نہ نذر، یہ باتیں غیریت کی ہیں۔ جس طرح اپنے اور بچوں کو دوں گا، منظفر مرزا کو اور تم کو بھی اسی طرح بھجوا دوں گا۔ ہمشیرہ عزیزہ کو یعنی اپنی والدہ کو میری دعا کہنا۔

مرقومہ یک شنبہ، وقت نیم روز، ہفتم شوال ۱۲۷۶ھ

۲۹ اپریل ۱۸۶۰ء

غالب

(۱۱)

یوسف مرزا کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ تمھارا خط کل منگل کو پہنچا۔ آج بدھ سترہ شوال اور نومئی کی اُس کا جواب بھیجتا ہوں۔

خدا کی قسم تامس بدرے صاحب سے میری ملاقات نہیں ہے۔ ہاں، الکھ صاحب سے ہے۔ سو اُن کے نام کا خط کھلا ہوا تم کو بھیجتا ہوں۔ پڑھ کر بند کر کر اُن کو دو اور اُن سے ملو اور جو کچھ وہ کہیں مجھ کو لکھو۔

احتشام الدولہ بھائی فضلو میر کاظم علی بہادر کیا جانے کتاب کس کو کہتے ہیں اور آگرہ کس

ہتھیار کا نام اور سکندر شاہ کون سے درخت کا پھل ہے؟

میر اُردو کا دیوان میرٹھ کو گیا۔ سکندر شاہ لے گئے۔ مصطفےٰ خاں کو دے آئے۔ ڈاک میں اُس کی رسید آگئی۔ نہ "برہانِ قاطع" نہ "قاطعِ برہان"۔

کل جس وقت تمھارا خط آیا اُس وقت منشی میر احمد حسین میرے پاس بیٹھے تھے اور اِس وقت سالکؔ مجذوب بیٹھا ہوا ہے۔ یہ دونوں صاحب تم کو اور بھائی فضلو کو سلام کہتے ہیں اور بھائی فضلو سے یہ کہہ دینا کہ بہ اتفاقِ رائے منشی میر احمد حسین، اب باغ کی درخواست کی عرضی بے فائدہ بلکہ مضر ہے۔ تمھارا کاغذ قیمتی ایک روپیہ کا منشی جی کے پاس موجود ہے، وہ اُس کو بیچ کر روپیہ تم کو بھجوا دیں گے۔

۱۷ شوال سنہ ۱۲۷۶ھ و ۹ مئی سنہ ۱۸۶۰ء غالب

(۱۲)

یوسف مرزا!

کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو، مگر صبر؟ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجا کٹ گیا ہے اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپے۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سر و پا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔

تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ یہ بات سچ ہے؟ اگر سچ ہے تو جواں مرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا، نہ قیدِ حیات رہی، نہ قیدِ فرنگ۔ ہاں صاحب، وہ لکھتی ہیں کہ پنسن کا روپیہ مل گیا تھا۔ وہ تجہیز و تکفین کے کام آیا۔ یہ کیا بات ہے؟ جو مجرم ہو کر چودہ برس کو مقید ہوا ہو، اس کا پنسن کیوں کر ملے گا اور کس کی درخواست سے ملے گا؟ رسید کس سے لی جائے گی؟ مصطفےٰ خاں کی رہائی کا حکم ہوا مگر پنسن ضبط۔ ہر چند اس پرسش سے کچھ حاصل نہیں۔

لیکن بہت عجیب بات ہے۔ تمھارے خیال میں جو کچھ آئے وہ مجھ کو لکھو۔

دوسرا امر یعنی تبدیل مذہب، عیاذاً باللہ! علی کا غلام کبھی مرتد نہ ہوگا۔ ہاں یہ ٹھیک کہ حضرت چالاک اور سخن ساز اور ظریف تھے۔ سوچے ہوں گے کہ ان دموں میں اپنا کام نکالو اور رہا ہو جاؤ۔ عقیدہ کب بدلتا ہے۔ اگر یہ بھی تھا تو ان کا گمان غلط تھا۔ اس طرح رہائی ممکن نہیں۔ قصہ مختصر، تمھاری دادی کا خط، جو تمھارے بھائی نے مجھ کو بھیجا تھا، وہ میں نے تمھارے ماموں کے پاس بھیج دیا۔ اُن کی جاداد کی واگذاشت کا حکم تو ہوگیا ہے، اگر اُن کے بڑے بھائی کے یار اُن کو چھوڑیں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔

منظفر مرزا کو دعا پہنچے۔

تمھارا خط جواب طلب نہ تھا۔ تمھارے چچا کا آغاز اچھا ہے، خدا کرے انجام اسی آغاز کے مطابق ہو۔ ان کا مقدمہ دیکھ کر تمھاری پھوپھی کا اور تمھارا سرانجام دیکھا جائے گا کہ کیا ہوتا ہے۔ ہوگا کیا؟ اگر جاداد یں مل بھی گئیں تو قرض دار دام دام لے لیں گے۔ رزاق حقیقی پنسن دلوادے کہ روٹی کا کام چلے۔

جناب میر قربان علی صاحب کو میرا سلام نیاز اور میر کاظم علی کو دعا۔

مرقومۂ شنبہ ۲۷ شوال سنہ ۱۲۷۶ھ

۱۹ مئی سال حال سنہ ۱۸۶۰ء   غالب

مولوی احمد حسن قنوجی

(۱)

یارب یہ ایک خط جو مجھ کو بڑودہ، گجرات سے آیا ہے، کاتب نے اپنے کو احمد حسن قنوجی بتایا ہے۔ اُدھر سے اظہارِ آشنائی ہے، میری طرف سے یہ بے حیائی ہے کہ مجھ کو اُن کی اور اپنی ملاقات یاد نہیں آتی۔ سوچتا ہوں کوئی بات یاد نہیں آتی۔ خانۂ نسیاں خراب عشرہ قتالہ کے مرحلے کا رہ نما ہوں۔ شاید اگر جیوں گا تو اس کا بھی مجھ کو علم نہ رہے گا کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ حواسِ ظاہری میں سے سامعہ و شامہ باطل، حواسِ باطنی میں سے حافظہ زائل۔ بہ سبب نسیاں کے، اکثر مطالبِ ضروری تلف ہو جاتے ہیں، خدایا کیا اس عمر میں سب آدمی ایسے خرف ہو جاتے ہیں۔ حیران ہوں کہ آپ کو سیّد لکھوں، مولوی لکھوں، خاں لکھوں، خط میں تو خیر کچھ لکھ دوں گا۔ خط کا کیا عنوان لکھوں؟

بندہ پرور! فقیر معاف رہے۔ حضرت کا دل غبارِ کدورت سے صاف رہے۔ مولوی عبدالجمیل صاحب بریلوی کو جانتا ہوں بلکہ اُن کا احسان مانتا ہوں کہ باوجود عدمِ ملاقاتِ ظاہری، اکثر اُن کے خطوط آتے رہتے ہیں، گویا وہ اپنا نام ہمیشہ مجھ کو یاد دلاتے رہتے ہیں۔ نہ آپ کہ بعد ایک عمر کے ناگاہ بہ نامہ یاد فرمائیں اور اپنی اور میری ملاقات کا زمانہ یاد نہ دلائیں۔ بہ ہر حال تمہارا دعا گو ہوں، خیریت جُو ہوں۔ اس خط کے جواب میں ایسا کچھ لکھو کہ تم کو پہچان

جاؤں۔ کب ملے تھے، کے ملاقاتیں ہوئی تھیں، یہ سب مدارج جان جاؤں۔

نثر کے شیوہ و انداز کا تو ڈھنگ اچھا ہے۔ خود تمھاری تحریر سے معلوم ہوا کہ شاعر بھی ہو۔ شاعر ہو تو تخلص کیا ہے؟

نامہ نگار کا حال بہ سبیلِ اجمال یہ ہے کہ سیاست سے محفوظ رہا ہوں اور حکام کی عنایت سے ملحوظ رہا ہوں۔ بے وفائی کا داغ نہیں لگا ہے۔ پنسنِ قدیم کو بہ دستورِ حکمِ اجرا ہے۔ زندگی کا رنگ اب تک اچھا دیکھتا ہوں، دیکھیے مرنے کے بعد کیا دیکھتا ہوں۔

یہ مکرم مخدوم آپ کے ہم نام یعنی جناب مولوی احمد حسن صاحب عالی مقام ظاہرا بہت درویش نواز ہیں کہ اس گمنام گوشہ نشین کو حضرت نے سلام لکھا ہے۔ میری طرف سے سلام بہ اشتیاقِ تمام پہنچائیے۔ والسلام۔

راقم جواب نامے کا طالب

۱۸۶۰ء[۱۱]

اسد اللہ المتخلص بہ غالب

(۲)

مخدوم مکرم مولوی سید احمد حسن خاں صاحب باور کریں کہ یہ درویش گوشہ نشین تمھارا دوست اور تمھارا دعا گو ہے۔ تمھاری نثر کی طرز پسند۔ تمھاری خواہش مقبول۔ جناب حکیم سید احمد حسن صاحب کی خدمت گزاری منظور:

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

بیتسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ اضمحلالِ قویٰ، ضعفِ دماغ، فکرِ مرگ، غمِ عقبیٰ۔ جو آپ مجھے دیکھ گئے ہیں، میں اب وہ نہیں ہوں۔ نظم و نثر کا کام صرف پچاس برس کی مشق کے زور سے چلتا ہے، ورنہ جوہرِ فکر کی رخشندگی کہاں؟ بوڑھا پہلوان پیچ بتاتا ہے زور نہیں دلوا سکتا۔ بہرحال حکیم صاحب کو میرا سلام کہیے اور کہیے کہ آپ بے تکلف اپنا کلام بھیج دیا کریں۔ یہاں سے بعد حک و اصلاح خدمت میں پہنچ جایا کرے گا۔

۲۱ستمبر ۱۸۶۰ء

غالب

مرزا شمشاد علی بیگ رضوانؔ

(۱)

فرزندِ دلبند شمشاد علی بیگ خاں کو، اگر خفا نہ ہوں تو دعا اور اگر آزردہ ہوں تو بندگی۔ غازی آباد سے جا کر طبعِ اقدس ناساز ہو گئی:

از آمدنِ کعبہ پشیماں شدہ باشی

قربان علی بیگ خاں کو دعا کہنا۔ مرزا تفضل حسین خاں کو دعا کہنا اور اُن کا حال لکھنا۔ آج شنبہ چار نومبر کی ہے۔ پرسوں نواب صاحب دورے کو گئے ہیں فرما گئے ہیں کہ دو ہفتے میں آؤں گا۔ آکر چار روز یہاں رہیں گے، پھر نمایش گاہ بریلی کی سیر کو جائیں گے۔ وہاں سے پھر کر جب آئیں گے تو صاحب کمشنر بریلی کا انتظار فرمائیں گے۔ وہ پنجم دسمبر تک آجائیں گے۔ تین دن جشن رہے گا۔ اُس کے دو چار روز بعد غالبؔ رخصت ہو گا۔ خدا کرے تم تک زندہ پہنچ جائے۔ پیر جی بہت یاد آتے ہیں۔ اُن کو دعا کہنا اور یہ کاغذ پہلے تم پڑھنا، پھر سالکؔ کو پڑھانا، پھر میاں خواجہ امان اور حکیم رضا خاں کو دکھانا پھر مرزا تفضل حسین خاں کے پاس لے جانا۔

اس قصیدے کے ساتھ کی نثر نواب ضیاء الدین خاں یا مرزا ثاقبؔ سے مانگ لینا اور اُس کی نقل کر لینا۔

اور "قاطع برہان" کا حال لکھنا۔ میں نے تیس روپے کی ہنڈوی، سو روپیے کی باقی، حکیم جی

کو بھیج دی ہے۔ حضرت نے رسید کبھی نہیں لکھی۔ اُن سے رسید لکھوا بھیجو اور سب جلدوں کے شیرازے بندھ جائیں اور موٹا کاغذ دونوں طرف لگ جائے۔ خبردار، کوئی نسخہ بے جلد نہ رہے۔ تین سو مجلّد کے تیار ہونے کی خبر اور بقیہ حساب میرے پاس بھیج دینا۔ یا روپیہ فوراً بھیج دوں گا یا آکر دوں گا۔

گورنر کا حال لکھو۔ کون کون حاضر ہوا؟ کس کس کی ملاقات ہوئی؟ فرخ سیر کے دادا صاحب آئے ہیں یا نہیں؟ اگر آئے ہیں تو روداد مفصل لکھو۔

ہاں بھائی! ٹونک والے سید سراج احمد کا بھی حال ضرور لکھنا۔ علی نقی خاں، وزیر شاہِ اودھ کی حقیقت بھی ضرور لکھنا اور مجھ کو ان مقاصد کے جواب کا منتظر سمجھنا۔ آج شنبہ چوتھی نومبر کی ہے۔ آٹھ دن میں خط کی آمد و شد یقینی ہے۔ نو دن راہ دیکھوں گا۔ دسویں دن اگر تمھارا خط نہ آیا تو میں تمھارا رافضی بن جاؤں گا۔

شنبہ ۴ نومبر ۱۸۶۵ء مطالبِ مندرجہ کے جواب کا طالب۔ غالب

(۲)

مرزا!

رسمِ تحریرِ خطوط بہ سببِ ضعف ترک ہوتی جاتی ہے۔ تحریر کا تارک نہیں ہوں بلکہ متروک ہوں۔ اب مجھے ویسا نہ سمجھو جیسا چھوڑ گئے ہو۔ رام پور کے سفر میں تاب و طاقت، حسنِ فکر، لطفِ طبیعت، یہ سب اسباب لُٹ گیا۔ اگر تمھارے خط کا جواب نہ لکھوں تو محلِ ترحم ہے، نہ مقامِ شکایت، سنو، میرے خط نہ پہنچنے سے تم کو تشویش کیوں ہو؟ جب تک زندہ ہوں۔ غمزدہ و افسردہ، ناتواں و نیم جاں ہوں۔ جب مر جاؤں گا تو میرے مرنے کی خبر سُن لو گے۔ پس جب تک میرے مرنے کی خبر نہ سنو، جانو کہ غالب جیتا ہے خستہ و تژند، رنجور و دردمند۔

یہ سطریں لکھ کر اس وقت تمھارے بھائی پاس بھیجتا ہوں مگر اُن کو ہمیشہ سفر در وطن ہے۔ بہ فرضِ محال اگر گھر میں ہیں تو عنایت اللہ اُن کو ورنہ محمد مرزا کو دے آئے گا۔

ربیع الثانی جمعہ کا دن، صبح کا وقت ہے۔

اگست ۱۸۶۶ء

منشی کیول رام ہشیار

غالب خاکسار کہتا ہے کہ شعرائے ایران کلہم اجمعین مسلّم الثبوت ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ سخنورانِ ہند میں امیر خسرو دہلوی بھی ایسے ہی ہیں جیسے اہلِ ایران۔ اہلِ ہند میں امیر خسرو دہلوی نے اہلِ ایران میں رودکی و فردوسی سے لے کر جامی تک اور جامی سے صائب و کلیم تک کسی نے لغت کی کوئی کتاب لکھی ہو، کوئی فرہنگ جمع کی ہو تو ہمیں دکھاؤ۔ اس کو اگر میں نہ مانوں اور سند نہ جانوں تو میں گنہ گار۔

جتنی فرہنگیں اب موجود ہیں، نام ان کے کہاں تک لوں۔ مشہور و غیر مشہور کچھ کم سو رسالے ہوں گے۔ ان سب رسالوں کے جامع ہندی ہیں۔ کوئی اہلِ زبان نہیں ہے۔ اشعارِ اساتذۂ ایران کو ماخذ ٹھہرا کر جو لغات ان کی نظم میں دیکھے، بہ مناسبتِ مقام ان لغات کے معنی لکھ دیے۔ استنباطِ معنی کا مدار قیاس پر۔ یہ میں نہیں کہتا کہ قیاس ان کا سراسر غلط۔ میرا قول یہ ہے کہ کمتر صحیح اور بیشتر غلط ہے۔

ان سب فرہنگ لکھنے والوں میں یہ دکن کا آدمی یعنی جامعِ "برہانِ قاطع" احمق اور غلط فہم اور معوّج الذہن ہے۔ مگر قسمت کا اچھا ہے مسلمان اس کے قول کو آیت اور حدیث جانتے ہیں اور ہندو اس کے بیان کو مطالبِ مندرجۂ بید کے برابر مانتے ہیں۔

"گیا" اور "گیاہ" بہ کافِ فارسی مکسور سبز گھانس کو کہتے ہیں۔ "گیا" بہ کافِ فارسی مفتوح کوئی

لغت فارسی نہیں ہے، ہرگز نہیں ہے۔ مولوی رومؔ اور حکیم سنائیؔ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے شعر کس نے دیکھے ہیں کہ انھوں نے اپنے ہاتھ سے کاف پر دو مرکز اور فتحہ بنا دیا ہو۔ فرہنگ نویسوں کی رائے کی تباہی اور قیاس کی غلطی ہے، جو ایسا سمجھے ہیں۔ نہ "گیا" بہ معنیٰ وہ ہے نہ "گیا" بہ معنی مقدم وہ ہے نہ "گیا" بہ معنی پہلوان ہے نہ کا۔ "گیا" کوئی لفظ ہے نہ کوئی لغت ہے۔

"کَے" بہ کافِ عربی مفتوح بروزنِ "مے" ایک لغتِ فارسی ہے۔ ذومعنین یعنی دو معنی دیتا ہے ایک تو "کب" یعنی "کس وقت" اور دوسرے معنی اُس کے ہیں "حاکم" اور "مالک" "کے" الف جو اُس کے آگے آتا ہے، وہ کثرت کے معنی دیتا ہے، جیسے "خوشا" بہت خوش، "بدا" بہت بد، "کَیا" بڑا حاکم:

عشق آں بگزیں کہ جملہ اولیا
یافتند از عشق او، کار کیا

یعنی بہ سببِ عشق کار بزرگ یافتند:

سرفرو بردیم تا بر سروراں سرور شدیم
چاکری کردیم تا کار کیائی یافتیم

یہاں بھی وہ "کارِ بزرگ" یعنی "بڑا کام" پس یائے تحتانی اگر مجہول ہے تو تعظیمی ہے۔ اگر معروف ہے تو مصدری ہے۔ یعنی بزرگی کا کام، حکومت کا کام۔ وہ "کیا" مضاف و مضاف الیہ مقلوب ہے، یعنی کیائے دہ" اور" حاکمِ دہ کا" رکیا" مثلہ یعنی کیا ی کار" و" مالک کار۔ جہاں، ماقبل اس کے رائے مکسور لائیں گے، وہاں "کار" موصوف اور "کیا" صفت ہے۔ نہایت تحقیق و اصل حقیقت یہ ہے۔ فقیر نے جہاں "کیا" کے لفظ پر خطِ مستطیل کھینچا ہے وہ علامتِ فتحہ ہے، دوسرا مرکز نہیں، جو کافِ پارسی سمجھا جائے۔

داد کا طالب، داد خواہ۔ غالب

میر افضل علی میرن

(۱)

سعادت و اقبال نشان، میر افضل علی صاحب المعروف بہ میرن صاحب!

خدا تم کو سلامت رکھے اور پھر تمھاری صورت مجھ کو دکھا دے۔

تمھارا خط پہنچا۔ آنکھوں سے لگایا، آنکھوں میں نور آیا۔ دل پر رکھا، مزا پایا۔ کل تک اُس نام کو سن کر شرماتے تھے اور آپ ہی آپ کِھلے جاتے تھے۔ اب بن بن کر باتیں بناتے ہو اور ہم کو کڑیاں سناتے ہو۔ کاشکے تم یہاں آ جاؤ، تب اِس تحریر کا مزا پاؤ۔ میر مہدی صاحب وہ تحریر تمھاری بہ نسبت میرے دیکھ کر، بہت خفا ہوئے، چنانچہ اب جو تمھاری اُن کی ملاقات ہوگی تو تم کو معلوم ہوگا۔

بھائی تمھارے سالے صاحب غرور کے پُتلے ہیں۔ دو ایک بار میں نے اُن کو بلایا، انھوں نے کرم نہ فرمایا۔ تم سچ کہتے ہو، یہ لوگ اور ہی آب و گِل کے ہیں۔ تمھاری ان کی کبھی نہ بنے گی، اور گہری نہ چھنے گی۔ وہیں بیٹھے رہو، دیکھو خدا کیا کرتا ہے۔ اِنشاءاللہ تعالیٰ یہ رنج و عذاب کا زمانہ جلد گزرتا ہے۔

میر سرفراز حسین صاحب کو میری دعا کہنا اور کہنا، بھائی، وہ زمانہ آیا ہے کہ سینکڑوں عزیز راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ سینکڑوں ایسے مفقود الخبر ہوئے کہ اُن کے مرگ و زیست کی خبر نہیں۔ دو چار جو باقی رہے ہیں، خدا جانے کہاں بستے ہیں کہ ہم ان کے دیکھنے کو ترستے ہیں۔ میر نصیر الدین کو

پہلے بندگی، پھر دعا۔

دوشنبہ ۹ نومبر ۱۸۵۸ء نجات کا طالب۔ غالب

بین الظہر والعصر۔ حوالہ میر مہدی طالعمرہ۔

(۲)

برخوردار کامگار میر افضل علی عرف میرن صاحب طالعمرہ!

بعد دعا کے واضح براے سعادت انتماے ہو، آپ کا خط پہنچا۔ اگرچہ میں نے صرف پڑھا، میر مہدی کے جلانے کو لکھتا ہوں کہ میں نے آنکھوں سے لگایا۔

ہاں صاحب! تم نے جو لکھا ہے کہ قبلہ و کعبہ کہنے سے وہ صاحب بہت خوش ہوتے ہیں۔ کیوں نہ خوش ہوں؟ خوشی کی بات ہے۔ تمھارے سر کی قسم، میں گویا دیکھ رہا ہوں اور میری نظر میں پھر رہا ہے، وہ میر سرفراز حسین کا شرما کر آنکھیں نیچی کرنی اور مسکرانا۔ خدا کبھی مجھ کو بھی وہ صورت دکھائے۔

میر نصیر الدین یہاں آگئے ہیں۔ تم مجتہد العصر اور حکیم میر اشرف علی کو میری دعا کہنا اور میر مہدی پوچھیں تو کہنا کہ تم کو کچھ نہیں لکھا۔

کل میں نے خبر منگوائی تھی، سو لڑکی کو ابھی تپ آئے جاتی ہے۔

یقین ہے کہ تم نے وہاں پہنچ کر مولوی مظہر علی کو خط لکھا ہوگا۔ ہاں، تم کو ضرور ہے، اُن سے نامہ و پیام کی رسم رکھنی۔ والدعا۔

چار شنبہ ششم جولائی ۱۸۵۹ء غالب

(۳)

میری جان!

تمھارا رقعہ پہنچا۔ نہ کھُلا کہ میر سرفراز حسین جے پور کیوں جاتے ہیں؟ بہرحال میر مہدی کو دعا کہنا اور میر سرفراز حسین سے یہ پوچھنا کہ تم جے پور چلے، میں نے تم کو خدا کو سونپا، تم مجھے کس کو سونپ چلے؟

۲۱ جولائی ۱۸۶۲ء جواب کا طالب۔ غالب

منشی ہیرا سنگھ

(۱)

نورچشم غالبِ غم دیدہ، منشی ہیرا سنگھ کو دعا پہنچے۔ تمھارا خط محررہ گیارہ جنوری پہنچا۔ دورے کا سفر بارے تمام ہوا۔ اب جاڑوں کے دن آرام سے کاٹو۔ گھبراؤ نہیں۔ سال بھر پڑھائے جاؤ۔ جب لڑکا شُد وبُد سے آگاہ ہو جائے۔ تب ڈپٹی کمشنر سے ترقی کی درخواست کرنا۔ اگر نائب تحصیل دار ہو جاؤ گے تو رفتہ رفتہ اکسٹرا اسسٹنٹ ہونے کی گنجایش ہے۔ مدرسے کے علاقے میں تو نوکر نہیں ہو جو بابو پیارے لال کو تمھاری بدلی کا اختیار ہو۔ زنہار میں اس باب میں بابو صاحب سے کچھ نہ کہوں گا۔ اور نہ یہ خط تمھارا منشی جواہر سنگھ کو دکھلاؤں گا۔ ناحق اُلجھو کیوں؟ اس اُلجھنے سے فائدہ کیا؟ خاطر جمع رکھو:

کہ رحم گر نکند مدعی، خدا بکند

میں ویسا ہی ہوں جیسا تم دیکھ گئے ہو اور جب تک جیوں گا ایسا ہی رہوں گا۔

۱۴ جنوری ۱۸۶۸ء — غالب

(۲)

فرزندِ دل بند سعادت مند منشی ہیرا سنگھ کے حق میں میری دعائیں قبول ہوں اور اُن کے جتنے مطالب و مآرب ہیں، وہ عنایتِ الٰہی سے پورے ہوں۔ بھائی، ”لبِ ساحل“ کی سند پر

یہ شعر ہے طالب آملی کا:

مدتے آں گدائے خونیں دل
بود بتحالۂ لبِ ساحل

"لبِ بام" "لبِ فرش" "لبِ گور" "لبِ چاہ" "لبِ دریا" "لبِ ساحل" بہ معنی کنارے کے ہے مستعمل اہلِ ایران۔ "لبِ بام" اُس مقام کو کہتے ہیں کہ جہاں ایک قدم آگے بڑھائے تو دھم سے انگنائی میں آئے۔ پس "لبِ دریا" اسے سمجھے، جہاں سے قدم بڑھائے تو پانی میں جائے۔ "لبِ ساحل" وہ ہوا جہاں سے آگے بڑھیے تو دریا میں گریے۔ "لبِ دریا" سے پاؤں پانی پر رکھا جاتا ہے۔ جیسا نہانے کے واسطے اور "لبِ ساحل" سے دریا میں کودتے ہیں جس طرح سلطان جی کی باؤلی میں "لبِ بام سے تیراک کودتے ہیں۔ اسی طرح تیراک، جہاں دریا کا پانی نشیب میں ہوتا ہے وہاں کڑاڑی کے کنارے پر سے کودتے ہیں۔ کڑاڑ "ساحل" اور کڑاڑے کا کنارا "لبِ ساحل" جو صاحب کہ "لبِ ساحل" کو صحیح نہیں جانتے کیا وہ طالب آملی کو بھی نہیں مانیں گے؟ اور اس لفظ پر اعتراض کرنے کا سبب یہ ہے کہ ان بے چاروں نے سوائے "گلستاں" "بوستاں" کے کوئی فارسی کی کتاب نہیں دیکھی۔ اگر مدت تک قدما کی تصنیفات نظر میں رکھیں گے تو یقین ہے کہ دیکھ لیں گے۔ فقط۔

نجات کا طالب۔ غالب

پیارے لال آشوب

(۱)

جنابِ بابو صاحب، جمیل المناقب عمیم الاحسان، سلامت۔

نیازِ مہر کیشانہ و دعاے درویشانہ قبول فرمائیں۔ ایک دن پہلے تفقد نامہ اور دوسرے دن نسخۂ "اعجازِ ہنگامہ" پہنچا۔ نظر اس تقدیم و تاخیر پر خط کو پھول اور کتاب کو پھل سمجھا۔ پھول سے نشاطِ تازہ اور پھل سے لذتِ بے اندازہ پائی۔ جامِ جم جہاں نما ہوگا مگر کیا جانیے، کیا ہوگا بلکہ اسی میں تردد ہے کہ نہ ہوگا یا ہوگا۔ "جامِ جہاں نما" یہ کتاب ہے جس سے ہر دیدہ ور بہرہ یاب ہے۔ یہاں تو میں مدح میں قاصر رہا۔ یہ میں نے کیا کہا۔ جس طرح ہر دیدہ ور پڑھ کر حظ اٹھا سکتا ہے، نابینا بھی سن کر لطف پا سکتا ہے۔ فیض اس کتاب کا عام ہے۔ "جامِ جہاں نما" اس کا سچا نام ہے۔

اسسٹنٹ کمشنر صاحب بہادر کی خدمت گزاری اور اشاعتِ علم میں مددگاری ذریعۂ عزّ و افتخار ہے، مگر فقیر میں تین عیب ہیں، ستّر برس کی عمر، کانوں سے بہرا، ہمیشہ بیمار، آمد و رفتِ دوام میں قاصر رہے گا۔ یہ نہیں ہے کہ نہ جاؤں گا مگر حسب الطلب یا حسبِ ضرورت کارگزار و فرمانبردار رہوں گا۔ بہ ہر صورت تعجب ہے کہ صاحب اسسٹنٹ بہادر نے مجھے کیوں نہ کہا، بلا کیوں نہ لیا؟ یقین ہے کہ جب آپ یہ خط اپنے نام کا حضرت کی خدمت میں بھجوا دیں گے تو وہ مجھے

بے تکلف بلالیں گے۔

اوائل اگست ۱۸۶۵ء؁ عنایت کا طالب۔غالب

(۲)

شفیق مکرم!

بابو پیارے لال صاحب کو سلام۔کل رقعہ مع مسودہ بابو چندو لال صاحب کے پاس پہنچ گیا۔یقین ہے کہ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا اور آپ مسودہ کرنے پر متوجہ ہوئے ہوں گے۔جلدی نہیں، آپ بہ غور اچھی طرح تامل سے لکھیے۔جب صاف ہو جائے گا، مجھے دیجیے گا۔میں اپنی مہر کر کے ڈاک میں بھجوادوں گا۔

ابھی ڈپٹی کمشنر بہادر کے پاس سے آیا ہوں۔وہ کہتے تھے کہ کل لارڈ صاحب آئیں گے اور پرسوں شملے کو تشریف لے جائیں گے۔بہ طریقِ اطلاع آپ کو لکھا ہے۔یہ منظور نہیں کہ غرضی آج تیار ہو جائے اور کل میں آپ دوں۔ڈاک میں ارسال کرنا منظور ہے۔

۳ اپریل ۱۸۶۶ء؁ راقم۔اسد اللہ خاں غالب

(۳)

فرزندِ ارجمند اقبال بلند بابو ماسٹر پیارے لال کو غالبِ ناتواں نیم جاں کی دعا پہنچے۔ لاہور پہنچ کر تم نے مجھے خط نہ بھیجا، اس کی میں جتنی شکایت کروں بجا ہے۔تم نہیں جانتے کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔میں تمھارا عاشق ہوں اور کیوں کر نہ عاشق ہوں، صورت کے تم اچھے، سیرت کے تم اچھے، شیوہ و روش کے تم اچھے۔خالق نے خوبیاں تم میں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہیں۔ اگر میرا صلبی فرزند ایسا ہوتا، جیسے تم ہو تو میں اس کو اپنا فخرِ خاندان سمجھتا اور اب تم جس قوم اور جس خاندان میں ہو اس قوم اور اس خاندان کے ذریعۂ افتخار ہو۔خدا تم کو سلامت رکھے اور عمر و دولت و اقبال و جاہ و جلال عطا کرے۔

میاں! تم کو یاد ہے کہ میں نے تم کو سابق اس سے نورِ چشم مرزا یوسف علی خاں کے باب

میں کچھ لکھا ہے۔ میرے اختلالِ حواس کا حال تم جانتے ہو۔ خدا جانے اُس وقت کس خیال میں تھا اور میں کیا لکھ گیا۔ وہ جو کچھ لکھا وہ سہل انگاری تھی، اب جو کچھ لکھتا ہوں یہ راست گفتاری ہے۔ مختصر یہ یعنی مرزا یوسف علی خاں عزیز بڑے عالی خاندان اور بڑے بزرگ قوم کے ہیں۔ شاعر بھی بہت اچھے ہیں، شعر خوب کہتے ہیں۔ صاحبِ استعداد ہیں۔ علم ان کو اچھا ہے۔ یہ بھی گویا فرقۂ اہلِ علم و فضل میں سے ہیں اور ترقی کے قابل ہیں۔

نورِ چشم مولوی میر نصیر الدین کو میری دعا کہنا۔

محررۂ ۳۰ جنوری ۱۸۶۸ء

(۴)

یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ آئینہ عبارت فولاد کے آئینے سے ہے ورنہ حلبی آئینوں میں جوہر کہاں اور اُن کو صیقل کون کرتا ہے۔ فولاد کی جس چیز کو صیقل کرو گے، بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑے گی۔ اُس کو الف صیقل کہتے ہیں۔ جب یہ مقدمہ معلوم، تو اب اس مفہوم کو سمجھیے۔

چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

یعنی ابتدائے سنِ تمیز سے مشقِ جنوں ہے اب تک کمالِ فن نہیں حاصل ہوا۔ آئینہ تمام صاف نہیں ہو گیا۔ پس، وہی ایک لکیر صیقل کی جو ہے سو ہے۔ چاک کی صورت الف کی سی ہوتی ہے، اور چاک جیب آثارِ جنوں میں سے ہے۔

غالب

(۵)

کیوں صاحب! ہم سے ایسے خفا ہو گئے کہ ملنا بھی چھوڑا۔ خیر، میری تقصیر معاف کر دو اور اگر ایسا ہی گناہِ عظیم ہے کہ کبھی نہ بخشا جائے گا تو وہ گناہ میرا مجھ پہ ظاہر کر دو تا کہ میں اپنے قصور پر

اطلاع پاؤں۔

برخوردار ہیرا سنگھ تمھارے پاس پہنچتا ہے اور یہ تمھارا دست گرفتہ ہے۔ رہتک میں تم نے اسے نوکر رکھوا دیا تھا، خیر، وہاں کی صورت بگڑ گئی۔ اب یہ غریب بہت تباہ ہے اور امورِ معاش میں سخت دل تنگ، تمھی دستگیری کرو تو یہ سنبھلے ورنہ اس کا نقشِ ہستی صفحۂ دہر سے مٹ جائے گا۔

والسلام۔

عنایت کا طالب۔ غالب

محمد زکریا خاں زکیؔ دہلوی

بندہ پرور!

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ آپ از روے شرافت نسبی و لیاقت حسبی آفتاب و مہتاب ہیں، آپ کا کیا کہنا ہے۔ اس عمر میں علم و فضل میں وہ پایہ بلند حاصل کیا ہے کہ دوسروں کو یہاں تک پہنچنا مشکل ہے۔

مثنوی کے اشعار میں نے دیکھے اور پسند کیے۔ بہ طریقِ سہلِ ممتنع کہے ہیں۔ اردو فصیح، عبارت سلیس، الفاظ نہایت سنجیدہ و متین، حرف حرف شستہ و رفتہ، جو خوبیاں نظم میں چاہئیں، وہ سب موجود مگر میری مدح میں اتنا مبالغہ کیوں کیا۔ میں تو اقلیمِ سخن کا گداے خاک نشین ہوں، شہنشاہ کہاں سے ہو گیا۔ خیر، آپ کی ارادت میرے لیے موجبِ سعادت ہے۔ جو صاحب شعر میں خود ستائی کو بُرا جانتے ہیں کیا انھوں نے "یجوز للشاعرِ مالا یجوز لغیرہٖ" نہیں سنا ہے یا اساتذۂ مستند الکمال کا فخریہ کلام اُن کی نظر سے نہیں گزرا۔ اللہ اللہ اس امرِ خاص میں کیا کیا بلند پردازی اور اپنے کلام کی کیسے کیسے مدح طرازی کی ہے۔ شیداے عالمگیری کہتا ہے:

چیست دانے بادۂ گلگون مصفّا جوہرے
حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

تین شعر، میں تین شاعروں کے بسبیلِ نمونہ یہاں لکھتا ہوں۔ باقی فائدہ کلامِ اہلِ سخن پر حوالے کرتا ہوں۔ ایک شاعر کہتا ہے :

به اقلیم معنے رسول امینم
سنائی و فردوسی از امتانم

دوسرا اس سے بھی بڑھ کر کہتا ہے :

به ملکِ سخن آن خدائے قدیرم
که معنی یکے باشد از بندگانم

تیسرا کچھ اور ہی راگ گاتا ہے :

حوضِ کوثر که مشرب الروحست
ناودانے ز پارگین منست

"ناوداں" بہ معنی "موری" اور "پارگیں" اُس گڑھے کو کہتے ہیں جس میں مطبخ اور حمام وغیرہ کا پانی جمع ہوتا ہے۔ نَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنْ شَطِحَاتِ الشُّعَرَاءِ۔

میر صاحب، میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اس پر امراضِ متضادہ مزمنہ میں گرفتار، قویٰ بالکل مضمحل، اُٹھنا بیٹھنا، لکھنا پڑھنا سب مشکل، احیاناً اگر تحریرِ جواب میں تاخیر ہو جائے معاف رہوں۔ والسلام مع الوف الاحترام۔

۲۹ جنوری ۱۸۶۸ء
بروز چہار شنبہ

دعائے خیر کا طالب۔ فقیر غالب

یوسف علی خاں عزیز

(۱)

بھائی!

تم کیا فرماتے ہو؟ جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو۔ واقعی غدر میں میرا گھر نہیں لٹا مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا۔ ہاں، بھائی ضیاء الدین خاں صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب ہندی اور فارسی نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں؟
ہاں، تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ مئی کی گیارھویں ۱۸۵۷ء سے جولائی کی اکتیسویں ۱۸۵۸ء تک پندرہ مہینے کا اپنا حال میں نے نثر میں لکھا ہے اور وہ نثر فارسی زبانِ قدیم میں ہے کہ جس میں کوئی لفظ عربی نہ آئے اور ایک قصیدہ فارسی متعارف، عربی اور فارسی ملی ہوئی زبان میں، حضرت فلک رفعت جنابِ ملکۂ معظمۂ انگلستان کی ستایش میں اُس نثر کے ساتھ شامل ہے۔ یہ کتاب مطبعِ مفیدِ خلائق آگرہ میں منشی نبی بخش صاحب حقیر اور مرزا حاتم علی بیگ مہر اور منشی ہرگوپال تفتہ کے اہتمام میں چھاپی گئی ہے۔ فی الحال مجموعہ میری نظم و نثر کا اُس کے سوا اور کہیں نہیں۔ اگر جناب منشی امیر علی خاں صاحب میرے کلام کے مشتاق ہیں تو یہ نسخہ موسوم بہ "دستنبو" مطبعِ مفیدِ خلائق سے منگا لیں اور ملاحظہ فرمائیں۔

۱۸۵۹ء

(۲)

میاں!

کل زین العابدین فوقؔ کا خط، مع اشعار کے، ٹکٹ دار لفافے کے اندر رکھ کر بہ سبیلِ ڈاک بھجوا دیا ہے، آج صبح کو تمھارا خط آیا۔ دوپہر کو میں نے جواب لکھا تیسرے پہر کو روانہ کیا۔ "موتیوں کا پھُنکا" البتہ بہت مناسب ہے، خیر "موتیوں کا نوالہ" بھی سہی۔

حافظ کے شعر کی حقیقت جب سمجھو گے کہ قواعدِ مقررۂ اہلِ سخن دریافت کرلو گے۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر مطلع میں یا اور اشعار میں قافیے کی احتیاج آپڑے اور اُس کی اطلاع ایک شعر میں کردیں تو وہ عیب جاتا رہتا ہے، جیسا کہ استاد کا قطعہ ہے۔ اُس میں "ریو" "غریو" و "کالیو" قافیہ ہے اور شعرِ اخیر قطعہ کا یہ ہے۔ شعر:

غلط کردم دریں معنے کہ گفتم
زنخدانِ نگارِ خویش را سیو

حالانکہ صحیح "سیب" ہے۔ یہ بائے موحدہ۔ شاعر نے اطلاع دی کہ میں نے غلط کیا "جو سیو" لکھا۔ اسی طرح حافظ فرماتا ہے:

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

حاصل اس کا یہ کہ دیکھ کتنا تفاوت ہے۔ ایک جگہ حرف روی ساکن اور ایک جگہ متحرک مگر یہاں بھی معترض کو گنجایش ہے کہ وہ یہ کہے کہ ہاں تفاوت کو ہم بھی جانتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ تفاوت تم نے کیوں رکھا؟ اس کا جواب پہلا مصرعہ ہے:

صلاحِ کار کجا و منِ خراب کجا

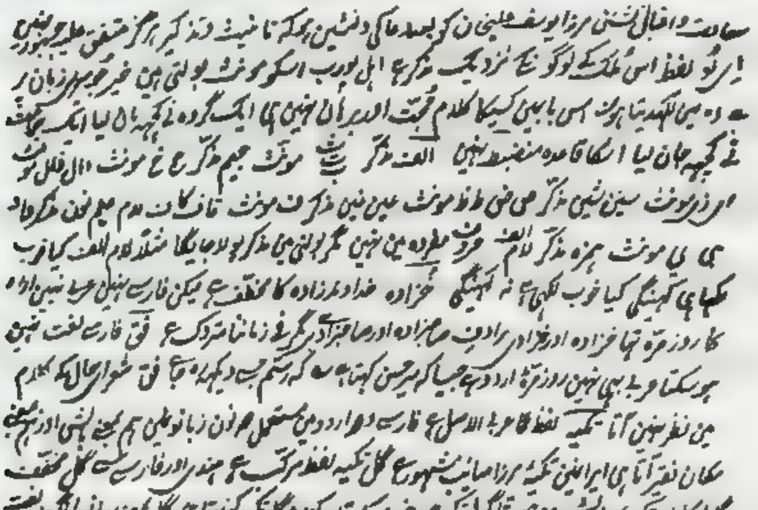
یعنی حافظ فرماتا ہے کہ میں عاشقِ زار و دیوانہ ہوں، صلاحِ کار سے مجھ کو کیا کام ہے؟

پورب کے ملک میں جہاں تک چلے جاؤ گے تذکیر و تانیث کا جھگڑا بہت پاؤ گے۔ "سانس" میرے نزدیک مذکر ہے لیکن اگر کوئی مؤنث بولے گا تو میں اُس کو منع نہیں کرسکتا۔ خود "سانس"

کو مؤنث نہ کہوں گا۔ سیف کو "عدو کش" کہو اور "کمند" کو "عدو بند"۔ "سیف عدو بند" نہیں ہو سکتی۔ تم کو کہتا ہوں کہ تم "تلوار" کو "عدو بند" نہ کہو۔ کوئی اور اگر کہے تو اُس سے نہ لڑو۔ "زلف" کو "شب رنگ" اور "شب گوں" کہتے ہیں۔ "شب گیر" زلف کی صفت ہرگز نہیں ہو سکتی۔ شب گیر اس سفر کو کہتے ہیں کہ پہر چھے گھڑی رات رہے چل دیں۔ نالۂ شب گیر" "آہ و زاریِ آخر شب" کو کہتے ہیں۔ "زلفِ شب گیر" نہ مسموع، نہ معقول۔ سخن کا قافیہ "بُن" بھی درست ہے اور "تَن" بھی جائز ہے۔ یعنی سخن کا دوسرا حرف مضموم بھی ہے اور مفتوح بھی ہے۔ اور اس پر متقدمین اور متاخرین اور اہلِ ایران اور اہلِ ہند کو اتفاق ہے۔ قبہ خشخاش پوست کے ڈوڈے کو کہتے ہیں۔ اس میں کچھ تامل نہ چاہیے۔

تم اپنی تحصیل کی فکر میں رہا کرو۔ زنہار کسی پر اعتراض نہ کیا کرو۔ والدعا۔

(۳)


سعادت و اقبال نشان مرزا یوسف علی خان کو بعد دعا کے دل نشین ہو کہ تانیث و تذکیر ہرگز متفق علیہ جمہور نہیں ...
راقم غالب

سعادت و اقبال نشاں مرزا یوسف علی خاں کو بعد دعا کے دل نشیں ہو کہ تانیث و تذکیر ہرگز متفق علیہ جمہور نہیں۔ اے لو! "لفظ" اس ملک کے لوگوں کے نزدیک مذکر ہے۔ اہلِ پورب اس کو

مونث بولتے ہیں۔ خیر جو میری زبان پر ہے وہ میں لکھ دیتا ہوں۔ اس باب میں کسی کا کلام حجت اور برہان نہیں ہے۔ ایک گروہ نے کچھ مان لیا، ایک جماعت نے کچھ جان لیا۔ اس کا قاعدہ منضبط نہیں۔

الف مذکر، ب، ت، ث، مونث۔ ج مذکر، ح خ مونث۔ دال ذال مونث، رے زے مونث۔ سین شین مذکر، ص ض، ط، ظ مونث۔ عین غین مذکر۔ ف مونث۔ قاف، کاف، لام، میم، نون مذکر۔ واؤ، ہے، یے مونث۔ ہمزہ مذکر۔ لام الف حروف مفردہ میں نہیں۔ مگر بولنے میں مذکر بولا جائے گا۔ مثلاً لام الف کیا خوب لکھا ہے؟ کہیں گے، کیا خوب لکھی ہے نہ کہیں گے۔

"خزادہ" "خداوند زادہ" کا مخفف ہے لیکن فارسی نہیں، عربی نہیں، اردو کا روزمرہ تھا۔ "خزادہ" اور "خزادی" مرادف صاحبزادہ اور صاحبزادی ہے مگر فی زماننا متروک ہے۔ "فق" فارسی لغت نہیں ہو سکتا۔ عربی بھی نہیں —— روزمرہ اردو ہے، جیسا کہ میر حسن کہتا ہے:

کہ رستم جسے دیکھ رہ جائے فق

شعرائے حال کے کلام میں نظر نہیں آتا۔ "تکیہ" لفظ عربی الاصل ہے۔ فارسی و اُردو میں مستعمل۔ دونوں زبانوں میں ہم بہ معنی "بالش" اور ہم بہ معنی "مکانِ فقیر" آتا ہے۔ ایران میں "تکیہ مرزا صائب" مشہور ہے۔ "گل تکیہ" لفظ مرکب ہے، ہندی اور فارسی سے "گل" مخفف "گال" کا اور "تکیہ" بہ معنی "بالش" وہ چھوٹا گول تکیہ جو رخسار کے تلے رکھیں۔ "گل تکیہ" کہلاتا ہے۔ "گل" بہ معنی "پھانسی" انگریزی لغت ہے۔ انگریزی زبان نے بنگالہ میں سو برس سے اور دلّی اکبر آباد میں ساٹھ برس سے رواج پایا ہے۔ "گل تکیہ" وضع کیا ہوا نور جہاں بیگم کا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں اہلِ ہند کیا جانتے تھے کہ "گل" کیا چیز ہے۔

"معنی مفرد بہ تلفظ جمع" اس جملے کو میں اچھی طرح نہیں سمجھا۔ معنی مفرد، معانی جمع۔ اور یہ جو اُردو کے محاورے میں تقریر کرتے ہیں کہ "اس شعر کے معنی کیا ہیں یا اس شعر کے معنی کیا خوب ہیں۔ اس میں دخل نہیں کیا جاتا۔ خاص و عام کی زبان پر یوں ہی ہے۔ "معانی" کی جگہ "معنی" بولتے ہیں۔

"رَت" لفظ ہندی الاصل "رتھ" ہے۔ بہ ہائے مضمرہ بعض مذکر بولتے ہیں، بعض مونث۔

شعر بہت اچھا ہے، صاف و ہموار۔

راقم۔ غالب

منشی غلام بسم اللہ

منشی صاحب، شفیقِ مکرم، مظہرِ لطف و کرم، منشی غلام بسم اللہ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ مفتوح باد۔

صاحب، یہ نیا ڈھنگ[1] ہے شکایت کا۔ اگر تمھارے کلام میں اصلاح کم ہو تو وہ کلام کی خوبی ہے، اُس کو اُستاد کی سہل انگاری کیوں سمجھو؟ اب کے منصف صاحب کی بھی غزل میں اصلاح کم ہوئی ہے، پس اُن کو چاہیے کہ خوش ہوں، نہ کہ مجھ سے گلہ کریں۔؟

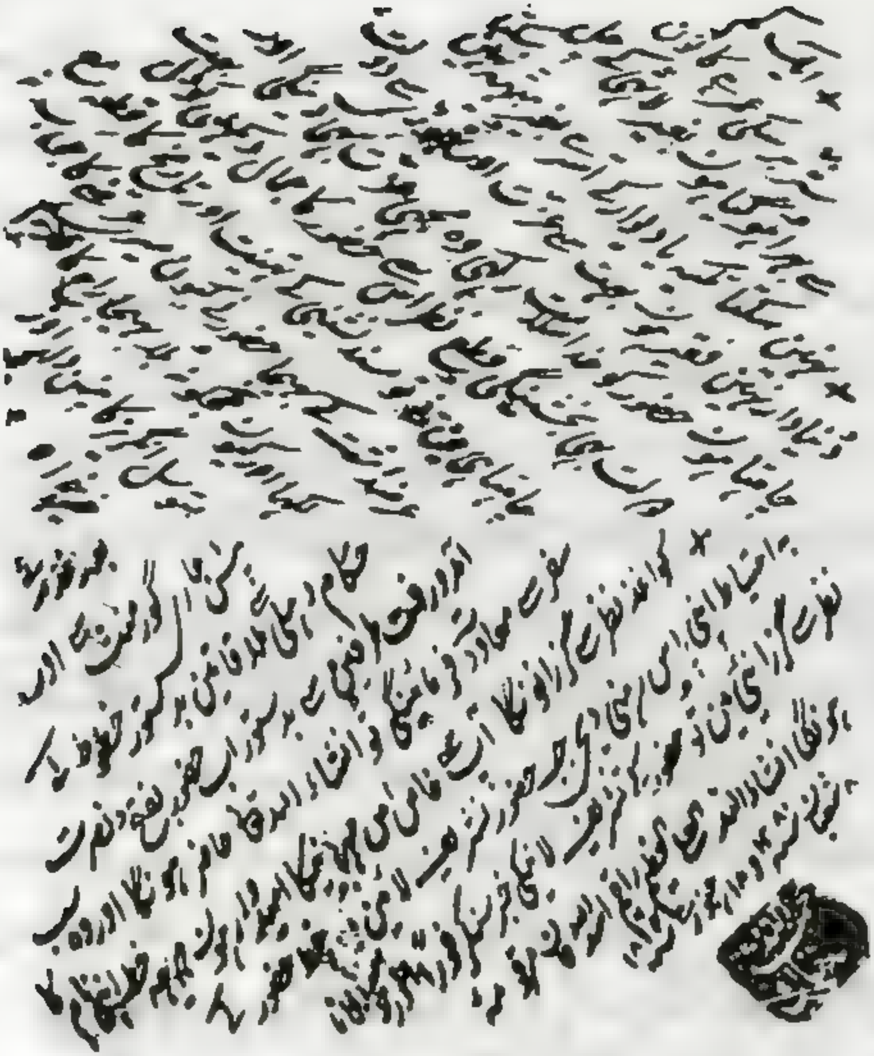
سنیے حضرت، خط میں[2] تداخل بُرا[3] ہے۔ اگر یہاں کی ڈاک میں کبھی خط کھل گیا تو مجھ سے پچاس روپیے لیے جائیں گے، یا قید کا حکم ہوگا۔ آیندہ آپ خط جداگانہ بھیجا کیجے۔ اس باب میں تاکید جانیے[4]۔ کوئی حیلہ جوانہ کا آپ کی طرف سے مسموع نہ ہوگا۔

غالب

میر بندہ علی خاں عُرف مرزا میر

(۱)

میر صاحب شفیق کرم و معظم میر بندہ علیخان عرف مرزا میر صاحب کو غالب
بے برگ و نوا کا سلام پہنچے آپ کا پیام روح افزا پہنچا بلکہ وہ عبارت سراسر بشارت
مین نے خود پڑھ لی جناب سری مہاراجہ بہادر نے جو میرے حق مین فرمایا سو بجا
ہے پانچ برس کی میری عمر تھی کہ میرا باپ عبد اللہ بیگخان عرف مرزا دولہا مہاراو
راجہ بختاور سنگھ بہادر کی رفاقت مین مارا گیا سرکار سے میرے باپ کی تنخواہ
میرے نام پر جاری ہوئی اور ایک گانو جسکا تالڑا نام ہے مجھکو بدوام ملا
تب یون سمجھیے کہ ادہر تو وہ پینا چھوڑا اور ادہر راج کی روٹی کھائی
چار برس کے بعد نصر اللہ بیگخان میرا چچا مر گیا نو برس کی عمر مین سرکار انگریزی
سے بعوض چچا کی جاگیر کے نقدی مقرر ہوئی آجتک اوس سے پرورش کا مدار
ہے عمر بھر مین نوکر ہوئے تو بہادر شاہ کے نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ
خطاب پایا چھ برس بادشاہ کا مصاحب رہا پہر استاد کہلایا اب



میر صاحب، شفیق، مکرم و معظّم، میر بندہ علی خاں، عرف مرزا میر صاحب کو

غالبِ بے برگ و نوا کا سلام پہنچے۔ آپ کا پیامِ روح افزا پہنچا بلکہ وہ عبارت سراسر بشارت میں نے خود پڑھ لی۔ جناب سری مہاراؤ راجا بہادر نے، جو میرے حق میں فرمایا سو بجا ہے۔

پانچ برس کی میری عمر تھی کہ میرا باپ عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہ مہاراؤ راجا بختاور سنگھ بہادر کی رفاقت میں مارا گیا۔ سرکار سے میرے باپ کی تنخواہ میرے نام پر جاری ہوئی اور ایک گاؤں جس کا تالڑا نام ہے مجھ کو برائے دوام ملا۔ آپ یوں سمجھیے کہ ادھر دودھ پینا چھوڑا

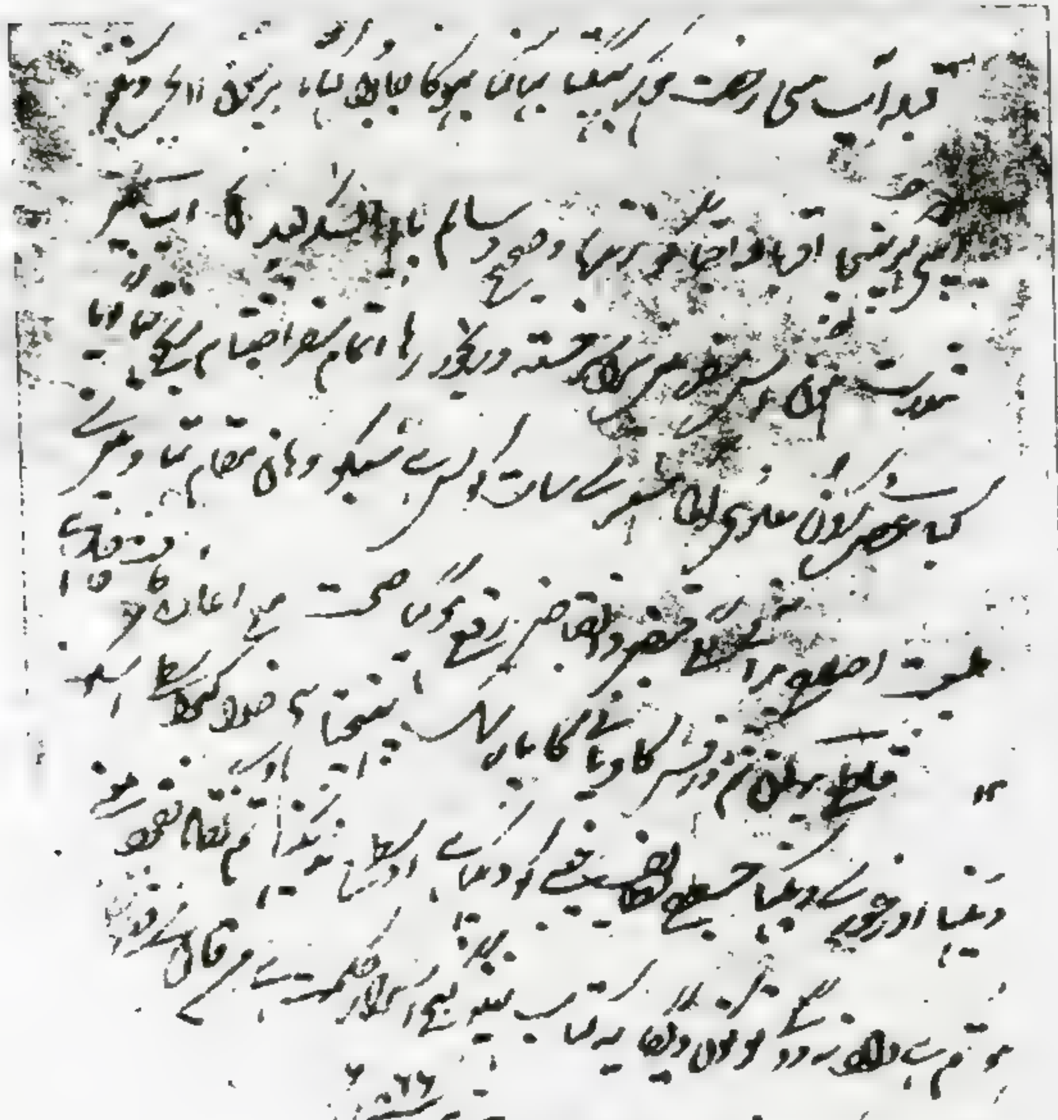
اور اُدھر راج کی روٹی کھائی۔ چار برس کے بعد نصر اللہ بیگ خاں میرا چچا مر گیا۔ نو برس کی عمر میں سرکار انگریزی سے، بہ عوض چچا کی جاگیر کے، نقدی مقرر ہوئی۔ اب تک اسی پر معاش کا مدار ہے۔ عمر بھر میں نوکری کی تو بہادر شاہ سے "نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ" خطاب پایا۔ کچھ دنوں بادشاہ کا مصاحب رہا، پھر اُستاد کہلایا۔ اب ایک کم ستر برس کی عمر ہے۔ کانوں سے بہرا ہو گیا ہوں، بغیر لاٹھی کے چل نہیں سکتا۔ تکیہ یا دیوار کے آسرے بغیر بیٹھ نہیں سکتا۔ دنیا دار نہیں، فقیر ہوں، بہت سی عزت اور تھوڑی سی دولت چاہتا ہوں۔ حضور کو خدا سلامت رکھے۔ وہ مجھے عزت بھی دیں گے اور دولت بھی بخشیں گے۔ قطع نظر اس سے حضور کا جمال دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے۔ میں نے تو مسند نشینی کی تہنیت اور تاریخ کا قطعہ مع عرضداشت کے بھیجا۔ حضور نے کیوں میری عرضی کا جواب نہ لکھا اور کیوں مجھ کو نہ بلا بھیجا؟ راج کا قدیم متوسل، انگریز کا پنشن دار اور خیر خواہ۔ بعد غدر کے پنشن جاری ــــ گورمنٹ سے اور حکام دہلی سے ملاقاتیں بہ دستور۔ خطوط کی آمد و رفت طرفین سے بہ دستور۔ اب حضور بہ فتح و نصرت سفر سے معاودت فرمائیں گے تو اِنْ شَاءَ اللہ تَعَالیٰ حاضر ہوں گا اور وہ سب کاغذ نظر سے گزرانوں گا۔

آپ سے خاص اس مہربانی کا امیدوار ہوں کہ یہ خط اپنے نام کا بہ احتیاط اپنے پاس رہنے دیجے، جب حضور تشریف لائیں تو یہ خط حضور کی نظر سے گزرا دیجیے۔ میں تو حضور کے تشریف لانے کی خبر سن کر فوراً الور روانہ ہوں گا اِنْ شَاءَ اللہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْم۔

مرقومہ ۸ شعبان ۱۲۸۰ھ ۱۸ جنوری ۱۸۶۴ء راقم - اسد اللہ خاں

مہر: محمد اسد اللہ خاں

محمّد محسن (صدر الصدور)



(۱)

قبلہ!

آپ سے رخصت ہو کر بھیگتا بھاگتا، بھوکا، جاڑا کھاتا، پرسوں گیارہ بجے دن کو اپنے گھر پہنچا۔ اقربا و احبا کو زندہ و صحیح و سالم پایا۔ الشکر اللہ اب میں تندرست ہوں۔ اس سفر میں سراسر خستہ و رنجور رہا۔ اتمامِ سفر اختتامِ رنج تھا گویا۔

کیا عرض کروں، غازی آباد شہر سے سات کوس ہے۔ شب کو وہاں مقام تھا۔ وہیں سے طبیعت اصلاح پر آنے لگی۔ قبض و انقباض رفع ہو گیا۔ صحت مع اعادۂ طاقت حاصل ہے۔

"قاطع برہان" "تتمہ" "درفشِ کاویانی" کا پارسل پہنچتا ہے، خدا کے واسطے اس کو دیکھنا اور غور سے دیکھنا۔ جس طرح "لطائفِ غیبی" کو دیکھا ہے اُس طرح نہ دیکھنا۔ تم نقادِ نقودِ معنی ہو۔ تم ہی داد نہ دو گے تو کون دے گا؟ یہ کتاب نہیں، گنجِ اسرارِ حکمت ہے۔ "من قال" سے قطع نظر "ما قال" کو دیکھو۔

۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء ۲ بے دستگاہ اسد اللہ

بنام نامعلوم

(۱)

حضرت، میرا حال کیا پوچھتے ہو:

چو ہفتاد آمد، اعضا رفت از کار

اب کے رجب کی آٹھویں تاریخ سے سال ہفتادم شروع ہوا۔ جس طرح بڈھے جیتے ہیں، میں بھی جیتا ہوں۔ ظہوری کی غزل پر خوب غزل لکھی ہے۔ دوسری غزل کے باب میں اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا کہ طالب علمانہ ردیف میں عاشقانہ مضامین اچھے درج کیے ہیں۔

سنہ ۱۲۸۲ھ

سنہ ۱۸۶۵ء

غالب

بنام نامعلوم

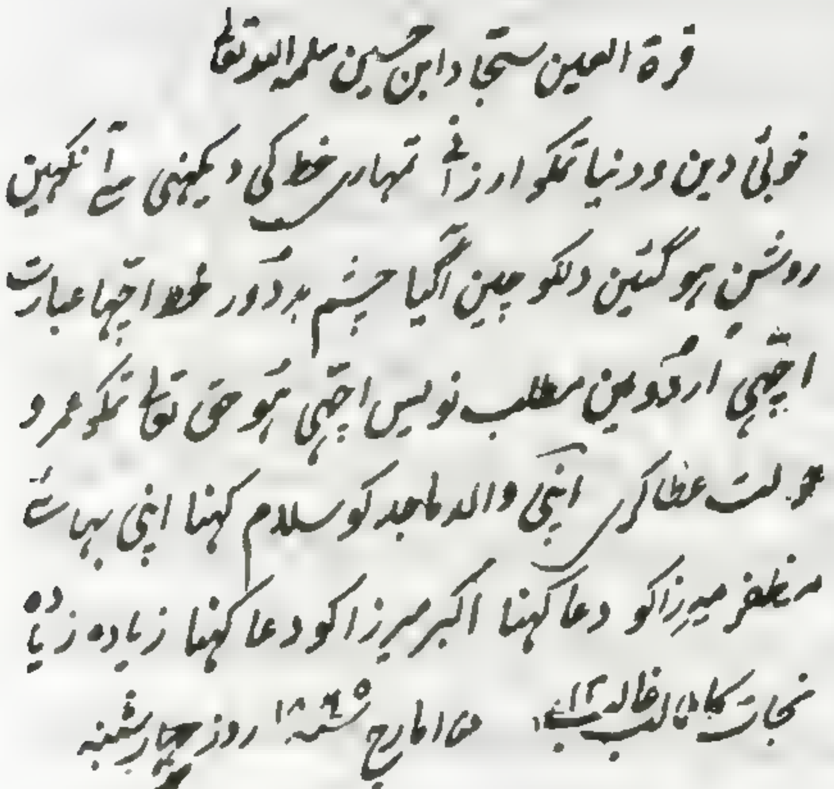
میاں!

وہ عرضی کا کاغذِ افشاں کیا ہوا، اور عرضی کا مسودہ میں نے لالہ جگل کشور کو پرسوں دے دیا ہے۔ تم نے بھی دیکھا ہوگا اور یقین ہے کہ وہ اپنے گھر میں اُس کو لکھ رہے ہوں گے۔ اگر تمھارے پاس آجائیں تو اُن کو کہہ دینا کہ جلدی کریں اور نقشہ تحریر کا، کاغذ سادہ پر، مجھ کو اور تم کو دکھلا لیں۔ پھر اُس کے موافق اور اُس کو افشانی کاغذ پر لکھیں۔

زیادہ، زیادہ۔

غالب

سیّد سجّاد مرزا


قرۃ العین سجاد ابن حسین سلمہ اللہ تعالیٰ
خوبیِ دین و دنیا تمکو ارزانی تمہارے خط کی دیکھنے سے آنکھیں
روشن ہو گئیں دلکو چین آگیا چشم بد دور عطوا اچھا عبارت
اچھی ارقام میں مطلب نویس اچھی ہو حق تعالیٰ تمکو عمر و
دولت عطا کرے اپنی والدہ ماجدہ کو سلام کہنا اپنی بہائی
مظفر میرزا کو دعا کہنا اکبر میرزا کو دعا کہنا زیادہ زیادہ
نجات کا طالب غالب
۱۵ مارچ ۱۸۶۹ء روز چہار شنبہ

(۱)

قرۃ العین سجاد ابن حسین سلّمہُ اللہ تعالیٰ!

خوبیِ دین و دنیا تم کو ارزانی، تمھارے خط کے دیکھنے سے آنکھیں روشن ہو گئیں، دل کو

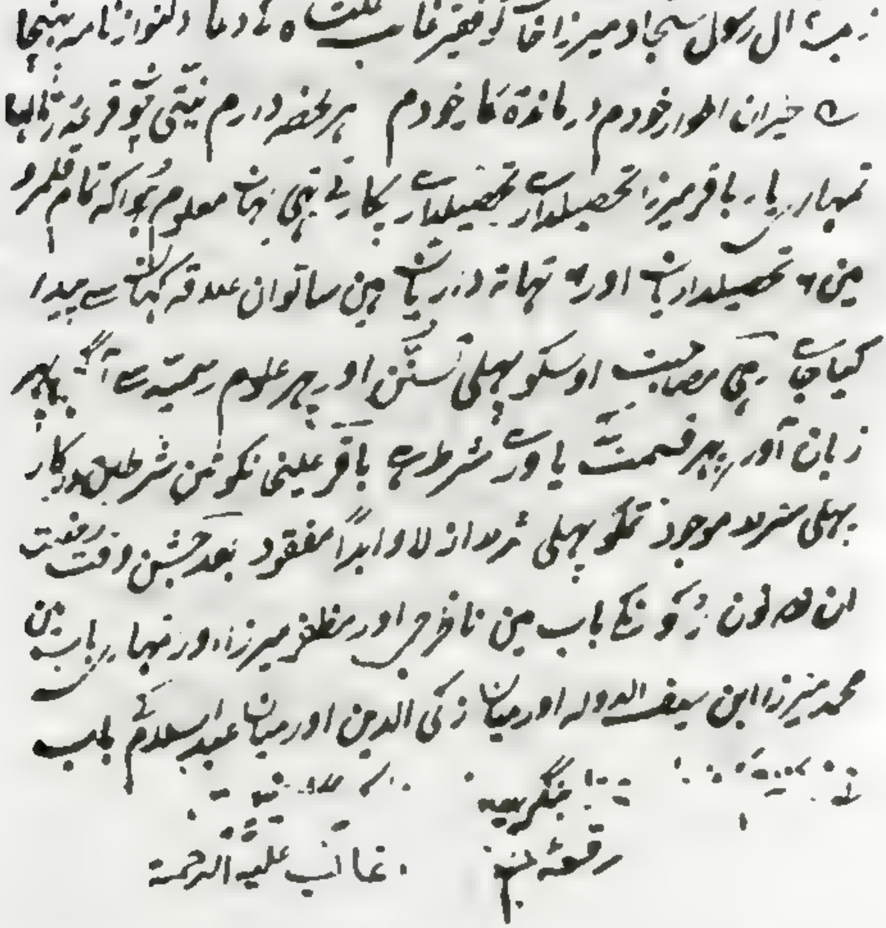
چین آگیا۔ چشم بد دور، خط اچھا، عبارت اچھی، اُردو میں مطلب نویسی حق تعالیٰ تم کو عمر و دولت عطا کرے۔

اپنے والد ماجد کو سلام کہنا، اپنے بھائی منظفر مرزا کو دعا کہنا، اکبر مرزا کو دعا کہنا۔

زیادہ زیادہ۔ نجات کا طالب۔ غالبؔ

۱۵ مارچ ۱۸۶۵ء روز چہار شنبہ

(۲)


زبدۂ آل رسول سجاد میرزا خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا دلنواز نامہ پہنچا
حیران اطوار خودم درماندۂ کار خودم ہر لحظہ دارم نیتی چوں قرعہ رمالہا
تمہارا یار باقر میرزا تحصیلدار تحصیلدار تحصیلدار پکارتے تھے جب معلوم ہوا کہ تمام قلمرو
میں ۶ تحصیلدار ہیں اور یہ تھانہ دار رہتا ہیں ساتواں عدد کہاں سے پیدا
کیا جائے ہے صاحب اوسکو بھی تسکین اور پھر علوم رسمیہ سے آگاہ پھر
زبان آور پھر قسمت یاور شرط ہے باقر علیخاں کو تین شرطیں درکار
بھی سند موجود تکو بھی گرداں لاوا ابداً مفقود بعد جشن وقت
ان لوگوں کو نیک باب میں ناظر جی اور مظفر میرزا اور تمہارا یار ہیں
محمد میرزا ابن سیف الدولہ اور میاں زکی الدین اور میاں عبدالسلام بلب
رقعہ نمبر
غالب علیہ الرحمۃ

زبدۂ آلِ رسول، سجاد مرزا خاں کو فقیر غالبؔ علی شاہ کی دعا۔ دلنواز نامہ پہنچا۔

حیران اطوار خودم درماندۂ کار خودم

ہر لحظہ دارم نیتی چوں قرعۂ رمالہا

تمھارے یار باقر مرزا تحصیل داری، تحصیل داری پکارتے تھے۔ یہاں معلوم ہوا کہ تمام قلمرو میں چھے تحصیل داریاں اور چھے تھانہ داریاں ہیں۔ ساتواں علاقہ کہاں سے پیدا کیا جائے؟ رہی مصاحبت، اُس کو پہلے تسنن، اور پھر علوم رسمیہ سے آگہی، پھر زبان آوری، پھر قسمت کی یاوری شرط ہے۔

باقر علی خاں کو تین شرطیں درکار۔ پہلی شرط موجود، تم کو پہلی شرط ازلاً وابداً مفقود۔ بعد جشن، وقتِ رخصت اِن دونوں لڑکوں کے باب میں، ناظر جی اور منظفر مرزا اور تمھارے باب میں، محمد مرزا ابن سیف الدولہ اور میاں زکی الدین اور میاں عبدالسلام کے باب میں کلام کروں گا۔

تا بنگرید خواستۂ کردگار چیست

اکتوبر۔ دسمبر ۱۸۶۵ء [1]

نواب مصطفیٰ خاں بہادر شیفتہ

جناب بھائی صاحب وقبلہ !

یقین ہے کہ آپ مع الخیر اپنے دارالریاست میں پہنچ گئے ہوں اور بہ جمعیتِ خاطر روزہ رکھتے ہوں۔ سوا یاران کے، اور خیال مولوی الطاف حسین کے فراق کے سوا کوئی وجہ ملال نہ ہو۔ خدا کرے تم کو یاد آ جائے کہ مفتی جی "شگفتی"، "کو شگفت" کا مزید علیہ مسلم نہیں جانتے تھے۔ "سکندر نامہ" میں دیکھا۔

بیت :

پسے در شگفتی نمودن طواف

عنانِ سخن را کشد در گزاف

صہبائی "شفقِ صبح" کو غلط اور اس رنگ کو مخصوص بہ شام جانتا تھا۔ محمد سعید اشرف مازندرانی کے کلام میں نظر پڑا۔ مصرع :

ہمچو صبح شفق آلودہ رخش سُرخ وسفید

اب جو فقیر کا یہ مطلع مشہور ہوا : شعر :

از جسم بہ جاں نقاب تا کے

ایں گنج دریں خراب تا کے

حضرات کو اس میں تامل ہے۔ "خرابہ" کی جگہ "خراب" کو نہیں مانتے۔ آیا یہ نہیں جانتے کہ

لغتِ عربی اصل "خراب" اور "خرابہ" مزید علیہ "ویران" لغت فارسی اصل اور "ویرانہ" مزید علیہ "موج" لغت عربی اصل اور "موجہ" مزید علیہ ہے؟ مزید علیہ جائز اور لغت اصلی ناجائز کیوں ہو؟ یہ ایک مصرع قدما میں سے کسی کا ہے مگر پیش مصرع مجھے یاد نہیں اور یہ بھی نہیں معلوم کہ کس کا ہے؟:

چوں مہر در کسوف و چون گنج در خراب

میں خود کہتا ہوں کہ اس کو نہ مانو، اس راہ سے کہ میں قائل کا نام نہیں بتا سکتا، یہ مطلع مرزا محمد علی صائبؔ علیہ الرحمۃ کا اور اُس کے دیوان میں موجود ہے۔ شعر:

بہ فکرِ دل نہ فتادی بہ ہیچ باب، دریغ
بہ گنج راہ نہ بردی دریں خراب، دریغ

"گنج و خراب" "گنج و خرابہ" "گنج و ویران" "گنج و ویرانہ" مستعملِ اہلِ ایران ہے" اس بات میں متردد ہونا محض عدم اِعتنا ہے۔ والسلام۔

صبح سہ شنبہ دہم ماہ صیام سال غافر پئے اہلِ اسلام
۱۰ رمضان ۱۲۸۱ھ مطابق ۷ فروری ۱۸۶۵ء

حکیم ظہیرالدّین احمد خاں[1]

(۱)

اقبال نشان حکیم ظہیرالدین احمد خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔ کہو میاں تمھارا مزاج کیسا ہے، اور تمھارے بھائی مرزا تفضل حسین خاں کیسے ہیں؟ اگر ملو تو میری دعا کہنا اور مزاج کی خبر پوچھنا اور اپنے والد ماجد کو میری دعا کہنا اور کہنا کہ تمھارا خط میرے خط کے جواب میں تھا۔ اس میں اور کوئی بات جواب طلب نہ تھی۔

سنو میاں، ظہیرالدین! تم اپنی دادی کے پاس ابھی چلے جاؤ اور اُن سے میری اور دونوں لڑکوں کی خیر و عافیت کہو، اور پوچھو کہ شہاب الدین خاں نے اکتوبر مہینے کی تنخواہ[1] کے پچاس روپیے پہنچا دیے یا نہیں؟ کدار ناتھ ڈیوڑھی پر آکر جعفر بیگ، وفادار وغیرہ کی تنخواہ بانٹ گیا یا نہیں؟ اچھا میرا بیٹا، یہ دونوں باتیں اپنی دادی سے پوچھ کر جلد مجھ کو لکھیو، دیر نہ کیجیو۔

خط کے جواب کا طالب

پنجشنبہ ۲ نومبر ۱۸۶۵ء[2] فقیر غالب

(۲)

[3] تو میاں ظہیرالدین، ہم نے مسودہ لکھ کر بھیج دیا ہے۔ تم اس کو اپنے ابا سے پڑھ لو اور اس کی نقل کرا کر اپنے چچا جان کو بھیج دو۔

غالب[4]

مرزا قربان علی بیگ خاں سالکؔ

(۱)

وَلِلّٰہِ حُسنِ اَلطَافِ خُفیۃ۔ خیر و عافیت تمھاری معلوم ہوئی۔ دم غنیمت ہے۔ جان ہے تو جہان ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا سے ناامیدی کفر ہے۔ میں تو اپنے باب میں خدا سے ناامید ہو کر کافرِ مطلق ہو گیا۔ موافق عقیدۂ اہلِ اسلام جب کافر ہو گیا تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی۔ چل بھئی نہ دنیا نہ دین، مگر تم حتی الوسع مسلمان بنے رہو اور خدا سے ناامید نہ ہو۔ اِنَّ مَعَ العُسرِ یُسراً کو اپنا نصب العین رکھو:

در طریقت ہر چہ پیشِ سالک آید خیر اوست

گھر میں تمھارے سب طرح خیر و عافیت ہے۔ محمد مرزا پنجشنبہ اور جمعے کو داستان کے وقت آجاتا ہے۔ رضوان ہر روز شب کو آتا ہے۔ یوسف علی خاں عزیز سلام اور باقر اور حسین علی بندگی کہتے ہیں کلو داروغہ کورنش عرض کرتا ہے۔ اوروں کو یہ پایہ حاصل نہیں کہ وہ کورنش بھی بجا لائیں۔ خط بھیجتے رہا کرو۔ والدعا۔

صبح دوشنبہ ۶ صفر (سالِ حال) ۱۲۸۱ھ

۱۱ جولائی ۱۸۶۴ء

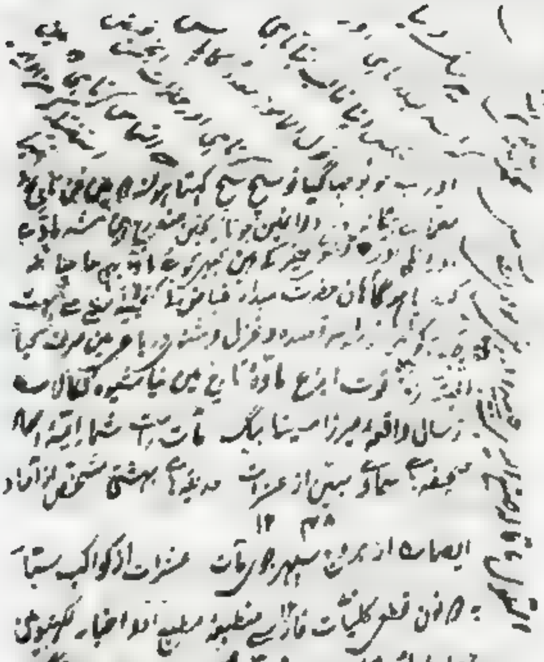
اپنی مرگ کا طالب۔ غالب

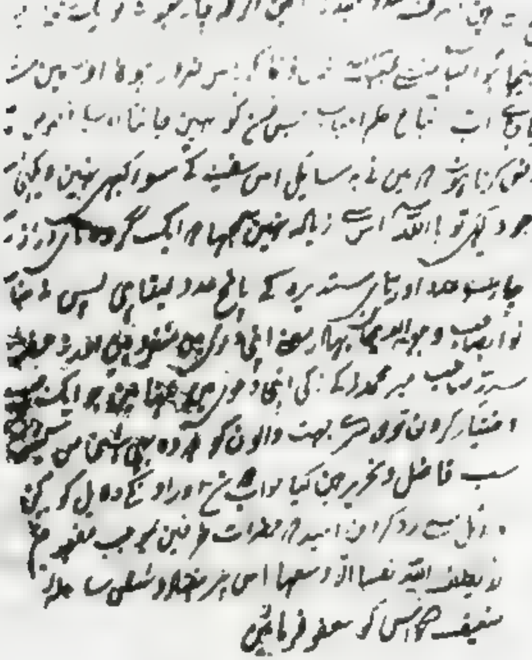
(۲)

میری جان کن اوہام میں گرفتار ہے؟ جہاں باپ کو پیٹ چکا، اب چچا کو بھی رو۔ تجھ کو خدا جیتا رکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورتِ وقوعی دے۔

یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں۔ کہ لو، غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا۔ بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد اُن کے "جنت آرام گاہ" و "عرش نشیمن" خطاب دیتے ہیں چونکہ یہ اپنے کو شاہِ قلمروِ سخن جانتا تھا، سقر مقر اور ہاویہ زاویہ، خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیئے! نجم الدولہ بہادر ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں اُن سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے، اوغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو۔ بولے کیا، بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔

میر محمد زکی زکی





یہ سگِ دنیا کہ اسد کہلاتا ہے اور تخلص اپنا غالب بتاتا ہے۔ قول المامور معذور کا پاس کرتا ہے اور حضراتِ انجمنِ فیض سے التماس کرتا ہے کہ میں استفتا کے سزاوار نہ تھا اور اب جو پوچھا گیا تو سچ سچ کہتا ہوں کہ میں فنِ تاریخ و معمّا سے بیگانہ ہوں۔ دیوان میں جو تاریخیں مندرج ہیں، بیشتر مادے اوروں کے اور قطعے فقیر کے ہیں۔ کبھی کوئی مادہ بھی عامیانہ کہدیا ہوگا۔ ہاں حضرت مبدارِ فیاض نے گنجینۂ معنی سے بہت کچھ مجھ کو دیا، میں نے سراسر قصیدہ و غزل و مثنوی و رباعی میں صَرف کیا۔ البتہ بہ زورِ قوتِ ابداع مادۂ تاریخ میں نیا شیوہ نکالا:

زسالِ واقعۂ میرزا امیتا بیگ

مآت راست شمارِ ائمہ امجاد

صحیفہ ہائے سماوی مبین از عشرات

حدیقہ ہائے بہشتی مشخص از آحاد

۱۲۴۸

از بروج سپہر جوی مآت
عشرات از کواکبِ سیّار

یہ دونوں قطعے کلیاتِ فارسی منطبعۂ مطبعِ اودھ اخبار لکھنؤ میں چھاپے گئے ہیں اور وہ مجلد مجموع بلادِ ہند میں پہنچ گئے ہیں۔ اشرف البلاد حیدر آباد میں اگر دو چار نہ ہوں گے تو ایک نسخہ میرا بھیجا ہوا جناب منشی حبیب اللہ خاں ذکا کے پاس ضرور ہوگا، اس میں مشاہدہ کیا جائے۔ اب یہ اتباعِ حکم احباب، جس فن کو نہیں جانتا، اس کے خصوص میں عرض کرتا ہوں، کہ میں نے یہ مسائل اس سفینے کے سوا کبھی نہیں دیکھے۔ اب جو دیکھے تو باللہ اس سے زیادہ نہیں سمجھا کہ ایک گروہ تارے دراز کے چار سو عدد اور تارے مستدیرہ کے پانچ عدد لیتا ہے۔ پس نہ جناب نواب صاحب وجیہہ الدین خاں بہادر مفتی اپنے دعوے میں منفرد ہیں اور نہ حضرت سیّد صاحب میر محمد زکی، زکیؔ اپنے دعوے میں تنہا ہیں۔ جو ایک جہت اختیار کروں تو دوسرے جہت والوں کو کہ وہ بھی اشخاصِ کثیر اور سب فاضل و نحریر ہیں، کیا جواب دوں اور ان کے دلائل کو کن دلائل سے رد کروں۔ امید کہ حضرات طرفین بہ موجب مفہوم لایکلف اللہ نفساً الا وسعہا اس پیرِ ہفتاد و ششش سالہ ضعیف الحواس کو معفو فرمائیں۔

مہر: نجم الدولہ دبیر الملک
اسد اللہ خاں
نظام جنگ بہادر
۱۲۶۷ھ

مردان علی خاں رعنا

(۱)

خان صاحب شفیق عالی شان کو میرا سلام۔ کل تمھارا عنایت نامہ پہنچا۔ رام پور کا لفافہ آج رام پور کو روانہ ہوا۔

کاغذ اشعار میں نے دیکھ لیا، کہیں اصلاح کی حاجت نہ تھی۔ "نالہ در... الخ" "نالۂ دل" بنا دیا۔

نواب صاحب اردو کا تذکرہ لکھتے ہیں۔ فارسی غزل تم نے بے فائدہ لکھی۔

دیکھو صاحب! تم نے اپنے مسکن کا پتا لکھا، سو میں نے دوسرے دن تمھارے خط کا جواب روانہ کیا۔ منشی نول کشور صاحب یہاں آئے تھے۔ مجھ سے ملے، بہت خوب صورت اور خوش سیرت، سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں۔ تمھارے وہ مداح اور میں ان کا ثنا خواں۔ خدا تم کو اور اُن کو سلامت رکھے!

دسمبر ۱۸۶۳ء

(۲)

خاں صاحب عالی شان مردان علی خاں صاحب کو فقیر غالبؔ کا سلام۔

نظم و نثر دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ آج اس فن میں تم یکتا ہو۔ خدا تم کو سلامت رکھے۔ بھائی "جفا" کے مؤنث ہونے میں اہلِ دہلی و لکھنؤ کو باہم اتفاق ہے۔ کبھی کوئی نہ کہے گا کہ "جفا کیا"، ہاں، بنگالے میں جہاں بولتے ہیں کہ "تھمنے آیا" اگر "جفا" کو مذکر کہیں تو کہیں، ورنہ "ستم" و "ظلم" و "بیداد" مذکر اور "جفا" مؤنث ہے۔ بے شبہہ و شک۔ السلام والاکرام۔

نواب ضیاالدّین احمد خاں نیّر رخشاں

(۱)

جناب قبلہ وکعبہ آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے۔ روز آپ کے مطالعے میں نہیں رہتا۔ بغیر اُس کے دیکھے آپ کو کھانا نہ ہضم ہوتا ہو، یہ بھی نہیں پھر آپ کیوں نہیں دیتے ایک جلد ہزار جلدیں بن جائے، میرا کلام شہرت پائے، میرا دل خوش ہو، تمھاری تعریف کا قصیدہ اہل عالم دیکھیں۔ تمھارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے، اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں۔ رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ، یہ خفقان ہے، کتاب کیوں تلف ہو گی؟ احیاناً اگر ایسا ہوا اور دلّی لکھنؤ کی عرضِ راہ میں ڈاک لُٹ گئی تو میں فوراً بہ سبیلِ ڈاک رام پور جاؤں گا اور نواب فخرالدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لادوں گا۔ اگر یہ کہتے ہو کہ اب وہاں سے لے کر بھیج دو، وہ نہ کہیں گے کہ وہیں سے کیوں نہیں بھیجتے۔ ہاں، یہ لکھوں کہ نواب ضیاءالدین خاں صاحب نہیں دیتے تو کیا وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تمھارے بھائی اور تمھارے قریب ہو کر نہیں دیتے تو میں اتنی دُور سے کیوں دوں۔ اگر تم یہ کہتے ہو کہ تفضل سے لے کر بھیج دو، وہ اگر نہ دیں تو میں کیا کروں اگر دیں تو میرے کس کام کا۔ پہلے تو ناتمام پھر ناقص بعض بعض قصائد اُس میں سے اور کے نام کر دیے گئے ہیں، اور اُس میں اُسی ممدوحِ سابق

کے نام پر ہیں۔ شہاب الدین خاں کا دیوان جو یوسف مرزا لے گیا ہے اُس میں یہ دونوں قباحتیں موجود۔ تیسری یہ کہ سراسر غلط، ہر شعر غلط، ہر مصرع غلط، یہ کام تمھاری مدد کے بغیر انجام نہ پائے گا اور تمھارا کچھ نقصان نہیں۔ ہاں، احتمالِ نقصان، وہ بھی از روے وسوسہ و وہم، اُس صورت میں، میں تلافی کا کفیل، جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں، بہ ہر حال راضی ہو جاؤ اور مجھ کو لکھو تو میں طالب کو اطلاع دوں اور طلب اُس کی جیب دوبارہ ہو تو کتاب بھیج دوں۔

۱۸۶۲ء

رحم و کرم کا طالب۔ غالبؔ

مولانا احمد حسین میناؔ مرزاپوری

(۱)

بندہ پرور!

کل دوپہر کو آپ کے عنایت نامے کے ساتھ ہی جناب اخگر کا مہربانی نامہ مع غزل پہنچا۔ آج جواب آپ کو لکھتا ہوں۔ غزل میں نے دیکھ لی۔ سوائے دو ایک جگہ کے کہیں اصلاح کی حاجت نہ تھی۔ آج اس فن میں وہ یکتا ہیں۔ خدا اُن کو سلامت رکھے۔ وہ بلا مبالغہ سراپا تصویرِ محبت ہیں۔ نظم تو نظم اُن کے نثر کے فقرے بھی قیامت ہیں۔

اس دوبارہ عطیے اور اس یادآوری کا احسان مانا۔ میری جانب سے قدر افزائی کا شکریہ ادا کر دیجیے گا کہ حضرت نے ہیچمد ان کو قابلِ خطاب و لائقِ جواب سمجھا۔ میں دروغ گو نہیں، خوشامد میری خو نہیں۔ غزل دیکھی، الفاظ متین، معانی بلند، بندش دل پسند مضمون عمدہ، سوائے دو ایک جگہ کے اور غزل بھر میں ایک نقطے کی بھی گنجایش نہ تھی۔ اصلاح کیا دیتا بجنسہٖ واپس کرتا ہوں۔

اب یہاں سے روئے سخن حضرت اخگر کی طرف ہے۔

قبلۂ حاجات! میرا حال کیا پوچھتے ہیں۔ زندہ ہوں مگر مردے سے بدتر۔ جو حالت میری آپ اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرما گئے تھے۔ اب تو اُس سے بھی بدتر ہے۔ مرزاپور کیا

آؤں، اب سوائے سفرِ آخرت اور کسی سفر کی نہ مجھ میں طاقت ہے نہ جرأت، جوان ہوتا تو احباب سے دعائے صحت کا طلب گار ہوتا۔ بوڑھا ہوں تو دعائے مغفرت کا خواہاں ہوں:

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

پس تو یہ ہے کہ قوّتِ ناطقہ پر وہ تصرف اور قلم میں وہ زور نہ رہا۔ طبیعت میں وہ مزہ، سر میں وہ سودا کہاں۔ پچاس پچپن برس کی مشق کا کچھ ملکہ باقی رہ گیا ہے۔ اِس سبب سے فنِ کلام میں گفتگو کرلیتا ہوں۔ تو اس کا بھی بقیہ میرے اس شعر کا مصداق ہے:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

حوادثِ زمانہ و عوارضِ جسمی سے نیم جاں ہوں۔ اس سرائے فانی میں اور کچھ دنوں کا مہمان ہوں:

ہوچکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

جب تک جیتا ہوں نامہ و پیام سے شادؔ، بعد میرے دعائے مغفرت سے یاد فرماتے رہیے گا۔

سانس میری زبان پر مذکر ہے۔ رندؔ کا یہ مطلع:

سانس دیکھی تنِ بسمل میں جو آتے جاتے
اور چرکا دیا جلاد نے جاتے جاتے

میرے لیے سند نہیں۔

بندہ پرور! لکھنؤ اور دلی میں تذکیر و تانیث کا بہت اختلاف پائیے گا۔ سانس میرے نزدیک مذکر ہے لیکن، اگر اہلِ لکھنؤ اُسے مؤنث کہیں تو میں اُن کو منع نہیں کر سکتا۔ خود سانس کو مؤنث نہ کہوں گا۔ آپ کو اختیار ہے جو چاہے کہیے۔ مگر حقّہ کے مؤنث ہونے میں اہلِ دہلی و لکھنؤ کو باہم اتفاق

ہے۔ کبھی کوئی نہ کہے گا "جفا کیا"۔

چشم بد دُور، حضرت کی طبیعت نہایت اعلیٰ اور مناسب اس فن کے ہے۔ اللہ نگاہِ بد سے محفوظ رکھے۔

نجات کا طالب - غالب

(۲)

جانِ غالب!

کل تمہاری دونوں غزلیں بعد اصلاح ٹکٹ دار لفافے کے اندر رکھ کر بھجوادی ہیں۔ مطلع تو تم نے میری زبان سے کہا ہے:

ادائے یوسفی ہے لوٹ قاتل کے لڑکپن پر
سوادِ دیدۂ یعقوب کے دھبّے ہیں دامن پر

اس زمین میں میری بھی غزل ہے اور ناسخ و آتش کی بھی غزلیں میں نے دیکھی ہیں۔ تم نے بہت بڑھ کر لکھا ہے۔ گردن کا قافیہ بھی مجھے پسند آیا ہے:

نزاکت اُن کی وقتِ قتل، مقتل میں یہ کہتی ہے
یہ اتنے خونِ ناحق جس سے اُٹھیں اُس کی گردن پر

غرض کہ ساری غزل بے مثل و لاجواب ہے، کیوں نہ ہو، ابھی تمہارا شباب ہے۔ زمینِ شعر کو آسمان پر پہنچایا ہے۔ اس غزل میں تو تم نے جوانی کا زور دکھایا ہے۔

قصیدہ کا وعدہ نہیں کرتا، اگر بے وعدہ پہنچ جائے گا تو لطف زیادہ آئے گا اور اگر نہ پہنچے گا تو محلِ شکایت نہ ہوگا۔

بندہ پرور! میرا کلام کیا نظم، کیا نثر، کیا اردو، کیا فارسی کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کی فکر تھی۔ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کرتے تھے، سو اُن دوستوں کا زمانہ غدر میں گھر ہی لُٹ گیا، نہ کتاب رہی، نہ اسباب رہا، پھر میں اپنا کلامِ نظم و نثر کہاں سے لاؤں۔

مولوی فرزند علی صاحب آتنگر کا کون شخص مشتاق نہ ہوگا۔حُسنِ صورت اور حُسنِ سیرت دونوں اُن میں جمع ہیں۔فقیر تو اُن سے مل کر بہت خوش ہوا۔آنکھیں اُن کے حُسنِ صورت سے روشن اور دل اُن کے حُسنِ سیرت سے مسرور ہوگیا۔

اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی۔میں یوں ہی خدمت گزاری کو حاضر ہوں۔جب چاہیں اپنا کلام بھیج دیں۔میرا اسلام اور یہ پیام کہہ دیجے گا۔

۱۳ جولائی ۱۸۶۷ء تمھارے دیدار کا طالب۔غالب

شیخ لطیف احمد بلگرامی

میاں لطیف!

مزاج شریف؟ غالبِ گوشہ نشین کی دعا۔ تمھارا مسودہ آیا۔ کمتر جگہ اصلاح کی پائی۔ روشِ تحریر بھی مجھے پسند آئی۔ دل خوش ہوا، لیکن:

ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن
نعتِ شہ کونین و مدیحِ کے و جم را

سید ابن حسن خاں صاحب وہاں موجود، میں یہاں محض وجودِ بے وجود، وہ تو میرے نزدیک علامہ ہیں اور یگاں۔ میں اُن کے نزدیک ایک مشتِ استخواں ہوں۔ وہ بھی بوسیدہ اور ناتواں۔ اگر خاں صاحب وارستہ مزاج ہیں تو سید غلام حسنین قدر رہی۔ وہ تو میرے قدرداں بھی ہیں اور شاگرد بھی ہیں۔ اگر کچھ بھی اپنے دل و دماغ میں قوت پاتا تو اپنی طبیعت کو آپ سے اصلا دریغ نہ کرتا۔ کیا لکھوں اور کیا کہوں؟ نور آنکھوں سے جاتا رہا اور دل سے سرور۔ ہاتھ میں رعشہ طاری ہے، کان سماعت سے عاری ہے:

عتابِ عروساں در آمد بجوش
صراحی تہی گشت و ساقی خموش

فخرِ ایجادِ تکوین مولانا فضل حق ایسا دوست مر جائے۔ غالب نیم مردہ نیم جاں رہ جائے:

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

اگر جوان ہوتا اور بیمار تو آپ سے دعاے خیریت چاہتا۔ اسی برس کا بڈھا ہونے آیا ہوں۔ دعاے مغفرت کا امیدوار ہوں، شراب کم بخت اب بھی چھوٹتی نہیں، نماز کا اب بھی عادی ہوتا نہیں:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی
کعبے کس منھ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

نجات کا طالب۔ غالبؔ

بابو ہرگوبند سہائے نشاط

(۱)

برخوردار بہت دن ہوئے کہ میں نے تم کو خط لکھا ہے۔ اب اس خط کا جواب ضرور لکھو اور جلد لکھو۔

دو سوال ہیں تم سے: ایک تو یہ کہ یہاں مشہور ہے کہ نواب گورنر جنرل بہادر الٰہ آباد سے کان پور آگئے۔ کوئی کہتا ہے، آویں گے۔ اس کا حال جو کچھ تم کو معلوم ہو، لکھو۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ دو قسم کی انگریزی شراب، ایک تو کاس ٹیلین[۱] اور ایک اولڈ ٹام[۲]، یہ میں ہمیشہ پیا کرتا تھا اور یہ دونوں[۳] قسم بیس روپیے، حد چوبیس روپیے درجن آتی تھی۔ اب یہاں پہلے تو نظر ہی نہیں آتی تھی، اب پچاس روپیے اور ساٹھ روپیے درجن آتی ہے، وہاں تم دریافت کرو کہ اس کا نرخ کیا ہے اور یہ بھی معلوم کرو کہ بہ طریقِ ڈاک پہنچ سکتی ہے یا نہیں؟ یہ دونوں امر دریافت کر کے مجھ کو جلد لکھو۔ اگر بہ قیمتِ مناسب ہاتھ آئے اور اُس کا بھیجنا ممکن ہو تو یہاں سے روپیے کی ہنڈوی بھیج دوں اور تم خرید کر بیل گاڑی کی ڈاک پر روانہ کر دو۔ جاڑوں میں مجھ کو بہت تکلیف ہے اور یہ گڑ چھال کی شراب میں نہیں پیتا۔ یہ مجھ کو مضرت کرتی ہے اور مجھے اس سے نفرت ہے۔

ضروری، جواب طلب۔

چار شنبہ ۲۹ دسمبر ۱۸۵۸ء

از جانبِ غالبؔ جاں بہ لب

(۲)

صاحب!

تم کو دعا کہتا ہوں اور دعا دیتا بھی ہوں۔ شراب کی قیمت کے دو خط بھیجے۔ بھائی کاس ٹیلین اور اولڈ ٹام دونوں چوبیس روپے درجن میں ہمیشہ لیا کرتا تھا۔ اب یہاں مہنگی ملتی ہے میں نے تم سے پوچھا۔ جب وہاں بھی اِس قیمت کو ملتی ہے تو میرا مقدور نہیں۔ میں سمجھا تھا کہ شاید وہاں ارزاں ہو۔ خیر اس کو جانے دو۔ روٹی ہی ملے جائے تو غنیمت ہے۔ مہینا بھر کی روٹی کا مول ایک درجن کی قیمت ہے

جنوری ۱۸۵۸ء[۳]

مولوی محمد عبدالرزاق شاکر

(۱)

مخدوم مکرم، مظہرِ لطف و کرم، جناب مولوی محمد عبدالرزاق صاحب اشرف الوکلا کو درویشِ گوشہ نشیں، غالبِ حزیں کا سلام۔ آپ کے عنایت نامے کے ورود سے میں آپ کا احسان مند ہوا اور دل سے آپ کو دعائیں دیں۔ کیوں حضرت، آپ حیران ہوئے ہوں گے کہ یہ شخص اتنا فضول اور لغو کیوں ہے؟ خط کے پہنچنے سے اظہارِ منت پذیری اگر گزاف نہیں تو کیا ہے؟ اب اس خوشی اور دعائیں دینے کی وجہ سنیے، یعنی آپ کے سبب سے میں نے اپنے والا برادر، از جان عزیز تر، بہ دل نزدیک واز دیدہ دور، نامہربان بہ خود مغرور، میر قاسم علی خاں کا رقعہ اپنے نام کا پایا۔ اللہ اللہ اگر آپ باعث نہ ہوتے، تو بھائی صاحب کاہے کو مجھ کو خط لکھتے۔ انھی سے پوچھیے کہ کبھی تم نے اسدؔ کو خط لکھا ہے؟ بس بعد اس توضیح کے، آپ کی تحریر کا جواب لکھتا ہوں۔

آپ کا واسطے اصلاح کلام کے رجوع کرنا میری طرف، موجب میری نازش کا ہے۔ میرا طریق اس فنِ خاص میں یہ ہے کہ جو شعر بے عیب ہوتا ہے اُس کو بہ دستور رہنے دیتا ہوں اور جہاں لفظ کے بدلے لفظ لکھتا ہوں، اُس کی وجہ خاطر نشان کر دیتا ہوں تاکہ آیندہ صاحبِ کلام اُس قسم کے کلام میں خود اپنے کلام کا مصلح رہے۔ مطلع کا یہ مصرع:

سرخوش و سرشار و مستم، یللّے

لسانِ فارسی میں "سرشار" صفت ہے پیالے کی معنی لفظی اُس کے "لبریز" پس شارب کو لبریز کیوں کر کہیں گے ؟ اور یہ جو اُردو "مست و سرشار مترادف المعنی استعمال میں آتے ہیں۔ امر جداگانہ ہے۔ فارسی میں تتبع اردو کا ناجائز" "رندِ عالم سوز" شعرائے عجم میں بہ معنی " رند بے نام و ننگ" آیا ہے۔ جیسا کہ استاد کہتا ہے :

رندِ عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار

حسنِ مطلع سست تھا۔ "می رسد بر بادہ الخ" "بر شیشہ" یہاں انسب ہے۔ "از لحد چوں خاک جستم" خاک کو جستن سے کیا علاقہ ؟ :

نقدِ جاں را مہر بستم ، بیلے

تعقیدِ معنوی ہے۔ طالبِ عہدِ الستم - "طالبِ عہدِ الست" یعنی "عہدِ الست" کس سے مانگتا ہے۔ ہاں "سرخوش عہدِ الست" برمحل و بہ موقع۔

متوقع ہوں کہ میرا یہ رقعہ ، جو آپ کے نام کا ہے ، جناب میر قاسم علی خاں صاحب کو پڑھا دیجیے گا اور اب جو آپ مجھے خط لکھیں تو یہ بھی لکھیے گا کہ ہنوز وہ صدر امین ہیں یا ترقی کی اور صدر الصدور ہو گئے اور اگر ترقی نہیں کی تو کیا وجہ ؟

قبل ۱۸۶۵ء [۲]

(۲)

قبلہ و کعبہ !

فقیر پا در رکاب ہے۔ سہ شنبہ ، چار شنبہ ان دونوں دنوں میں سے ایک دن عازمِ رام پور ہو گا۔[۳] تقریب وہاں کے جانے کی رئیس مرحوم کی تعزیت اور رئیسِ حال کی تہنیت۔ دو چار مہینے وہاں رہنا ہو گا۔ اب جو کوئی خط آپ بھیجیں تو رام پور بھیجیں۔ مکان کا پتا لکھنا ضرور نہیں۔ شہر کا نام اور میرا نام کافی ہے۔

مخمس بعد اصلاح بھیجا جاتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ شعر آپ کہتے ہیں اور حظ میں اُٹھاتا ہوں

حسنِ اتفاق سے اصلاحِ خمسہ کے وقت دوستِ غمگسار، یارِ وفا شعار، علامۂ روزگار ختم العلماء المتبحرین مولوی مفتی صدرالدین خاں صاحب بہادر صدرالصدور سابق دہلی المتخلص بہ آزردہ دام بقاہ و زاد علاہ، کہ مجھ سے ملنے کو غم خانے پر تشریف لائے ہوئے تھے، موجود تھے۔ خمسے کو دیکھ کر پسند فرمایا۔ حضور کی بلاغت کی تحسین کی۔ عربی مصرعوں کے میرے ساتھ شریکِ غالب ہو کر مزے لوٹے اور آپ کی شرینیِ گفتار کے وصف میں تا دیر عذب البیان اور رطب اللسان رہے اور مجھ سے بقدر میرے معلوم و بیان کے، آپ کی صفاتِ حمیدہ سے واقف و آگاہ ہو کر بہت شاد و خرسند ہوئے۔ مبارک ہو نادیدہ و غائبانہ یعنی محض مشتاقانہ۔ بہ تمنائے ملاقات سلام لکھنے کو ارشاد کر گئے ہیں۔ لہٰذا میں لکھتا ہوں، قبول فرمائیے گا۔

اوائل اکتوبر ۱۸۶۵ء

(۴۳)

قبلہ!

پہلے معنیِ ابیاتِ بے معنی سُنیے۔ "نقش فریادی" الخ ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے۔ جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا۔ پس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخیِ تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورتِ تصویر ہے اُس کا پیرہن کاغذی ہے؟ یعنی ہستی اگرچہ مثلِ تصاویر اعتبارِ محض ہو، موجبِ رنج و ملال و آزار ہے۔ "شوق ہر رنگ" الخ "رقیب" بہ معنی "مخالف" یعنی شوق سر و سامان کا دشمن ہے۔ دلیل یہ کہ قیس جو زندگی میں ننگا پڑا پھرتا تھا، تصویر کے پردے میں بھی ننگا ہی رہا۔ لطف یہ ہے کہ مجنوں کی تصویر با تنِ عریاں ہی کھنچتی ہے، جہاں کھنچتی ہے۔ "زخم بے داد" الخ یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نئی نکالی ہے جیسا کہ اس شعر میں شعر:

نہیں ذریعۂ راحت، جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے، جس کو کہ دلکشا کہیے

یعنی زخم تیر کی توہین بہ سبب ایک رخنہ ہونے کے اور تلوار کے زخم کی تحسین بہ سبب ایک طاق سا کھل جانے کے، "زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی" "یعنی زائل نہ کیا تنگی کو"۔ "پرافشاں" بہ معنی "بے تاب" اور یہ لفظ تیر کے مناسب۔ حاصل یہ کہ تیر تنگی دل کی داد کیا دیتا، وہ تو خود ضیقِ مقام سے گھبرا کر پرفشاں و سراسیمہ نکل گیا۔

نامۂ غالب کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا، سن لیتا ہے، عبارت لکھ نہیں سکتا لکھوا دیتا ہے بلکہ اُس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوتِ علمی بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہلِ دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اُس کو تلمذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو اُن کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وائے اُس ہیچ پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجبِ عزّ و وقار ہو۔ رسالہ اُس کا "ساطعِ برہان" دلی پہنچ کر ڈھونڈوں گا، اگر مل گیا تو خدمت میں بھیجوں گا۔

جنابِ مستطاب میر قاسم علی خاں صاحب صادق القول ہیں۔ میرے گھر آئے ہوں گے۔ دروازہ بند پایا ہوگا۔ مگر ایک خدشہ ہے کہ حضرت میں اور میرے بھائی مرزا علی بخش خاں میں بہت ربط و اتحاد تھا، اور وہ مرحوم، خدا ایش بیامرزاد، کذب و گزاف میں ضرب المثل تھا۔ اس تصور سے اگر میں اس جملے کے سچ جاننے میں تامل کروں تو میرا تامل بے جا نہ ہوگا۔ بہ ہر حال، اُن کو میرا سلام کہیے گا۔

"سیلابچی" ایک لفظ ہے ہندیانِ فارسی داں کا۔ اصل لغت "چلمچی" ہے۔ اور یہ لغت ترکی ہے۔ معہذا "حبابِ آسماں" جب تک کہ آسماں کو بحر یا دریا نہ کہیں "حبابِ آسماں" نہ مقبول نہ مسموع۔

"دنات" مسموع ہے۔ اگر فتحۂ الف کا اشباع جائز ہو۔ ورنہ "دنات پروری" کی جگہ "ادنیٰ پروری" بہتر ہے بلکہ "دنات" یا "دناءت" بہ ہر حال صفت ہے۔ پرورش موصوف کی چاہیے، صفت کی۔ والسلام۔

اکتوبر/دسمبر ۱۸۶۵ء

(۴)

حضرت!

تین دوستوں نے مؤلفِ محرق پر جس کا نام صاحبِ تپ محرق رکھا گیا ہے، جوتی پیزار کی ہے۔ ایک رسالہ جو موجود تھا بھیجا جاتا ہے۔ وہ دو نسخے بھی اگر بہم پہنچ گئے تو بھجوا دوں گا۔ غزل بعد اصلاح کے بھیجی جاتی ہے۔ طرزِ فقیر مبارک ہو۔

۱۸۶۵ء ۳

(۵)

قبلہ!

یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ ۸ جنوری کو فقیر دلی پہنچا۔ تھکاماندہ، خستہ، رنجور، ہنوز افاقت کلی نہیں پائی۔ آج صبح دم ہوا بند ہے، دھوپ تیز ہے۔ پشت بآفتاب تکیے کے سہارے سے بیٹھا ہوا یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ غزل پہنچتی ہے۔ گوند میں لتھڑ کر ایک ٹکڑا کاغذ کا الگ ہو گیا ہے۔ حضرت بہ احتیاط اس کو لفافے سے نکالیں۔ بیت:

ہے تمھارا آفتابہ آفتابِ آسماں
دیکھ لو اپنی چلمچی میں حبابِ آسماں

اگر پسند آئے تو اس مطلع کو یوں رہنے دیجے۔

مولوی نظامی گنجوی علیہ الرحمۃ کا ایک شعر طالب علموں کے ہاتھ پڑا۔ انھوں نے از روے قواعدِ نحو اس میں کلام کرنا شروع کیا۔ مولوی کے پاس جب وہ کلمات پہنچے تو فرمایا کہ "یاراں! شعرِ مرا بہ مدرسہ کہ برد"۔ جو صاحب یہ فرماتے ہیں کہ مجموع پہلا مصرع مبتدا نہیں ہو سکتا۔ اُن سے پوچھا چاہیے کہ کیا آپ اُسی پہلے مصرعے میں سے "ظلمت کدے میں میرے" اس کو مبتدا اور "شبِ غم کا جوش ہے" اس کو خبر ٹھہراتے ہیں؟ پس اگر یوں ہے تو بھی مدعا حاصل ہے۔ دوسرا مصرع دوسری خبر سہی۔ آخر یہ بھی تو مسلماتِ فنِ نحو میں سے ہے کہ ایک مبتدا کی دو بلکہ زیادہ خبریں

ہو سکتی ہیں۔ ہاں ایک قاعدہ اور ہے یعنی جملہ فعلیہ کے ماقبل جو عبارت ہوتی ہے اس کو مبتدا نہیں کہتے۔ اس مطلع کا مصرع ثانی جملۂ اسمیہ ہے۔ اپنے ماقبل مبتدا کو قبول کرتا ہے۔ اگر ہم نے نظر اس دستور پر مصرع اول کو مبتدا کہا تو بھی قباحت لازم نہیں آتی۔ بہ ہر حال جو وہ صاحب اسی پہلے مصرع کو قرار دیں، وہ مجھے قبول ہے، مگر شعر میرا مہمل نہیں۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں؟ بھائی میر قاسم علی خاں صاحب کو بندگی۔

جنوری ۱۸۶۶ء[1]

(۶)

قبلہ!

اُس عنایت نامے کا، جو مارچ گذشتہ میں پایا ہے، آج یکم اپریل کو جواب لکھتا ہوں۔ گویا نمازِ صبح قضا پڑھتا ہوں۔ جناب مولوی غلام غوث[2] خاں بہادر میر منشی لفٹنٹ گورنری غرب و شمال کا کیا کہنا ہے۔ حسنِ سیرت وہ جو بعد ریاضتِ شاقہ اور بعد تحصیلِ فضایلِ اربعہ ملکۂ عدالت[3] حکمت حاصل ہوتا ہے۔ اس دانا دل، بیدار مغز کو فطرت[4] نے ودیعت کیا ہے۔ حسنِ صورت وہ کہ جو دیکھے پہلی نظر میں حسنِ خلق و لطفِ طبع اُس کو نظر آئے۔

فقیر ہمیشہ موردِ اعتراضات رہا ہے لیکن اکثر ایسا ہوا ہے کہ بعد دو چار دن کے معترض صاحب کا خط آیا ہے۔ لغت و ترکیب معترض فیہ کی سند کے اشعار حضرت نے اُس خط میں درج کیے ہیں۔ اللہ اللہ! جو کلکتے میں شور نشور اُٹھا تھا۔ میرا شعر:

جزوے از عالم[4] و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

خستہ جراحت ہاے اعتراض ہوا ہے۔ منشاے اعتراض یہ کہ عالم مفرد ہے۔ اس کا ربط "ہمہ" کے ساتھ بہ حسبِ اجتہادِ قتیل ممنوع ہے۔ قضارا اُس زمانے میں شاہزادہ کامران درّانی کا سفیر گورمنٹ میں آیا تھا۔ کفایت خاں اُس کا نام تھا۔ اُس تک یہ قصہ پہنچا۔ اُس نے اساتذہ کے

اشعار یا ان سات ایسے پڑھے جن میں "ہمہ عالم" و "ہمہ روز" و "ہمہ جا" مرقوم تھا۔ اور وہ اشعار "قاطع برہان" میں مندرج ہیں۔

ہاں صاحب "قاطع برہان" میں اور مطالب بڑھائے اور ایک دیباچہ دوسرا لکھا ہے اور "درفش کاویانی" اس کا نام رکھا اور اس کو چھپوایا۔ ایک مجلد اس کا آج اس خط کے ساتھ ڈاک میں بھیجتا ہوں۔ بعد پہنچنے کے اس کو دیکھیے گا اور غور سے دیکھیے گا اور اکثر وقتِ فرصت اس کو پیشِ نظر رکھیے گا اور جس دن پہنچے، اسی دن یا اس کے دوسرے دن رسید لکھیے گا اور اگر اور صاحب اس کے طالب اور خریدار ہوں تو مجھ کو لکھیے گا۔ دس پانچ دو چار جلدیں بھیج دوں گا۔ یہ نسخہ میری طرف سے آپ کی نذر ہے۔ غزل پھر بھیجوں گا۔
یکم اپریل ۱۸۶۶ء ۵

(۷)

جناب مولوی صاحب مخدوم مولوی محمد عبدالرزاق صاحب شاکر کی خدمت میں بعد سلام یہ التماس ہے کہ مولوی صاحب عالی شان مولوی مفتی اسداللہ خاں بہادر کی خدمت میں فقیر کا سلام پہنچائیے۔ میں تو آپ سے عرض کرتا ہوں مگر آپ مفتی صاحب سے کہیے کہ مجھ کو باوجود شدتِ نسیان آپ کا تشریف لانا یاد ہے۔ چھاپے کے اجزا اٹھا کر میں نے آپ کے سامنے ایک غزل اپنی پڑھی تھی۔ جس کے دو شعر قطعہ بندیہ ہیں :

از زندہ گوہرے چو من اندر زمانہ نیست
خود را بخاکِ رہ گذرِ حیدر افگنم
منصور فرقہ علی اللّٰہیان منم
آوازۂ "انا اسد اللّٰہ" در افگنم

خدا کرے حضرت کو بھی یہ واقعہ یاد ہو۔ اتحادِ اسمی دلیلِ مودتِ روحانی ہے۔

اخی مکرمی میر قاسم علی خاں کو سلام پہنچے۔ سال گذشتہ کی تعطیل کی طرح دلی آکر مجھ سے

بے ملے نہ چلے جایئے گا۔

پھر حضرت مکتوب علیہ سے کلام ہے۔ اشعار بعد حک و اصلاح کے پہنچتے ہیں۔ یہ رتبہ میری ارزش کے فوق ہے کہ میں آپ کے کلام میں دخل و تصرف کروں۔

بندہ نواز زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی حرارت عزیزی کو زوال ہے، اور یہ حال ہے۔ شعر:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں سب دوستوں کو جن سے کتابت رہتی ہے اردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط و مکاتیب[۲] لکھے اور بھیجے تھے اُن میں سے جو صاحب الی الآن ذی حیات[۳] و موجود ہیں اُن سے بھی عندالضرورت اسی زبان مروج میں مکاتبت[۴] و مراسلت کا اتفاق ہوا کرتا ہے۔

پارسی مکتوبوں[۵] و رسالوں و نسخوں و کتابوں کے مجموعے[۶] شیرازہ بستہ و چھاپا ہو کر اطراف و اقصائے عجم میں پھیل گئے۔ حال کی نثروں کو کون فراہم کرے۔ جاں کنی[۹] کے خیالات نے مجھ کو اُن کی تحریر و تعلق و بار سے دست بردار و آزاد و سبک دوش کر دیا۔ جو نثریں کہ مجموع و یکجا ہو کر جہاں جہاں منتشر ہو گئی ہیں اور آیندہ ہوں، اُنھیں کو جناب احدیت[۱۱] جلت عظمتہ مقبول قلوب اہل سخن و مطبوع طبائع ارباب فن فرمائے اور میں اب انتہائے عمر ناپائدار کو پہنچ کر آفتاب لب بام اور ہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ درگور ہوں۔ کچھ یادِ خدا بھی چاہیے نظم و نثر کے قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اُس نے چاہا تو دنیا تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہے گا۔ پس امید وار ہوں کہ آپ انھیں نذور محقرہ یعنی تحریرات روزمرۂ اردو سے سادہ و سرسری کو تا امکان غنیمت جان کر قبول فرماتے رہیں۔ اور درویش دلریش

دفرو ماندۂ کشاکشِ معاصی کے تاتمہ بخیر ہونے کی دعا مانگیں۔ اللہ بس ماسوٰے ہوس۔

تعقیدِ معنوی کو حضور خود جانتے ہوں گے۔ اس کی توضیح و تفصیل میں تحصیلِ حاصل و تطویلِ لاطائل کی صورت نظر آتی ہے۔ لہذا خامہ فرسائی بروے کار نہیں آئی۔

(۸)

حضرت!

مطالبِ علمی و شعری کا لکھنا موقوف سوال پر ہے۔ جب حضور کی طرف سے کوئی سوال آئے گا، بقدر اپنے معلوم کے، جواب لکھا جائے گا۔ شعر:

ہیں اپنے گنہ مزیلِ امید

ایمان کہاں ہے، ایک ڈر ہے

اس شعر میں قصد اچھا ہے، مگر بیان ناقص ہے۔ مطلب تو یہ ہے کہ صرف خوف، اصل ایمان نہیں، رجا کا بھی شمول چاہیے۔ اور یہ بات اس تقریر میں سے نکلتی نہیں۔

(۹)

پیرو مرشد:

اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

یہ خبر ہے۔ پہلا مصرع:

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے

یہ مبتدا ہے، شبِ غم کا جوش یعنی اندھیرا ہی اندھیرا، ظلمتِ غلیظ، سحر ناپیدا، گویا خلق ہی نہیں ہوئی۔ ہاں ایک دلیل صبح کے وجود پر ہے، یعنی بجھی ہوئی شمع، اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھ جایا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیلِ صبح ٹھہرایا ہے وہ خود ایک سبب ہے منجملہ اسبابِ تاریکی کے۔ پس دیکھا چاہیے جس گھر میں علامتِ صبح مؤیدِ ظلمت ہو گی، وہ گھر کتنا تاریک ہو گا۔ شعر:

متقابل ہے مقابل میرا
رک گیا دیکھ روانی میری

تقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا؟ نور و ظلمت، شادی و غم، راحت و رنج و وجود و عدم لفظ "مقابل" اس مصرع میں بہ معنی "مرجع" ہے۔ جیسے حریف کہ بہ معنی دوست بھی مستعمل ہے۔ مفہوم شعر یہ کہ ہم اور دوست از روے خوے و عادت ضدِ ہم دگر ہیں۔ وہ میری طبع کی روانی دیکھ کر رک گیا۔

غزل بعد اصلاح کے پہنچتی ہے۔ آپ اپنی طرف سے اس کو استصلاح سمجھتے ہیں اور میں اس کو اپنی جانب سے استفادہ جانتا ہوں۔ والسلام۔

(۱۰)

فقیر اسد اللہ نے اس کاغذ کے لفافے پر مرسلۂ محمد عبد الرزاق جعفری الحیدری اور ٹکٹ پر شاکر دیکھ کر دیر تک غور کی کہ یہ دو صاحب ہیں؟ بعد تامل یاد آیا کہ مولوی محمد عبد الرزاق صاحب اسم شریف اور شاکر تخلص ہے۔ غور کیجے کہ نسیاں کا کیا عالم ہے! واللہ اگر مجھ کو یاد ہو کہ سابق میں کوئی غزل آپ کی آئی ہو۔ یہ لفافہ لکھا ہوا یکم اگست سالِ حال کا کل میں نے ڈاک سے پایا۔ آج غزل کو دیکھا، کل یہ لفافہ روانہ کروں گا:

کوئی آتا نہیں آگے ترے جیتا ہو کر
آئینہ جب نظر آیا ہے تو اندھا ہو کر

یہ مطلع دل نشین ہے مگر اتنا تامل ہے کہ آئینے کو اندھا کہا چاہیے یا نہیں؟ شعر:

مردمِ چشمِ سیہ جب نظر آتا ہے ترا
بیٹھ جاتا ہے مرے دل میں سویدا ہو کر

"مردم" یعنی آنکھ کی پتلی مذکر نہیں، معشوق کی قید کیا ضرور؟ دعوے حسن پرستی رہے۔ عموماً یہ خوب ہے۔ شعر:

نظر آتی ہے جہاں مردمک چشم سیاہ
بیٹھ جاتی ہے مرے دل میں سویدا ہو کر
حرمتِ مے کے لیے پیرِ مغاں کا ہے یہ حکم
ریش قاضی کی رہے پنبۂ مینا ہو کر

یہ شعر بے لطف ہو گیا کس واسطے کہ جب قاضی کی ریش کہی تو وہ ابہام ریشِ قاضی کہاں رہا۔

"کارگاہِ ہستی میں الخ"، داغ ساماں مثل انجم انجمن وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ و سامان ہو۔ موجودیت لالے کی منحصر نمایشِ داغ پر ہے ورنہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے۔

بعد اس کے یہ سمجھ لیجے کہ پھول کے درخت یا غلہ جو کچھ بویا جاتا ہے، دہقان کو جوتنے بونے، پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہو جاتا ہے۔ مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وہ وجود محض رنج و عنا ہے۔ مزارع کا وہ لہو جو کشت و کار میں گرم ہوا ہے وہی لالے کی راحت کے خرمن کا برق ہے۔ حاصل موجودیت داغ اور داغ مخالفِ راحت اور صورتِ رنج۔

غنچہ تا الخ کلی جب سے نکلے بہ صورت قلب صنوبری نظر آئے اور جب تک پھول بنے۔ برگ عافیت معلوم۔ یہاں معلوم بہ معنی معدوم ہے اور برگ عافیت بہ معنی مایۂ آرام:

برگ عیشی بگور خویش فرست

برگ اور سرو برگ بہ معنی ساز و سامان ہے۔ خواب گل شخصیت گل بہ اعتبار خموشی و برجاماندگی، بہ پریشانی ظاہر ہے یعنی شگفتگی۔ وہی پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا۔ غنچہ بہ صورت دل جمع ہے۔ باوصفِ جمعیتِ دل گل کو خواب پریشاں نصیب ہے۔ ہم سے رنج الخ" پشت دست، صورت عجز اور خس بہ دنداں و کاہ بہ دنداں گرفتن بھی اظہارِ عجز ہے۔ پس جس عالم میں کہ داغ نے پشتِ دست زمین پر رکھ دی ہو اور شعلے نے تنکا دانتوں میں لیا ہو، ہم سے رنج اضطراب کا تحمل کس طرح ہو؟

قبلہ! ابتداے فکرِ سخن میں بیدلؔ و اسیرؔ و شوکتؔ کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا:

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لکھنا
اسداللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامینِ خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیے۔

بندہ پرور! اصلاحِ نثری کی ضرورت نہیں۔ آپ کی انشا کی یہ روش خاص دل چسپ اور بے عیب ہے۔ اس وضع کو نہ چھوڑیے اور جو میرا تتبع اور مجھ پر توجہ منظور ہو تو "پنج آہنگ" وغیرہ میری مصنفات کو بامعان نظر و صرفِ ہمت ملاحظہ فرمایئے اور مشق بڑھایئے۔ چشمِ بد دور طبیعت حضور کی نہایت عالی اور مناسب اس فن کے ہے۔ میں آپ کی رسائیِ ذہن اور قوتِ قلم سے امید قوی رکھتا ہوں کہ عنقریب بہت خوب لکھیے گا۔ میرے اور تمام دوستوں کے فخر اور دشمنوں کے رشک ہو جایئے گا۔ اِنَّ هٰذَا مِنْ بَرَکَةِ الْعِلْمِ یَا مَوْلَانَا وَ بِالْفَضْلِ وَالْکَمَالِ اَوْلَانَا۔

متن کے ماخذ

۱۔ اردوے معلّٰی، مطبع اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۹ء (اردوے معلّٰی)۔
۲۔ عودِ ہندی، مطبعِ مجتبائی، میرٹھ، ۱۸۶۸ء (عودِ اوّل)۔
۳۔ عودِ ہندی، مطبعِ مجتبائی، میرٹھ، (۱۸۶۸ء) (عودِ دوم)۔
۴۔ اردوے معلّٰی، حصہ اول مع حصہ دوم، مطبعِ نامی مجتبائی، دہلی ۱۸۹۹ء (اردوے معلّٰی مجتبائی)۔
۵۔ نقوش، لاہور، مکاتیب نمبر جلد ا۔
۶۔ اردوے معلّٰی، دہلی یونیورسٹی غالب نمبر ۲۔
۷۔ نقوش، لاہور، خطوط نمبر، جلد ا۔
۸۔ آج کل، (دہلی ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء)۔
۹۔ ہندوستانی، الٰہ آباد، ۱۹۳۴ء۔
۱۰۔ اردو، سہ ماہی (اورنگ آباد، اپریل، ۱۹۴۲ء)۔
۱۱۔ آج کل، نئی دلّی، مئی ۱۹۷۰ء۔

۱۲۔ خیابان، لکھنؤ، نومبر ۱۹۳۳ء۔
۱۳۔ آجکل، نئی دہلی، مارچ ۱۹۶۳ء۔
۱۴۔ اردوے معلّیٰ، ماہنامہ، علیگڈھ، دسمبر ۱۹۰۷ء۔
۱۵۔ اردوے معلّیٰ، مکمل، مبارک علی، لاہور، ۱۹۳۰ء۔
۱۶۔ مرقع ادب، حصہ ا۔
۱۷۔ غالب کی نادر تحریریں، ۱۹۶۱ء، دہلی۔
۱۸۔ آجکل، نئی دلی، فروری ۱۹۶۰ء۔
۱۹۔ انتخاب غالب، (عکس) غالب انسٹی ٹیوٹ لائبریری، نئی دہلی۔ (انتخاب)۔
۲۰۔ الناظر، لکھنؤ، یکم مئی ۱۹۱۴ء، ص ص ۱۰-۱ (الناظر)۔
۲۱۔ فروغ اردو (غالب نمبر) لکھنؤ ۱۹۶۸ء۔

میر مہدی مجروحؔ

۱۔ میاں! آج یک شنبے کا دن، ساتویں فروری کی اور شاید بائیسویں جمادی الثانی کی ہے۔
(اردوے معلّیٰ ص ۱۵۶) ۷ فروری ۱۸۵۸ء

۲۔ صاحب! دو خط تمھارے بہ سبیلِ ڈاک آئے۔
(اردوے معلّیٰ ص ۱۶۰) ۲۱ اپریل ۱۸۵۸ء

۳۔ کیوں یار، کیا کہتے ہو؟
(اردوے معلّیٰ ص ۱۹۷۔ عود اول ص ۸۷۔ عود دوم ص ۷۸) اپریل ۱۸۵۸ء

۴۔ خوبی دین و دنیا روزی باد
(اردوے معلّیٰ ص ۱۸۹۔ عود اول ص ۸۶ ۸ اگست ۱۸۵۸ء
عود دوم ص ۸۶)

۵۔ بھائی! تم تو لڑکوں کی سی باتیں کرتے ہو۔
(انتخاب۔ اردوے معلی مجتبائی حصہ ۲ — اگست ۱۸۵۸ء
ص ص ۶۳-۶۴)

۶۔ میاں! تم کو پنشن کی کیا جلدی ہے؟
(اردوے معلی ص ۱۶۱) — ۷ اکتوبر ۱۸۵۸ء

۷۔ سید صاحب! تمھارے خط کے آنے سے وہ خوشی ہوئی، جو کسی دوست کے دیکھنے سے ہو۔
(اردوے معلی ص ۱۸۸۔ عود اول ص ۸۶۔ — اکتوبر ۱۸۵۸ء
عود دوم ص ۸۶)

۸۔ بھائی! ایک خط تمھارا پہلے پہنچا۔
(اردوے معلی ص ۱۷۱۔ عود اول ص ۷۲۔ — نومبر ۱۸۵۸ء
عود دوم ص ۷۲)

۹۔ واہ واہ، سید صاحب! تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے۔
(اردوے معلی ص ۱۷۴۔ عود اول ص ۷۶۔ — ۲۲ دسمبر ۱۸۵۸ء
عود دوم ص ۷۶)

۱۰۔ سید صاحب! نہ تم مجرم، نہ میں گنہگار۔
(اردوے معلی ص ۱۹۳۔ عود اول ص ۸۲۔ — ۲ فروری ۱۸۵۹ء
عود دوم ص ۸۲)

۱۱۔ میری جان! خدا تجھ کو ایک سو بیس برس کی عمر دے۔
(اردوے معلی ص ۱۹۵۔ عود اول ص ۸۱۔
عود دوم ص ۸۱) — فروری ۱۸۵۹ء

۱۲۔ میاں! کیوں تعجب کرتے ہو یوسف مرزا کے خطوط کے نہ آنے سے۔
(اردوے معلی ص ۱۹۸۔ عود اول ص ۷۷۔ عود دوم ص ۷۷) — فروری ۱۸۵۹ء

۱۳- میری جان! سنو داستان۔
(اردوے معلّٰی ص ۱۷۲- عود اول ص ۷۴- مارچ ۱۸۵۹ء
عود دوم ص ۷۴)

۱۴- میر مہدی! جیتے رہو۔ آفریں، صد ہزار آفریں۔
(اردوے معلّٰی ص ۱۹۱- عود اول ص ۸۳- ہفتم مارچ ۱۸۵۹ء
عود دوم ص ۸۳- الناظر ص ۲)

۱۵- سیّد! خدا کی پناہ! عبارت لکھنے کا ڈھنگ ہاتھ کیا آیا ہے۔
(اردوے معلّٰی ص ۱۷۰- عود اول ص ۷۲- ۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء
عود دوم ص ۷۲- الناظر ص ۷)

۱۶- مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے۔
(اردوے معلّٰی ص ۱۹۰- عود اول ص ۸۴-
عود دوم ص ۸۴) اپریل ۱۸۵۹ء

۱۷- برخوردار کامگار میر مہدی! قطعہ تم نے دیکھا۔
(اردوے معلّٰی ص ۱۹۶- الناظر ص ۹ عود اول و دوم ص ۷۹) ۶ جولائی ۱۸۵۹ء

۱۸- میری جان! تم کو تو بے کاری میں خط لکھنے کا ایک شغل ہے۔
(اردوے معلّٰی ص ۱۸۰- عود اول ص ۹۴- ۱۵ اکتوبر ۱۸۵۹ء
عود دوم ۹۴)

۱۹- بھائی! نہ کاغذ ہے نہ ٹکٹ ہے۔
(اردوے معلّٰی ص ۱۵۵) ۸ نومبر ۱۸۵۹ء

۲۰- میری جان! تو کیا کہہ رہا ہے۔
(اردوے معلّٰی ص ۱۷۵- عود اول ص ۹۹- نومبر ۱۸۵۹ء
عود دوم ص ۹۹)

۲۱- بھائی! کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟

(انتخاب یار اردوئے معلیٰ ص ۱۸۲ - عود اول ص ۹۲ - — ۲ دسمبر ۱۸۵۹ء

عود دوم ص ۹۲ - الناظر ص ۲)

۲۲- گ بے مے نکند در کفِ من خامہ روانی

(انتخاب - اردوئے معلیٰ ص ۱۷۷- — ۱۳ دسمبر ۱۸۵۹ء

عود اول ص ۹۷ - عود دوم ص ۹۷ الناظر-)

۲۳- میاں لڑکے! کہاں پھر رہے ہو؟

(اردوئے معلیٰ ص ۱۶۶) — یکم جنوری ۱۸۶۰ء

۲۴- اہاہا! میرا پیارا میر مہدی آیا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۶۹- عود اول ص ۶۷ - — فروری ۱۸۶۰ء

عود دوم ص ۶۷)

۲۵- میر مہدی! تم میرے عادات کو بھول گئے؟

(اردوئے معلیٰ ص ۱۶۱) — ۶ اپریل ۱۸۶۰ء

۲۶- میاں! کیوں ناسپاسی و ناحق شناسی کرتے ہو؟

(اردوئے معلیٰ ص ۱۸۱- عود اول ص ۹۳ - — اوائل مئی ۱۸۶۰ء

عود دوم ص ۹۳)

۲۷- جانِ غالب! اب کے ایسا بیمار ہو گیا تھا۔

(انتخاب - اردوئے معلیٰ ص ۱۸۵- عود اول ص ۹۱- — ۶ جون ۱۸۶۰ء

عود دوم ص ۹۱)

۲۸- میاں! تمہارے خط کا جواب منحصر تین باتوں پر ہے۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۵۹) — ۱۸ دسمبر ۱۸۶۰ء

۲۹۔ میاں! تمھاری تحریر کا جواب یہ ہے۔

(اردوئے معلّٰی ص ۱۵۸) ۹ جنوری ۱۸۶۱ء

۳۰۔ لو صاحب! یہ تماشا دیکھو۔

(اردوئے معلّٰی ص ۱۶۵) ۱۱ جنوری ۱۸۶۱ء

۳۱۔ جانِ غالب! تمھارا خط پہنچا۔

(انتخاب۔ اردوئے معلّٰی ص ۱۸۳۔ عودِ اول ص ۹۱۔ ۱۸۶۰ء

عودِ دوم ص ۹۱)

۳۲۔ او میاں! سید زادۂ آزادہ، دلّی کے عاشقِ دلدادہ۔

(انتخاب۔ اردوئے معلّٰی ص ۱۶۹۔ عودِ اول ص ۷۰۔ ۲۳ مئی ۱۸۶۱ء

عودِ دوم ص ۷۰۔ الناظر ص ۵)

۳۳۔ اے جنابِ میرن صاحب! السلام علیکم۔

(اردوئے معلّٰی ص ۱۶۷۔ عودِ اول ص ۶۸۔ مئی ۱۸۶۱ء

عودِ دوم ص ۶۸)

۳۴۔ میاں! کس حال میں ہو؟

(عودِ اول ص ۷۵۔ عودِ دوم ص ۷۵) مئی ۱۸۶۱ء

۳۵۔ برخوردار! تمھارا خط آیا۔

(اردوئے معلّٰی ص ۱۶۶۔ عودِ اول ص ۶۶ ۱۸۶۱ء

عودِ دوم ص ۶۶)

۳۶۔ سید صاحب! کل پہر دن رہے تمھارا خط پہنچا۔

(انتخاب۔ اردوئے معلّٰی ص ۱۸۵۔ عودِ اول ص ۹۰۔ ۲۶ جولائی ۱۸۶۱ء

عودِ دوم ص ۹۰)

۳۷۔ بھائی! تم سچ کہتے ہو۔ — ۸ اگست ۱۸۶۱ء
(اردوئے معلّٰی ص ۱۵۴)

۳۸۔ ہاں صاحب! تم کیا چاہتے ہو؟ — ۲۲ ستمبر ۱۸۶۱ء
(انتخاب۔ اردوئے معلّٰی ص ۱۸۶۔ عود اول ص ۸۹۔
عود دوم ۸۹)

۳۹۔ صاحب! آج تمہارا خط دوپہر کو آیا۔ — ۱۶ مئی ۱۸۶۲ء
(اردوئے معلّٰی ص ۱۶۴)

۴۰۔ سیّد صاحب! اچھا ڈھکوسلا نکالا ہے۔ — ۲۹ جولائی ۱۸۶۲ء
(انتخاب۔ اردوئے معلّٰی ص ۱۷۶ عود اول ص ۹۸۔
عود دوم ص ۹۸)

۴۱۔ واہ حضرت! کیا خط لکھا ہے۔ — ۲۶ ستمبر ۱۸۶۲ء
(انتخاب۔ اردوئے معلّٰی ص ۱۷۸۔ عود اول ۹۵۔
عود دوم ص ۹۵)

۴۲۔ میری جان! خط نہ بھیجو۔ — ۲۰ نومبر ۱۸۶۲ء
(اصل خط)

۴۳۔ ع جو یائے حالِ دہلی والوالسلام لو۔ — ۱۶ دسمبر ۱۸۶۲ء
(انتخاب۔ اردوئے معلّٰی ص ۱۶۲)

۴۴۔ برخوردار! تمہارا خط پہنچا۔ — جنوری ۱۸۶۳ء
(انتخاب)

۴۵۔ نورِ چشم میر مہدی کو بعد دعا کے معلوم ہو۔ — ۲۲ اگست ۱۸۶۳ء
(اردوئے معلّٰی ص ۱۵۷)

۴۶۔ آیئے جناب میر مہدی صاحب دہلوی۔
(اردوے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲، ص ۶۳) — ۸ دسمبر ۱۸۶۳ء

۴۷۔ قرۃ العین میر مہدی و میر سرفراز حسین۔
(اردوے معلّٰی ص ۱۶۰) — ۱۷ جنوری ۱۸۶۵ء

۴۸۔ برخوردار نورِ چشم میر مہدی کو بعد دعاے حیات وصحت کے معلوم ہو۔
(اردوے معلّٰی ص ۱۷۰۔ عودِ اول ص ۷۳۔
عودِ دوم ص ۷۳)

۴۹۔ برخوردار کامگار، میر مہدی دہلوی۔
(اردوے معلّٰی ص ۱۵۸)

۵۰۔ میری جان! وہ پارسیِ قدیم جو ہوشنگ وجمشید وکیخسرو کے عہد میں مروّج تھی۔
(عودِ اول ص ۸۸۔ عودِ دوم ص ۸۸)

میاں داد خاں سیّاح

۱۔ برخوردار کامگار، سعادت نشاں، منشی میاں داد خاں سیاح طال عمرہٗ۔
(اردوے معلّٰی، ص ۱۵) — ۱۱ جون ۱۸۶۰ء

۲۔ برخوردار! تمھارا خط پہنچا۔ لکھنؤ کا کیا کہنا ہے۔
(اردوے معلّٰی، ص ۲۶) — ۳۰ جون ۱۸۶۰ء

۳۔ بھائی! تمھاری جان کی اور اپنے ایمان کی قسم کہ فنِ تاریخ گوئی ومُعَمّا سے بیگانۂ محض ہوں۔
(اردوے معلّٰی مجتبائی، حصہ ۲ ص ۴۹) — ۳۱ جولائی ۱۸۶۰ء

۴۔ سعادت واقبال نشان، منشی میاں داد خاں سے میں بہت شرمندہ ہوں۔
(اردوے معلّٰی، ص ۱۳) — ۳۱ دسمبر ۱۸۶۰ء

۵۔ منشی صاحب! تمھارے خط کے پہنچنے کی تم کو اطلاع دیتا ہوں۔
(اردوے معلیٰ، مجتبائی، حصہ ۲، ص ۴۸) ۱۲ فروری ۱۸۶۱ء
۶۔ منشی صاحب! سعادت و اقبال نشان، سیف الحق میاں داد خاں سیاح کو دعا۔
(اردوے معلیٰ، مجتبائی، حصہ ۲، ص ۴۶) جنوری/فروری ۱۸۶۱ء
۷۔ بھائی! ہم نے تم کو یہ نہیں کہا کہ تم مرزا رجب علی بیگ کے شاگرد ہو جاؤ۔
(اردوے معلیٰ، مجتبائی، حصہ ۲، ص ۴۷) ۲۷ فروری ۱۸۶۱ء
۸۔ صاحب! کل آپ کا خط آیا۔
(اردوے معلیٰ ص ۱۸) ۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء
۹۔ صاحب! آج تمھارے کئی خطوں کا جواب لکھتا ہوں۔
(اردوے معلیٰ، ص ۲۷) ۲۰ نومبر ۱۸۶۱ء
۱۰۔ جناب منشی صاحب! آپ کا خط مع خط مہری لفٹنٹ گورنر آگرہ، کہ وہ میرا بھیجا ہوا تھا، پہنچا۔
(اردوے معلیٰ ص ۲۷) ۱۰ فروری ۱۸۶۲ء
۱۱۔ آیئے بیٹھیے، مولانا سیاح!
(اردوے معلیٰ، ص ۱۹) ۲۰ مئی ۱۸۶۲ء
۱۲۔ صاحب! میرا سلام۔ تمھارا خط پہنچا۔
(اردوے معلیٰ، ص ۲۸) ۱۷ جون ۱۸۶۲ء
۱۳۔ صاحب! میں تم سے شرمندہ ہوں۔ پہلا خط تمھارا مع قصیدہ پہنچا۔
(اردوے معلیٰ، ص ۲۹) ۱۸ نومبر ۱۸۶۲ء
۱۴۔ منشی صاحب، سعادت و اقبال نشان، شکوہ تمھارا میرے سر آنکھوں پر
(اردوے معلیٰ، ص ۲۹) ۶ اگست ۱۸۶۳ء
۱۵۔ خاں صاحب! سعادت و اقبال نشان سیف الحق میاں داد خاں سیاح کو فقیر

گوشہ نشیں کا سلام پہنچے۔

(اردوئے معلّٰی، ص ۲۱) یکم مارچ ۱۸۶۴ء

۱۶۔ صاحب! یہ سر پیٹنے کی جگہ ہے کہ تمھارا کوئی خط ڈاک میں ضائع نہیں ہوتا۔

(اردوئے معلّٰی، ص ۱۴) ۱۷ ستمبر ۱۸۶۴ء

۱۷۔ منشی صاحب! یہ کیا اتفاق ہے کہ میری بات کوئی نہیں سمجھتا۔

(اردوئے معلّٰی، ص ۲۱) ۳ دسمبر ۱۸۶۴ء

۱۸۔ سعادت و اقبال نشان، سیف الحق میاں منشی میاں داد خاں سیاح کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔

(اردوئے معلّٰی، ص ۲۲) ۳ جنوری ۱۸۶۵ء

۱۹۔ منشی صاحب سعادت و اقبال نشان، سیف الحق میاں داد خاں سلمکم اللہ تعالیٰ فقیر کی طرف سے دعا و سلام قبول کریں۔

(اردوئے معلّٰی، ص ۱۵) ۱۳ اپریل ۱۸۶۵ء

۲۰۔ صاحب! تمھارا مہربانی نامہ کہ گویا الفاظ اس کے سراسر نواب میر غلام بابا خاں صاحب کی زبانی تھے۔

(اردوئے معلّٰی، ص ۱۶) ۳۰ جولائی ۱۸۶۵ء

۲۱۔ منشی صاحب سعادت و اقبال نشان، منشی میاں داد خاں سیاح، سیف الحق سلمکم اللہ تعالیٰ۔

(اردوئے معلّٰی، ص ۳۰) ۱۱ ستمبر ۱۸۶۵ء

۲۲۔ منشی صاحب! سعادت و اقبال نشان، سیف الحق میاں داد خاں، تم سلامت رہو۔

(اردوئے معلّٰی، ص ۲۶) ۱۷ ستمبر ۱۸۶۵ء

۲۳ صاحب! میں خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ تم اپنے وطن گئے۔

(اردوئے معلّٰی، ص ۳۱) ۲۳ جنوری ۱۸۶۶ء

۲۴۔ منشی صاحب سعادت و اقبال نشاں سیف الحق میاں داد خاں کو فقیر اسد اللہ

کا سلام۔

(اردوے معلیٰ، ص ۲۴) ۲۱ فروری ۱۸۶۶ء

۲۵۔ اقبال نشان، سیف الحق کو دعا پہنچے۔

(اردوے معلیٰ، ص ۲۴) ۲۲ مارچ ۱۸۶۶ء

۲۶۔ مولانا سیف الحق! اب تو کوئی خط تمھارا نوٹ اور ہنڈوی اور ٹکٹ سے خالی نہیں ہوتا۔

(اردوے معلیٰ، ص ۲۴) ۲۳ اپریل ۱۸۶۶ء

۲۷۔ بھائی سیف الحق، تمھارا خط پہنچا۔

(اردوے معلیٰ، ص ۲۳) ۵ ستمبر ۱۸۶۶ء

۲۸۔ منشی صاحب! وہی جہاں، وہی زمین، وہی آسمان، وہی سورت بمبئی، وہی دلی۔

(اردوے معلیٰ، ص ۲۵) ۳ جنوری ۱۸۶۷ء

۲۹۔ صاحب! تمھارے خط کے پہنچنے سے کمال خوشی ہوئی۔

(اردوے معلیٰ، ص ۲۳) ۲۵ جنوری ۱۸۶۷ء

۳۰۔ منشی صاحب شفیق، بدل مہربان، عزیز تر از جان۔

(اردوے معلیٰ، ص ۱۷) ۱۲ فروری ۱۸۶۷ء

۳۱۔ بھائی! تم جیتے رہو اور مراتبِ عالی کو پہنچو۔

(اردوے معلیٰ، ص ۳۲) ۳۱ مارچ ۱۸۶۷ء

۳۲۔ منشی صاحب! سعادت و اقبال نشان عزیز تر از جان سیف الحق میاں داد خاں سیاح کو غالب کی دعا پہنچے۔

(اردوے معلیٰ، ص ۳۲) ۲۳ اپریل ۱۸۶۷ء

۳۳۔ بھائی! تمھارا خط کل پہنچا، آج جواب لکھتا ہوں۔

(اردوے معلیٰ، مجتبائی، حصہ ۲، ص ۴۹) ۲۹ اپریل ۱۸۶۷ء

۳۴۔ منشی صاحب سعادت و اقبال نشان، سیف الحق، منشی میاں داد خاں سیاح کو غالب ناتواں نیم جاں کی دعا پہنچے۔
(اردوے معلّٰی، ص ۳۳) ۱۱ جون ۱۸۶۷ء

۳۵۔ نورِ چشم اقبال نشان سیف الحق میاں داد خاں سیاح کو غالب نیم جاں کی دعا پہنچے۔
(اردوے معلّٰی، ص ۲۰) ۲۵ اگست ۱۸۶۷ء

۹۔ چودھری عبدالغفور سرور

میرے کرم فرما، میرے شفیق۔
(اردوے معلّٰی، ص ۱۲۷، عودِ اول و دوم ص ۳۱) قبل مارچ ۱۸۵۸ء

۲۔ چودھری صاحب شفیقِ مکرم کی خدمت میں بعد ارسالِ سلامِ مسنون عرض کرتا ہوں۔
(عودِ اول و دوم، ص ۶) مارچ، اپریل ۱۸۵۸ء

۳۔ بندہ پرور! مہربانی نامہ آیا۔ سر پر رکھا، آنکھوں سے لگایا۔
(عودِ اول و دوم، ص ۸) اپریل یا مئی ۱۸۵۸ء

۴۔ بندہ پرور! آپ کا تفقد نامہ محررۂ پندرہ نومبر آج پنجشنبے کے دن اٹھارہ نومبر کو یہاں پہنچا۔
(عودِ اول و دوم، ص ۱۲) ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء

۵۔ جناب چودھری صاحب! آپ کا عنایت نامہ اُس وقت پہنچا اور یہ وقت صبح کا ہے۔
(اردوے معلّٰی ص ۱۲۱۔ عودِ اول و دوم، ص ۱۳) یکم دسمبر ۱۸۵۸ء

۶۔ جناب چودھری صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں، اور شکرِ احسان بجالاتا ہوں۔
(عودِ اول و دوم، ص ۱۴) مارچ ۱۸۵۹ء

۷۔ جناب چودھری صاحب! آپ کو بعد ابلاغِ سلام آپ کے خط کے پہنچنے

سے آگہی دیتا ہوں۔

(عود اول و دوم ص ۱۶) مارچ ۱۸۵۹ء

۸۔ چودھری صاحب مشفق مکرم کو میرا سلام۔ آپ کا خط کہ بسوائے چند سطر کے جو تم نے لکھی تھیں۔

(عود اول و عود دوم، ص ۴۲) مارچ یا اپریل ۱۸۵۹ء

۹۔ جناب چودھری کی یادآوری اور مہرگستری کا شکر بجالاتا ہوں۔

(اردوے معلّٰی ص ۱۳۳۔ عود اول و دوم ص ۲۳) مئی یا جون ۱۸۵۹ء

۱۰۔ شفیقِ مکرم، مظہرِ لطف وکرم۔

(اردوئے معلّٰی ص ۱۳۵۔ عوداول و دوم ص ۲۵) جون ۱۸۵۹ء

۱۱۔ شفیق میرے، عنایت فرما میرے۔

(اردوے معلّٰی، ص ۱۳۶۔ عود اول و دوم ص ۲۶) جولائی یا اگست ۱۸۵۹ء

۱۲۔ میرے شفیقِ دلی چودھری عبدالغفور صاحب کو خدا سلامت رکھے۔

(اردوے معلّٰی، ص ۱۳۶۔ عوداول و دوم ص ۲۶) جولائی یا اگست ۱۸۵۹ء

۱۳۔ میرے مشفق کو میرا سلام پہنچے۔

(عود ہندی ص ۲۹) اگست یا ستمبر ۱۸۵۹ء

۱۴۔ میرے شفیقِ دلی کو میرا سلام پہنچے۔ کل "انشا" کا پارسل پہنچا۔

(اردوے معلّٰی، ص ۱۳۷۔ عود اول و دوم، ص ۳۱) اکتوبر یا نومبر ۱۸۵۹ء

۱۵۔ جنابِ عالی! آج آپ کا تفقد نامہ مرقومۂ یازدہم شعبان مطابق پنجم مارچ الخ

(اردوے معلّٰی، ص ۱۰۱۔ عوداول و دوم ص ۲۲) اپریل ۱۸۶۰ء

۱۶۔ میرے مشفق! آپ کا خط آیا اور اس کے آنے نے تمہاری رنجش کا وسوسہ میرے دل سے مٹایا۔

(اردوے معلّٰی، ص ۱۴۰۔ عود اول و دوم، ص ۳۳) ستمبر ۱۸۶۰ء

۱۷۔ میرے مشفق چودھری عبدالغفور صاحب اپنے خط اور قصیدہ بھیجنے کا مجھ کو شکر گزار الخ

(اردوئے معلیٰ، ص ۱۴۲۔ عود اول و دوم، ص ۳۵) نومبر سنہ ۱۸۶۰ء

۱۸۔ حضرت چودھری صاحب! عنایت نامہ سابق الخ

(عود اول و دوم، ص ۳۸) جون سنہ ۱۸۶۲ء

۱۹۔ بندہ پرور! پرسوں تمھارا خط آیا۔ آج جواب لکھ رکھتا ہوں۔

(اردوئے معلیٰ، ص ۱۴۸۔ عود اول و دوم، ص ۴۵) جولائی سنہ ۱۸۶۳ء

۲۰۔ ایک عبارت لکھتا ہوں۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۵۰۔ عود اول و دوم ص ۴۶) دسمبر سنہ ۱۸۶۳ء

۲۱۔ آہاہا! جناب منشی ممتاز علی خاں صاحب مارہرہ پہنچے۔ عود اول و دوم ص ۴۷ دسمبر سنہ ۱۸۶۳ء

۲۲۔ جناب چودھری صاحب۔ میں تو خدمت بجا لایا۔

(اصل خط کا عکس) ۲۵ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء

۲۳۔ جناب چودھری صاحب کو سلام پہنچے۔

(اردوئے معلیٰ، ص ۱۴۴۔ عود اول و دوم، ص ۳۹)

۲۴۔ جناب چودھری صاحب! آپ کے تلطف نامہ کے ورود کی مسرت اور پارسل نہ پہنچنے کی حیرت۔

(اردوئے معلیٰ، ص ۱۳۳۔ عود اول و دوم، ص ۲۴)

۲۵۔ بندہ پرور! بہت دن کے بعد پرسوں آپ کا خط آیا۔

(اردوئے معلیٰ، ص ۱۴۶۔ عود اول و دوم، ص ۴۱) عود اول و دوم ص ۴۷ دسمبر سنہ ۱۸۶۳ء

۲۶۔ جناب چودھری صاحب! سیاہی پھیکی، کاغذ پتلا۔

(اردوئے معلیٰ، ص ۱۴۷۔ عود اول و دوم، ص ۴۲)

۲۷۔ جناب عالی "بجہاچہا" ترجمۂ ہندی ہے۔

(عود اول و دوم، ص ۲۸)

حکیم غلام نجف خاں

۱۔ میاں حقیقتِ حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں۔
(اردوے معلّٰی، ص ۲۱۹) ۲۱ دسمبر ۱۸۵۷ء

۲۔ میاں! تمھارا خط پہنچا۔
(اردوے معلّٰی، ص ۲۲۰) ۲۶ دسمبر ۱۸۵۷ء

۳۔ سعادت و اقبال نشان حکیم غلام نجف خاں طال بقاءہ۔
(اردوے معلّٰی، ص ۲۱۸) ۱۹ جنوری ۱۸۵۸ء

۴۔ بھائی! ہوش میں آؤ۔
(اردوے معلّٰی، ص ۲۲۱) ۱۸۵۸ء

۵۔ میاں! تم کو مبارک ہو کہ حکیم صاحب پر سے وہ سپاہی جو اُن کے اوپر متعین تھا اُٹھ گیا۔
(اردوے معلّٰی، ۲۲۰) یکم اپریل ۱۸۵۸ء

۶۔ بھائی! میرا دُکھ سنو۔ ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے۔
(اردوے معلّٰی، ۲۲۵) اپریل ۱۸۵۸ء

۷۔ بھائی! تمھارے رقعے کا جواب پہلے تم کو شیر زماں خاں نے دیا ہوگا۔
(اردوے معلّٰی، ۲۲۷) فروری، مارچ ۱۸۵۸ء

۸۔ بھائی! ہاں غلام فخر الدین خاں کی رہائی، زندگی دوبارہ ہے۔
(اردوے معلّٰی، ص ۲۲۷) اگست ۱۸۵۸ء

۹۔ قبلہ! یہ تو معلوم ہوا کہ بعد قتل ہونے دس آدمی کے، کہ دو اُس میں عزیز بھی تھے۔
(اردوے معلّٰی، ص ۲۲۶) ستمبر ۱۸۵۸ء

۱۰۔ میاں! میں تم سے رخصت ہو کر اس دن مرادنگر میں رہا۔
(اردوے معلّٰی، ص ۲۳۲) ۲۱ جنوری ۱۸۶۰ء

۱۱۔ برخوردار سعادت و اقبال نشان حکیم غلام نجف خاں کو میری دعا پہنچے۔
(اردوے معلیٰ، ص ۲۲۸) ۳ فروری سنہ ۱۸۶۰ء

۱۲۔ میاں! تم نے بُرا کیا کہ لفافہ کھول کر نہ پڑھ لیا۔
(اردوے معلیٰ، ص ۲۲۹) ۱۴ فروری سنہ ۱۸۶۰ء

۱۳۔ صاحب! کل آخر روز تمھارا خط آیا۔ میں نے پڑھا۔
(اردوے معلیٰ، ۲۲۴) ۱۱ جنوری سنہ ۱۸۶۳ء

۱۴۔ میاں! تمھارا گلہ میرے سر و چشم پر۔
(اردوے معلیٰ، ص ۲۳۱) یکم اپریل سنہ ۱۸۶۵ء

۱۵۔ بھائی! میں تم کو کیا بتاؤں کہ میں کیسا ہوں؟
(اردوے معلیٰ ۲۲۲) ستمبر سنہ ۱۸۶۵ء

۱۶۔ برخوردار حکیم نجف خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔
(اردوے معلیٰ، ص ۲۳۳) ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۸۶۵ء

۱۷۔ اقبال نشان، عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں کو غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔
(اردوے معلیٰ، ص ۲۱۹) ۲۱ اکتوبر سنہ ۱۸۶۵ء

۱۸۔ صاحب! تم سچ کہتے ہو۔
(اردوے معلیٰ، ص ۲۲۳) ۲۴ اکتوبر سنہ ۱۸۶۵ء

۱۹۔ صاحب! تمھارے دو خط متواتر آئے۔
(اردوے معلیٰ، ص ۲۳۰) ۱۲ نومبر سنہ ۱۸۶۵ء

۲۰۔ حکیم غلام نجف خاں، سنو!
(اردوے معلیٰ ۲۲۰)

۲۱۔ میاں! آج صبح کو تم آئے۔
(اردوے معلیٰ، ص ۲۳۲)

۲۲۔ میاں! پہلے ظہیر الدین کا حال لکھو، پھر حکیم صاحب کی حقیقت لکھو۔
(اردوے معلیٰ، ص ۲۲۲)

۲۳۔ میاں! چاتول بُرے، بڑھتے نہیں۔ بلے نہیں۔ پتلے نہیں۔
(اردوے معلیٰ، ص ۲۲۱)

خواجہ غلام غوث خاں بےخبر

۱۔ پیر و مرشد! یہ خط ہے یا کرامت؟
(اردوے معلیٰ، ص ۲۷۶ عود اول و عود دوم ص ۱۲۰) ۲ دسمبر ۱۸۵۸ء

۲۔ قبلہ! اس نامۂ مختصر نے وہ کیا جو پارۂ ابر کشت خشک سے کرے۔
(اردوے معلیٰ، ص ۲۷۳، عود اول و عود دوم، ص ۱۲۱) اوائل دسمبر ۱۸۵۸ء

۳۔ قبلۂ حاجات! عطوفت نامے کے آنے سے آپ کا بھی شکر گزار ہوا۔
(عود اول و عود دوم، ص ۱۲۲) اواخر دسمبر ۱۸۵۸ء

۴۔ جناب عالی! آج دوشنبہ ۳ جنوری ۱۸۵۹ء کی ہے۔
(اردوے معلیٰ، ص ۲۷۵۔ عود اول و عود دوم، ص ۱۲۲) ۳ جنوری ۱۸۵۹ء

۵۔ قبلہ! کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے۔
(اردوے معلیٰ، ص ۲۷۴، عود اول و عود دوم، ص ۱۱۹) ۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء

۶۔ قبلہ حاجات! قطعے میں جو حضرت نے الہام درج کیا ہے وہ تو ایک لطیفہ بہ سبیلِ دعا ہے۔
(اردوے معلیٰ، ص ۲۸۶۔ عود اول و عود دوم، ص ۱۲۳) ۳۱ جنوری ۱۸۵۹ء

۷۔ حضور! پہلے خدا کا شکر، پھر آپ کا شکر بجالاتا ہوں کہ آپ نے خط لکھا۔
(اردوے معلیٰ، ص ۲۸۲۔ عود اول و عود دوم، ص ۱۳۵) اواخر مارچ ۱۸۶۰ء

۸۔ حضرت پیر و مرشد! اس سے آگے آپ کو لکھ چکا ہوں کہ منشی ممتاز علی خاں سے

میری ملاقات ہے۔

(عود اول و عود دوم، ص ۱۳۸) ۱۸۶۲ء

۹۔ بندہ پرور! اگر ایک بندۂ قدیم کہ عمر بھر فرماں پذیر رہا ہو۔

(عود اول و عود دوم ص ۱۲۷) ۱۸۶۲ء

۱۰۔ قبلہ! کل خط آیا، آج جواب لکھتا ہوں۔

(عود اول و عود دوم، ص ۱۳۰) ۱۸۶۲ء

۱۱۔ قبلہ! آج تیسرا دن ہے کہ میں "بنا بہ آب رسیدن" و "بہ آب رساندن" کی حقیقت۔

(عود اول و عود دوم، ص ۱۳۲) ۱۸۶۲ء

۱۲۔ قبلہ! دیکھیے ہم عارف ہیں۔

(عود اول و عود دوم، ص ۱۳۳) ۱۸۶۲ء

۱۳۔ پیر و مرشد! "سہل ممتنع" میں کسرۂ لام توصیفی ہے۔

(عود اول و عود دوم، ص ۱۴۰) ۱۸۶۲ء

۱۴۔ در نومیدی بسے امید است

(اردوے معلّیٰ، ص ۲۸۰۔ عود اول و عود دوم، ص ۱۳۶) اواخر مارچ ۱۸۶۳ء

۱۵۔ جناب عالی! کل میرے شفیقِ مکرم، منشی نواب جان کلبۂ احزاں میں تشریف لائے۔

(عود اول و عود دوم، ص ۱۳۵) ۱۸۶۳ء

۱۶۔ جناب عالی! ایک شعر استاد کا مدت سے تحویلِ حافظہ چلا آتا ہے۔

(عود اول و عود دوم، ص ۱۲۴) ۷ مارچ ۱۸۶۴ء

۱۷۔ قبلہ! میرا ایک شعر ہے۔

(اردوے معلّیٰ، ص ۲۸۵۔ عود اول و عود دوم، ص ۱۲۸) اکتوبر، نومبر ۱۸۶۴ء

۱۸۔ میں سادہ دل آزردگی یار سے خوش ہوں۔

(اردوے معلّیٰ ص ۲۸۸۔ عود اول و عود دوم، ص ۱۲۸) اکتوبر، نومبر ۱۸۶۴ء

۱۹۔ پیرو مرشد! کوئی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہیں کلکتہ میں۔
(عودہ اول و عود دوم، ص ۱۲۵) ۱۸۶۴ء

۲۰۔ قبلہ! آپ کا خط پہلا آیا اور میں اس کا جواب لکھنا بھول گیا۔
(اردوئے معلیٰ ص ۲۸۰، عود اوّل و عود دوم، ص ۱۷۱) ۷ جولائی ۱۸۶۵ء

۲۱۔ بندۂ گنہگار شرمسار عرض کرتا ہے۔
اردوئے معلیٰ ص ۲۷۹ عود اول و عود دوم، ص ۱۷۵) ۱۰ جنوری ۱۸۶۶ء

۲۲۔ مولانا! بندگی۔ آج صبح کے وقت شوقِ دیدار میں بے اختیار۔
(اردوئے معلیٰ، ص ۲۷۸۔ عود اول و عود دوم، ص ۱۷۸) جنوری ۱۸۶۶ء

۲۳۔ قبلہ! آپ بے شک ولی صاحب کرامت ہیں۔
(عود اول و عود دوم ص ۱۷۴) ۲۳ جولائی ۱۸۶۶ء

۲۴۔ قبلہ! پیری وصد عیب۔ ساتویں دہا کے مہینے گن رہا ہوں۔
(اردوئے معلیٰ، ص ۲۷۹۔ عود اول و عود دوم، ص ۱۷۶) ۱۸۶۶ء

۲۵۔ قبلہ! میں نہیں جانتا کہ ان روزوں میں بہ قولِ ہندی اختر شناسوں کے۔
اردوئے معلیٰ، ص ۲۸۴۔ عود اول و عود دوم، ص ۱۲۹)

ذوالفقار الدین حیدر خاں، عرف حسین مرزا

۱۔ جناب نواب صاحب! شکوہ کرنا سہل ہے۔
(اصل خط) ۱۸ جون ۱۸۵۹ء

۲۔ یا حسین ابن حیدر، روحی فداک۔
(اصل خط) ۲۸ جولائی ۱۸۵۹ء

۳۔ بھائی! تمھارے خطوں کا اور یوسف مرزا کے خطوں کا جواب بھیج چکا ہوں۔
(اردوئے معلیٰ، ص ۳۲۳) ۲۹ اکتوبر ۱۸۵۹ء

۴۔ جنابِ عالی! کل آپ کا خط لکھا ہوا سہ شنبہ یکم نومبر کا پہنچا۔

(اردوے معلّٰی، ص ۳۲۵) ۹ نومبر ۱۸۵۹ء

۵۔ نواب صاحب! آج تیسرا دن ہے کہ تم کو حال لکھ چکا ہوں۔

(اردوے معلّٰی، ص ۳۲۴) ۱۶ دسمبر ۱۸۵۹ء

۶۔ نواب صاحب! پرسوں صبح کو تمہارا خط پہنچا۔

(اردوے معلّٰی، ص ۳۲۷) ۳۱ دسمبر ۱۸۵۹ء

نواب امین الدین احمد خاں

۱۔ اخِ مکرم کے خدام کرام کی خدمت میں سلامِ مسنون ملتمس ہوں۔

(اردوے معلّٰی، ص ۳۹۲) ۲۳ جون ۱۸۶۴ء

۲۔ برادر صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان! سلامت۔

(اردوے معلّٰی، ص ۳۸۹) ۲۶ مئی ۱۸۶۵ء

۳۔ جمیل المناقب عمیم الاحسان، سلامت۔ بعد سلام مسنون و دعاے بقاے دولت روز افزوں عرض کیا جاتا ہے کہ اُستاد میر جان آئے۔

(اردوے معلّٰی، ص ۳۹۰) ۲۲ جون ۱۸۶۵ء

۴۔ برادر صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان! سلامت۔ بعد سلام مسنون و دعاے بقاے دولت روز افزوں عرض کیا جاتا ہے کہ عطوفت نامے کی رو سے فارسی دو غزلوں کی رسید معلوم ہوئی۔

(اردوے معلّٰی، ص ۳۸۸) ۲۶ جولائی ۱۸۶۵ء

۵۔ بھائی صاحب! آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں۔

(اردوے معلّٰی، ص ۳۹۲) ۱۵ نومبر ۱۸۶۶ء

۶۔ اے میری جان! کس وقت میں مجھ سے غزل مانگی۔
(نقوش، لاہور، مکاتیب نمبر، ص ۱۰۶) ۳ مارچ ۱۸۶۷ء

۷۔ بھائی صاحب! ساٹھ ساٹھ برس سے ہمارے تمھارے بزرگوں میں قرابتیں بہم پہنچیں۔
(اردوئے معلّٰی، ص ۳۸۷)

۸۔ بھائی سے دو سوال ہیں۔
(اصل خط)

مرزا شہاب الدّین ثاقبؔ

۱۔ بھائی! تمھارا خط حکیم محمود خاں صاحب کے آدمی کے ہاتھ پہنچا۔
(اردوئے معلّٰی، ص ۲۹۰) ۸ فروری ۱۸۵۸ء

۲۔ بھائی شہاب الدین خاں، واسطے خدا کے یہ تم نے اور حکیم نجف خاں نے میرے دیوان کا کیا حال کر دیا ہے۔
(اردوئے معلّٰی، ص ۲۹۰) مارچ ۱۸۵۸ء

۳۔ بھائی! تمھارا خط پہنچا۔ کوئی مطلب جواب طلب نہیں تھا۔
(اردوئے معلّٰی، ص ۲۹۱) ۱۲ اپریل ۱۸۵۸ء

۴۔ نورِ چشم شہاب الدین خاں کو دعا کے بعد معلوم ہو۔
(اردوئے معلّٰی، ص ۲۹۳) ۲۴ ستمبر ۱۸۶۱ء

۵۔ میاں ثاقبؔ صاحب۔ کہاں پارسل بناتا پھروں۔ کیا ڈاک میں بھجواتا پھروں۔
(اصل خط)

۶۔ تمھارے بھائی کا خط تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔
(اردوئے معلّٰی، ص ۲۹۴)

۷۔ میاں مرزا شہاب الدین خاں اچھی طرح رہو۔
(اردوے معلّٰی، ص ۲۹۲) ۸ اکتوبر ۱۸۶۵ء

۸۔ میاں! وہ قاضی تو مسخرہ چڑ تیا ہے۔ ان کا خط دیکھ لیا۔
(اردوے معلّٰی، ص ۲۹۳) ستمبر ۱۸۶۶ء

۹۔ رقعے کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے؟
(اردوے معلّٰی، ص ۲۹۵)

۱۰۔ اے روشنی دیدہ، شہاب الدین خاں۔
(اردوے معلّٰی، ص ۲۹۵)

مرزا حاتم علی بیگ مہؔر

۱۔ بہت سہی غمِ گیتی۔ شراب کیا کم ہے!
(اردوے معلّٰی، ص ۲۴۸۔ عود اول و عود دوم، ص ۱۰۰) اوائل جولائی ۱۸۵۸ء

۲۔ خود شکوہ دلیل رفع آزار بس است
(اردوے معلّٰی، ص ۲۶۴۔ عود اول و عود دوم، ۱۰۴)

۳۔ بھائی صاحب! از روے تحریر مرزا تفتہؔ، آپ کا چھپے کتابوں کی طرف متوجّہ ہونا معلوم ہوا۔
(اردوے معلّٰی، ص ۲۴۹۔ عود اول و عود دوم، ص ۱۰۳) ۲۰ ستمبر ۱۸۵۸ء

۴۔ مرا بہ سادہ دلیہاے من تواں بخشید
(اردوے معلّٰی، ص ۲۵۵۔ عود اول و عود دوم، ص ۱۰۳) ۲۱ ستمبر ۱۸۵۸ء

۵۔ بھائی صاحب! خدا تم کو دولت و اقبال روز افزوں عطا کرے۔
(عود اول و عود دوم، ص ۱۰۵) ۲۹ ستمبر ۱۸۵۸ء

۶۔ بندہ پرور! آپ کا مہربانی نامہ آیا۔
(اردوے معلی، ص ۲۵۶، عود اول وعود دوم ص ۱۰۲) ستمبر ۱۸۵۸ء

۷۔ بھائی صاحب! آپ کے خامۂ مشکبار کی صریر نے کتابوں کی لوح طلائی کا آوازہ یہاں تک پہنچایا۔
(اردوے معلی، ص ۲۶۰۔ عود اول وعود دوم، ص ۱۰۶) اکتوبر ۱۸۵۸ء

۸۔ بھائی صاحب! مطبع میں سے سادہ کتابیں یقین ہے کہ آج کل پہنچ جائیں۔
(اردوے معلی، ص ۲۶۱، عود اول وعود دوم، ص ۱۰۹) اکتوبر ۱۸۵۸ء

۹۔ مرزا صاحب! میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔
(اردوے معلی، ص ۲۵۸۔ عود اول وعود دوم، ص ۱۰۷) اوائل نومبر ۱۸۵۸ء

۱۰۔ تینتیس کتابیں بھیجی ہوئی برخوردار منشی شیو نرائن کی۔
(اردوے معلی، ص ۱۲۳) ۱۳ نومبر ۱۸۵۸ء

۱۱۔ بھائی جان! کل جو جمعہ روز مبارک وسعید تھا، گویا میرے حق میں روزِ عید تھا۔
(اردوے معلی، ص ۲۶۷۔ عود اول وعود دوم ص ۱۰۹) ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء

۱۲۔ بندہ پرور! آپ کا خط کل پہنچا، آج جواب لکھتا ہوں۔
(اردوے معلی، ص ۲۶۸۔ عود اول وعود دوم، ص ۱۱۰) نومبر ۱۸۵۸ء

۱۳۔ خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ آپ کو اپنی طرف متوجہ پاتا ہوں۔
(اردوے معلی، ص ۲۶۵۔ عود اول وعود دوم، ص ۱۱۲) ۲۰ دسمبر ۱۸۵۸ء

۱۴۔ بھائی صاحب! تمھارا خط اور قصیدہ پہنچا۔
(اردوے معلی، ص ۲۶۴۔ عود اول وعود دوم ص ۱۱۳) اپریل ۱۸۵۹ء

۱۵۔ ع شرطِ اسلام بود ورزشِ ایمان بالغیب۔

(اردوے معلیٰ ص ۲۵۲۔ عود اول وعود دوم، ص ۱۱۴) مارچ، اپریل ۱۸۵۹ء

۱۶۔ جناب مرزا صاحب! دلّی کا حال تو یہ ہے۔

(اردوے معلیٰ، ص ۲۷۰۔ عود اول وعود دوم، ص ۱۳۴) اپریل ۱۸۵۹ء

۱۷۔ مرزا صاحب! ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔

(اردوے معلیٰ، ص ۲۵۴۔ عود اول وعود دوم، ص ۱۱۶) جون ۱۸۶۰ء

۱۸۔ جناب مرزا صاحب! آپ کا غم فزا نامہ پہنچا، میں نے پڑھا۔

(اردوے معلیٰ، ص ۲۵۱۔ عود اول وعود دوم، ص ۱۱۶) جون ۱۸۶۰ء

۱۹۔ صاحب میرے! عہدۂ وکالت مبارک ہو۔

(اردوے معلیٰ، ص ۲۵۰۔ عود اول وعود دوم، ص ۱۱۷) ۱۸۶۱ء

محمد نعیم الحق آزاد

۱۔ پیر و مرشد کیا حکم ہوتا ہے۔

(اصل خط) ۹ مارچ ۱۸۵۹ء

۲۔ بندہ پرور! آج میں نے وہ انگریزی عرضی روانہ کر دی۔ اور صبح کو کہار مسودہ اور میرے محسن کا رقعہ آپ کے نام کا مجھ کو دے گیا۔

(نقوش خطوط نمبر جلد ۱ ص ۴۲۱)

فرقانی میرٹھی

۱۔ فخر گرگانی نے لکھا ہے۔

(اصل خط) ۱۸۶۶ء

مولانا عبّاس رفعت

۱۔ حضرت قصیدۂ عربی کا کیا کہنا۔ ۲ اگست ۱۸۶۱ء
(اصل خط)

۲۔ صاحب میرے، کرم فرما میرے، قدر دان میرے۔ ۴ نومبر ۱۸۶۱ء
(اصل خط)

محمود مرزا

۱۔ برخوردار، اقبال نشان محمود مرزا کو دعا پہنچے۔ ۱۳ مئی ۱۸۶۳ء
(اصل خط)

عبدالحق

۱۔ جناب عالی! یہ خط فتح پور سے آپ کے نام کا آیا ہے۔ مئی۔ مارچ ۱۸۵۲ء
(اصل خط)

حکیم محب علی

۱۔ بندہ پرور! آپ کی تحریر سے مستنبط ہوتا ہے۔
(اصل خط)

مولوی ضیاء الدین خاں ضیا

۱۔ بہ خدمت مولوی صاحب معظم، مسلم علمائے عرب و عجم۔ ۱۸۶۴ء
(اصل خط)

۲۔ مولوی صاحب، جمیل المناقب، مولوی ضیاالدین خاں صاحب کی خدمت میں بعد سلام عرض کیا جاتا ہے۔

(معارف اعظم گڑھ، مارچ ۱۹۲۷ء) — اوائل جنوری ۱۸۶۶ء

۳۔ جناب مولوی صاحب! کرم از شما و کمی از ما۔

(اصل خط) — ۲۷ فروری ۱۸۶۶ء

مہاراجا سردار سنگھ والیِ بیکانیر

۱۔ بحضور وافر السرور، جناب سری مہاراجا صاحب، والا مناقب، عالی شان، قلزم فیض احسان، دام اقبالہ و زاد افضالہ۔

(اصل خط) — ۵ جنوری ۱۸۵۹ء

شہزادہ بشیر الدین

۱۔ تم سلامت رہو ہزار برس۔

(اردوئے معلّیٰ، ص ۱۲۶) — ۱۶ جون ۱۸۶۷ء

۲۔ در پرستش ستم و در کا مجوئی استوار

(اردوے معلّیٰ، ص ۱۲۵) — ۱۱ اپریل ۱۸۶۸ء

۳۔ پیرو مرشد سلامت۔ اعضا افسردہ اور بودے ہو گئے۔

(اردوے معلّیٰ، مجتبائی، حصہ ۲، ص ۵۱)

۴۔ حضرت پیرو مرشد برحق، سلامت۔ تقصیر معاف۔

(اردوے معلّیٰ، ص ۱۲۵)

حکیم غلام مرتضیٰ خاں

۱۔ خان صاحب جمیل المناقب حکیم غلام مرتضیٰ خاں صاحب کو غالبِ دردمند کا سلام۔
(اردوے معلیٰ، ص ۴۵۲) ۱۲ مارچ ۱۸۶۵ء

مرزا باقر علی خاں کامل

۱۔ اقبال نشان باقر علی خاں کو غالبِ نیم جان کی دعا پہنچے۔
(اردوے معلیٰ ص ۳۲۲) ۱۶ نومبر ۱۸۶۷ء

۲۔ نورِ چشم و راحتِ جاں مرزا باقر علی خاں کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔
(اردوے معلیٰ، ص ۳۲۲) ۷ دسمبر ۱۸۶۷ء

۳۔ اقبال نشان مرزا باقر علی خاں کو غالبِ نیم جاں کی دعا پہنچے۔
(اردوے معلیٰ، ص ۳۲۱) ۱۸۶۷ء

میر احمد حسین میکش

۱۔ بھائی میکش! آفریں، ہزار آفریں، تاریخ نے مزا دیا۔
(اردوے معلیٰ، ص ۴۵۱)

۲۔ میاں عجیب اتفاق ہے۔
(اردوے معلیٰ، ص ۴۵۲)

میر سرفراز حسین

۱۔ میری جان کے چین، مجتہد العصر میر سرفراز حسین۔
(اردوے معلیٰ، ص ۱۵۱) ۲۷ مارچ ۱۸۶۳ء

۲۔ نورِ چشم راحتِ جاں میر سرفراز حسین جیتے رہو۔
(اردوے معلیٰ، ص ۱۵۲۔ عود اول و عود دوم، ص ۷۰)

مرزا عباس بیگ

۱ - بھائی مرزا عباس بہادر۔ میں حیران ہوں کہ تم سرکار کے کام کیوں کر۔
خیاباں، لکھنؤ، نومبر ۱۹۳۳ء) ۱۲ مئی ۱۸۶۳ء

نواب یوسف مرزا

۱ - کوئی ہے؟ ذرا یوسف مرزا کو بلائیو۔ لو صاحب وہ آئے۔
(اردوے معلیٰ، ص ۳۳۰) اواخر اپریل ۱۸۵۶ء

۲ - اے میری جان اے میری آنکھیں۔
(اردوے معلیٰ، ص ۳۳۴) جون، جولائی ۱۸۵۳ء

۳ - میری جان، خدا تیرا نگہبان،
(اردوے معلیٰ، ص ۳۳۶) ۱۵ جولائی ۱۸۵۹ء

۴ - میاں! پرسوں قریب شام میاں مرزا آغا جانی صاحب آئے۔
(اردوے معلیٰ، ص ۳۳۷) ۲۸ جولائی ۱۸۵۹ء

۵ - حق تعالیٰ تمھیں عمر و دولت و اقبال و عزت دے۔
اردوے معلیٰ، ص ۳۳۹) ۱۸ اگست ۱۸۵۹ء

۶ - میری جان! شکوہ کرنا سیکھو۔
(اردوے معلیٰ، ص ۳۴۱) ۵ نومبر ۱۸۵۹ء

۷ - یوسف مرزا! میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔
(اردوے معلیٰ، ص ۳۴۲) ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء

۸ - میاں! کل صبح کو تمھارے نام کا خط روانہ کیا۔
(اردوے معلیٰ، ص ۳۴۶) ۲۹ نومبر ۱۸۵۹ء

۹ - میاں! تمھارا خط رام پور پہنچا اور رام پور سے دلّی آیا۔
(اردوے معلیٰ، ص ۳۴۸) ۲ اپریل ۱۸۶۰ء

۱۰۔ آؤ صاحب، میرے پاس بیٹھ جاؤ۔
اردوے معلیٰ، ص ۳۳۰) 29 اپریل ۱۸۶۰ء

۱۱۔ یوسف مرزا کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ تمھارا خط کل منگل کو پہنچا۔
(اردوے معلیٰ، ص ۳۳۱) ۹ مئی ۱۸۶۰ء

۱۲۔ یوسف مرزا! کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا۔
(اردوے معلیٰ، ص ۳۳۲) ۱۹ مئی ۱۸۶۰ء

مولوی احمد حسن قنوجی

۱۔ یارب یہ ایک خط مجھ کو بڑودے، گجرات سے آیا ہے۔
(اردوے معلیٰ، ص ۲۳۸) ۱۸۶۰ء

۲۔ مخدوم و مکرم مولوی سید احمد حسن خاں صاحب یاد رکریں۔
(اردوے معلیٰ، ص ۲۳۹) ۲۱ ستمبر ۱۸۶۰ء

مرزا شمشاد علی بیگ خاں رضوان

۱۔ فرزندِ دلبند شمشاد علی بیگ خاں کو اگر خفا نہ ہوں تو دعا۔
(اردوے معلیٰ، ص ۳۱۹) ۴ نومبر ۱۸۶۵ء

۲۔ مرزا! رسمِ تحریرِ خطوط بہ سببِ ضعف ترک ہوتی جاتی ہے۔
(اردوے معلیٰ، ص ۳۲۱) اگست ۱۸۶۶ء

منشی کیول رام ہشیار

۱۔ غالبِ خاکسار کہتا ہے۔
(اردوے معلیٰ، مجتبائی، حصہ ۲، ص ص ۵۵-۵۴)

میر افضل علی عرف میرن صاحب

۱۔ سعادت واقبال نشان، میر افضل علی صاحب المعروف بہ میرن صاحب! خدا تم کو سلامت رکھے۔

(اردوے معلّیٰ، ص ۳۱۶) ۹ نومبر ۱۸۵۸ء

۲۔ برخوردار کامگار میر افضل علی عرف میرن صاحب طال عمرہ۔

(اردوے معلّیٰ، ص ۳۱۷) ۶ جولائی ۱۸۵۹ء

۳۔ میری جان! تمھارا رقعہ پہنچا۔

(اردوے معلّیٰ، ص ۳۱۸) ۲۱ جولائی ۱۸۶۴ء

منشی ہیرا سنگھ

۱۔ نورِ چشم غالبِ غم دیدہ، منشی ہیرا سنگھ کو دعا پہنچے۔

(اردوے معلّیٰ، ص ۴۵۶) ۱۴ جنوری ۱۸۶۸ء

۲۔ فرزندِ دلبند، سعادت مند، منشی ہیرا سنگھ کے حق میں میری دعائیں قبول ہوں۔

(اردوے معلّیٰ، مجتبائی حصہ ۲، ص ۶۲)

ماسٹر پیارے لال آشوب

۱۔ جنابِ بابو صاحب، جمیل المناقب، عمیم الاحسان، سلامت۔

(انشاے اردو، کریم الدین پانی پتی، لاہور، ۱۸۷۲ء، ص ۴۰) اوائل اگست ۱۸۶۵ء

۲۔ شفیق مکرم، بابو پیارے لال صاحب کو سلام۔

(اردوے معلّیٰ، ص ۴۵۳) ۴ اپریل ۱۸۶۶ء

۳۔ فرزندِ ارجمند اقبال بلند، بابو ماسٹر پیارے لال کو غالبِ ناتوان نیم جاں کی دعا پہنچے۔

اردوے معلّیٰ، ص ۴۵۴ ۳۰ جنوری ۱۸۶۸ء

۴۔ یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز۔
(اردوے معلّی، مجتبائی، حصہ ۲، ص ۴۱)

۵۔ کیوں صاحب، ہم سے ایسے خفا ہو گئے۔
(اردوے معلّٰی، ص ۴۵۴)

زکریا خاں زکیؔ دہلوی

بندہ پرور! آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔
(نقوش، مکاتیب نمبر جلد ۱) ۲۹ جنوری ۱۸۶۸ء

یوسف علی خاں عزیزؔ

۱۔ بھائی! تم کیا فرماتے ہو، جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو؟
(اردوے معلّٰی، ص ۲۰۶ عود اول و عود دوم ص ۶۵) ۱۸۵۹ء

۲۔ میاں! کل زین العابدین فوقؔ کا خط، مع اشعار کے ٹکٹ دار لفافہ کے اندر رکھ کر بسبیلِ ڈاک بھجوایا ہے۔
(عود اول و عود دوم، ص ۶۵)

۳۔ سعادت و اقبال نشاں مرزا یوسف علی خاں کو بعد دعا کے دل نشیں ہو۔
(اردو، اورنگ آباد، جنوری ۱۹۳۲ء ص ۷۰)

منشی غلام بسم اللہ

۱۔ منشی صاحب شفیقِ مکرم، مظہرِ لطف و کرم منشی غلام بسم اللہ صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ
(عود اول و عود دوم، ص ۱۸۵)

میر بندہ علی خاں

۱۔ میر صاحب شفیقِ مکرم و معظّم میر بندہ علی خاں۔
(اصل خط) ۱۸ جنوری ۱۸۶۴ء

محمد حسن صدر الصدور

۱۔ قبلہ آپ سے رخصت ہو کر بھیگتا بھاگتا الخ — ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء

اورینٹل کالج میگزین، لاہور، فروری ۱۹۴۷ء

بنام نامعلوم

۱۔ حضرت میرا حال کیا پوچھتے ہو؟ — ۱۸۶۵ء

حیاتِ نو، سہ ماہی، پانی پت، اپریل ۱۹۳۴ء

بنام نامعلوم

۱۔ میاں! وہ عرضی کا کاغذ، افشاں کیا ہوا، الخ

خطوطِ غالب مرتبہ مہیش پرشاد

سید سجاد مرزا

۱۔ قرۃ العین سجاد ابن حسین سلمہ اللہ تعالیٰ۔ — ۱۵ مارچ ۱۸۶۵ء

۲۔ زبدۂ آلِ رسول سجاد مرزا خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا — دسمبر ۱۸۶۵ء

(اصل خط)

جناب مصطفٰے خاں شیفتہ

۱۔ جناب بھائی صاحب وقبلہ — ۷ فروری ۱۸۶۵ء

عود اول و عود دوم، ص ۳۱

حکیم ظہیر الدین احمد خاں

۱۔ اقبال نشان حکیم ظہیر الدین احمد خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے

(اردوے معلّیٰ، ص ۲۳۳) — ۲ نومبر ۱۸۶۵ء

۲۔ لو میاں ظہیر الدین ہم نے مسودہ لکھ کر بھیج دیا ہے۔ (فروغِ اردو، لکھنؤ ۱۹۶۸ء)

مرزا قربان علی بیگ خاں سالک

۱۔ والرحمٰن الطاف خفیہ۔ خیر و عافیت تمہاری معلوم ہوئی۔

(اردوے معلّیٰ، ص ۳۱۸) — ۱۱ جولائی ۱۸۶۴ء

۲۔ میری جان، کن اوہام میں گرفتار ہے۔
(اردوے معلیٰ، ص ۳۱۹)

محمد زکریا خاں زکؔی

۱۔ بندہ پرور! آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔
(نقوش، مکاتیب نمبر، جلد ۱، ص ۱۰۶)

مردان علی خاں رعنؔا

۱۔ خاں صاحب شفیقِ عالی شان کو میرا سلام پہنچے۔
(اردوے معلیٰ ص ۲۱۳۔ عود اول و عود دوم، ص ۱۴۱) دسمبر ۱۸۶۳ء

۲۔ خاں صاحب عالی شان مردان علی خاں صاحب کو فقیر غالبؔ کا سلام
(اردوے معلیٰ ص ۲۱۳۔ عود اول و عود دوم، ص ۱۴۱) ۱۸۶۳ء

نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرّ رخشاںؔ

۱۔ جناب قبلہ و کعبہ! آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے؟
(اردوے معلیٰ، ص ۲۸۹) ۱۸۶۲ء

میناؔ مرزا پوری

۱۔ بندہ پرور! کل دوپہر کو آپ کے عنایت نامے کے ساتھ جناب احگر کا مہرنامہ مع غزل پہنچا۔
(مرقع ادب، حصہ ۱، ص ۲۰) ۱۸۶۶ء

جانِ غالب! کل تمھاری دونوں غزلیں بعد اصلاح ٹکٹ دار لفافے کے اندر رکھ کر بھجوادی ہیں۔

(مرقع ادب، حصہ ۱، ص ۱۹) ۱۳ جولائی ۱۸۶۷ء

شیخ لطیف احمد بلگرامی

۱۔ میاں لطیف! مزاج شریف؟ غالبِ گوشہ نشیں کی دعا۔

(اردوے معلیٰ، علیگڑھ، دسمبر ۱۹۰۷ء - اردوے معلیٰ، مکمل، مبارک علی، لاہور، ۱۹۳۰ء، ص ۴۱۹)

بابو ہرگوبند سہائے نشاط

۱۔ برخوردار! بہت دن ہوئے میں نے تم کو خط لکھا ہے۔

(اردوے معلیٰ، ص ۳۸۶) ۲۹ دسمبر ۱۸۵۸ء

۲۔ صاحب! تم کو دعا کہتا ہوں اور دعا بھی دیتا ہوں۔

(اردوے معلیٰ، ص ۳۸۶) جنوری ۱۸۵۸ء

عبدالرزاق شاکر

۱۔ مخدومِ مکرم مظہرِ لطف و کرم، جناب مولوی محمد عبدالرزاق صاحب، اشرف الوکلا کو درویشِ گوشہ نشیں، غالبِ حزیں کا سلام

(عود اول و عود دوم، ص ۱۵۵) قبل ۱۸۶۵ء

۲۔ قبلہ و کعبہ! فقیر پا در رکاب ہے۔

(اردوے معلیٰ، ص ۲۱۶ - عود اول و عود دوم ص ۱۶۰)

۳۔ قبلہ! پہلے معنی ابیاتِ بے معنی سنیے۔

(عود اول و عود دوم ص ۱۶۰) اکتوبر دسمبر ۱۸۶۵ء

۴۔ حضرت! تین دوستوں نے مولفِ محرق پر جس کا نام "صاحبِ تیغِ محرق" رکھا گیا ہے۔
(عودِ اول و عودِ دوم، ص ۱۵۷) ۱۸۶۵ء

۵۔ قبلہ! یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا۔
(عودِ اول و عودِ دوم، ص ۱۶۲) جنوری ۱۸۶۶ء

۶۔ قبلہ! اس عنایت نامے کا، جو مارچ گذشتہ میں پایا ہے۔
(عودِ اول و عودِ دوم، ص ۱۷۸) یکم اپریل ۱۸۶۶ء

۷۔ جنابِ مولوی صاحب! مخدوم مولوی محمد عبدالرزاق صاحب شاکر کی خدمت میں بعد سلام یہ التماس ہے۔
(اردوئے معلیٰ، ص ۲۱۴۔ عودِ اول و عودِ دوم، ص ۱۵۶)

۸۔ حضرت! مطالبِ علمی و شعری کا لکھنا موقوف سوال پر ہے۔
(عودِ اول و عودِ دوم، ص ۱۵۷)

۹۔ پیر و مرشد! اِک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے۔
(عودِ اول و عودِ دوم، ص ۱۵۸)

۱۰۔ فقیر اسد اللہ اس کاغذ کے لفافے پر مرسلۂ محمد عبدالرزاق جعفری الحیدری اور ٹکٹ پر شاکر دیکھ کر الخ
(عودِ اول و عودِ دوم، ص ۱۵۸)

حواشی

ص ۴۹۱-۱ اردوے معلّٰی "جماد الثانی" ص ۴۹۲-۱ اردوے معلّٰی "برس"

ص ۴۹۳

۱۔ اردوے معلّٰی میں تاریخِ تحریر چہارشنبہ، ہفتم رمضان، ہشتم مارچ ہے۔ غالباً پہلی بار ڈاکٹر معبد الستار صدیقی نے اس طرف توجہ دلائی تھی کہ ان تاریخوں میں مطابقت نہیں ہے۔ مولوی غلام رسول مہر کے خیال سے یہ تاریخ "ہفتم رمضان ۱۲۷۵ھ مطابق ہشتم اپریل ۱۸۵۹ء" ہے۔ مرتضیٰ حسین فاضل اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ تاریخ ہفتم رمضان ۱۲۷۷ھ مطابق بیستم مارچ ۱۸۶۱ء" ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تاریخ ۷ رمضان ۱۲۷۵ھ مطابق ۲۱ اپریل ۱۸۵۸ء ہے۔ تاریخ لکھنے میں کچھ غالب سے سہو ہوا اور کچھ کاتب سے۔

۲۔ عود اول و دوم "جایے"۔ ۳۔ عود اول و دوم "خط فارسی"

ص ۴۹۴

۱۔ عود اول و عود دوم "پس" بجائے "بس"، "صاحب" ندارد۔

۲۔ عود اول و عود دوم "افراز" ۳۔ عود اول و عود دوم "میر خیرات علی"

۴۔ اس خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ مولوی مہیش نے مئی ۱۸۵۸ء قرار دی ہے۔ سنہ تو صحیح ہے لیکن مہینا درست نہیں۔ غالب نے اس خط میں لکھا ہے کہ "اگر اس خط کے پہنچتے ہی چل دیں تو عید بھی یہیں کریں"۔ اس کا مطلب ہے کہ عید میں کم سے کم سات آٹھ دن باقی ہیں۔ اس سال یکم رمضان کو چار اپریل تھی۔ اس لیے یہ خط اپریل ۱۸۵۸ء میں لکھا گیا ہوگا۔ ۵۔ عود اول "تمہار"

۶۔ عود اول و دوم "ہم عرف" اردوے معلّٰی "ہم" ندارد۔

۷۔ اردوے معلّٰی "بنے"

ص ۴۹۵

۱۔ "تحریرِ فارسی" سے مراد "دستنبو" ہے۔

۲۔ عود اول و دوم "یہ بھی" اردوے معلّیٰ "بھی یہی"

۳۔ عود اول و دوم "افراز"

۴۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے "دستنبو" کا ذکر کیا ہے۔ جو یکم اگست ۱۸۵۸ء کو مکمل ہوئی تھی۔ خود غالب نے خط میں لکھا ہے کہ "کل ہفتے کا دن، ساتویں اگست کی" جس کا مطلب ہے کہ زیر بحث خط یکشنبہ ۸ اگست ۱۸۵۸ء کو لکھا گیا۔

۵۔ "اردوے معلّیٰ مجتبائی" میں یہاں تک کی عبارت شامل نہیں ہے۔ "انتخاب میں ہے" اردوے معلّیٰ مجتبائی میں یہ خط اس طرح شروع ہوتا ہے: "بھائی کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں"۔ یہ فقرہ "انتخاب" میں نہیں ہے۔ "اردوے معلّیٰ مجتبائی" میں یہ خط شامل کرتے ہوئے پہلا پیراگراف نکال دیا گیا اور "بھائی کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں" کا اضافہ کر دیا گیا۔

۶۔ انتخاب "جس"

۷۔ انتخاب "لیں" ۸۔ اردوے معلّیٰ مجتبائی "بھائی" ندارد۔ ۹۔ اردوے معلّیٰ مجتبائی "تم کو" ندارد۔

ص ۴۹۶

۱۔ انتخاب "اس شین" "شین" زائد۔ اردوے معلّیٰ مجتبائی "اس"۔

۲۔ انتخاب "ہونا" ندارد۔ اردوے معلّیٰ مجتبائی "ہونا چاہیے۔"

۳۔ انتخاب "میں سے"، "میں" زائد۔ اردوے معلّیٰ مجتبائی "سے"۔

۴۔ انتخاب "ہے" ندارد۔

۵۔ "انتخاب" میں "زیادہ زیادہ" لکھ کر خط ختم کر دیا گیا ہے۔ "اردوے معلّیٰ مجتبائی" میں اس کے بعد ایک پیراگراف اور ہے۔

۶۔ خط پہ تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے حکیم میر اشرف علی کے بیٹے کا تاریخی نام "میر کاظم دین" تجویز کیا ہے، جس سے ۱۲۷۵ھ برآمد ہوتا ہے۔ غالب نے اس خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ "یہ امر بعد محرم واقع ہوگا" اس کا مطلب ہے کہ یہ خط محرم ۱۲۷۵ھ مطابق اگست ۱۸۵۸ء میں لکھا گیا ہے۔ مولوی مہیش

نے اس خط کی تاریخِ تحریر جولائی ۱۸۵۹ء لکھی ہے، جو درست نہیں۔

ص ۴۹۷

۱۔ اردوے معلّیٰ "دکھا"۔

۲۔ اردوے معلّیٰ میں تاریخِ تحریر " پنجشنبہ ۷ ستمبر ۱۸۵۸ء ہے۔ تقویم کی رو سے " ۷ ستمبر" کو سہ شنبہ ہے۔ مولوی مہیش نے تاریخ بدل کر "۹ ستمبر" کردی اور اس تبدیلی کی کوئی اطلاع نہیں دی۔ میرے خیال سے غالب یا کاتب نے دن اور تاریخ تو صحیح لکھے لیکن مہینا لکھنے میں سہو ہوا۔ یہ مہینا ستمبر نہیں اکتوبر ہے۔

۳۔ عودِ دوم "ہے بھی" ۴۔ عودِ اول و دوم " ازراز۔"

۵۔ عودِ اول و دوم "قصد"۔

۶۔ غالباً یہ ہی وہ واقعہ ہے، جس کا ذکر غالب نے مجروح کے نام اگست ۱۸۵۸ء کے خط میں کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی افسر اور غالباً انگریز افسر سرفراز حسین کے خلاف ہوگیا تھا۔ اس نے ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے سلسلے میں ان پر کوئی الزام عائد کیا ہوگا، میر سرفراز حسین نے ڈھائی سو روپے رشوت دے کر جان چھڑائی۔

۷۔ عودِ اول دوم "پس"۔

۸۔ عودِ اول "روی"۔

ص ۴۹۸

۱۔ عودِ اول و عودِ دوم "آئے۔"

۲۔ عودِ اول و عودِ دوم "کیا" ندارد۔

۳۔ اردوے معلّیٰ "چاہیے۔"

۴۔ اردوے معلّیٰ "سے" ندارد۔

۵۔ اردوے معلّیٰ "کرکے"۔

۶۔ "اردوے معلّیٰ" میں یہ خط یہیں ختم ہو جاتا ہے۔
"اردوے معلّیٰ" کے مرتبین نے غالباً کسی سیاسی مصلحت سے اس خط کی باقی عبارت حذف کر دی تھی۔
"عودِ اول" اور "عودِ دوم" میں یہ عبارت موجود ہے۔

۷۔ عود اول وعود دوم میں "بلنک" ہے، جبکہ اصل نام "بلیک" ہے۔

۸۔ بلیک جے پور کے پالیٹکل اجنٹ کرنل آلوس کے اسسٹنٹ تھے۔ ایک غلط فہمی کی وجہ سے جے پور کے عوام نے انہیں قتل کر دیا۔ اس واقعے کی تفصیل کے لیے "غالب کے خطوط" کی چوتھی جلد میں بلیک کے حالات ملاحظہ ہوں۔

۹۔ عود اول "ہوتا"۔

۱۰۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں "دستنبو" کی طباعت کا ذکر کیا ہے۔ "دستنبو" ۱۸۵۸ء میں چھپی ہے۔ غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "یقین ہے کہ اسی اکتوبر میں قصہ تمام ہو جائے"۔ اس لیے یہ خط اکتوبر ۱۸۵۸ء میں لکھا گیا۔

ص ۴۹۹

۱۔ عود اول ودوم "اقرار"۔

۲۔ اردوے معلی، عود اول وعود دوم "گئے تھے" "تھے" زائد۔

۳۔ اردوے معلی "اور" ندارد۔

۴۔ عود اول "محمد اعظیم" عود دوم "محمد عظیم"۔ اصل نام "محمد اعظم" ہے، جو "اردوے معلی" میں ہے۔

۵۔ اردوے معلی "تمھارے علاقے سے دعا" "اُن کو" اور "لکھتا ہوں" ندارد۔

۶۔ اردوے معلی "خدا کے واسطے"۔

۷۔ خط میں تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے اس خط میں کتابوں کی رسید اور پارسل وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ بظاہر "دستنبو" کا ذکر ہے۔ غالب کو "دستنبو" کی ۳۳ جلدیں ۱۲ نومبر ۱۸۵۸ء کو موصول ہوئی تھیں۔ (دیکھیے غالب کا خط بنام مرزا حاتم علی مہر مورخہ ۱۳ نومبر ۱۸۵۸ء) غالب نے اپنے دوستوں کو یہ کتابیں دو چار دن ہی میں بھیجی ہوں گی۔ اس لیے مجروح کے نام یہ خط نومبر ۱۸۵۸ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۵۰۰

۱۔ لال قلعے کی طرف چاندنی چوک کا وہ حصہ جو دریبے تک ہے اردو بازار کہلاتا تھا۔ پہلے چاندنی چوک میں نہر بہتی تھی۔ غالب کے اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب سے پہلے میر مہدی مجروح اسی علاقے میں رہتے تھے اور غالباً اسی علاقے میں اُن کے ذاتی مکان بھی تھے۔

۲۔ عود اول و عود دوم "کہتے"۔

۳۔ اردوئے معلیٰ، عود اول و عود دوم "ہے" زائد۔

۴۔ عود اول "محفل"۔

۵ عود اول و عود دوم "یہ کلکتے پہنچے" "یہ" زائد۔

۶۔ "اردوئے معلیٰ "چڑھائی"۔

۷۔ اردوئے معلیٰ "ارادی"۔

۸۔ اردوئے معلیٰ "لوگ" ندارد۔

۹۔ عود اول و عود دوم "اقراز"۔

۱۰۔ اردوئے معلیٰ "میرا شرف علی..... تو میں جانوں" ندارد۔

ص ۵۰۱

۱۔ عود اول و عود دوم "اقراز"۔

۲ عود اول و عود دوم "سکتے ہیں" "ہیں" زائد۔

۳۔ اردوئے معلیٰ "دکھاتا ہے"۔

۴۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں لکھا ہے: "مشہور ہے کہ جنوری شروع سال ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے.... خیر آج بدھ کا دن ۲۲ دسمبر کی ہے" اس کا مطلب ہے کہ یہ خط بدھ ۲۲ دسمبر ۱۸۵۸ء کو لکھا گیا۔

۵۔ عود دوم "جانگیر آباد"۔

۶۔ اردوئے معلیٰ "حکم کچھ" عود اول و دوم "کچھ حکم"۔

۷۔ عود اول و عود دوم "بہ مجرد اس خبر کے استماع کے"۔

۸۔ اردوئے معلیٰ "دن و" ندارد۔ عود اول "و" ندارد۔

۹۔ عود دوم "ہے" ندارد۔

۱۰۔ عود اول و عود دوم "نیا حکم"۔

ص ۵۰۲

۱۔ عود اول و عود دوم "یہاں"۔

۲۔ اردوے معلیٰ، عود اول اور عود دوم "میں کرنل برون" چھپا ہے۔ اصل نام "کرنل برن" ہے۔ ممکن ہے غالب نے خود "برون" لکھا ہو۔

۳۔ عود اول و عود دوم "ہے" ندارد۔

۴۔ اردوے معلیٰ "مکان وکان" عود اول و عود دوم "مکان و دکان"۔

۵۔ عود اول و عود دوم "ندسا نزدے" ندارد۔

۶۔ عود اول و عود دوم "بستی"۔

۷۔ عود دوم "کون سی" "سی" زائد۔

۸۔ عود اول و عود دوم "اقراز"۔

۹۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں لکھا ہے کہ: "آج بدھ دوم فروری ہے۔" خط میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی رہائی کا ذکر ہے۔ یہ واقعہ ۱۸۵۹ء کا ہے، اس لیے یہ خط بدھ ۲ فروری ۱۸۵۹ء کو لکھا گیا۔

ص ۵۰۳

۱ عود اول "مدد"۔

۲۔ عود اول و عود دوم "تو"۔

۳۔ عود اول و عود دوم "غلام حسین خاں۔"

۴۔ عود اول و عود دوم "کا" ندارد۔

۵۔ عود اول و عود دوم "مہینا" ندارد۔

۶ عود اول "تین ہزار تین سو" ندارد۔ عود دوم "تیئس سو"

۷۔ عود دوم "منا"۔

۸۔ عود اول و عود دوم "اقراز"۔

۹۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے اس خط میں لکھا ہے کہ: "یہ فروری ۱۸۵۹ء بائیسواں مہینا ہے۔"

ص ۵۰۴

۱۔ عود اول و عود دوم "نہ" ندارد۔

۲۔ عوداول وعوددوم "وہاں کی" "کی" زائد۔

۳۔ عوداول "صورت وہ"۔ عوددوم "صورت وہی"۔

۴۔ عوداول وعوددوم "ہوجائے گی"۔

ص ۵۰۵

۱۔ اردوے معلّٰی "کرکے"۔

۲۔ عوداول وعوددوم "افراز"۔

۳ عوداول وعوددوم "اور" ندارد۔

۴۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے اپنی پنشن کے بارے میں خط میں لکھا ہے کہ "بائیس مہینے کے بعد پرسوں کو توال کو حکم آیا ہے۔" پنشن مئی ۱۸۵۷ء میں بند ہوئی تھی۔ اِس لیے یہ خط فروری ۱۸۵۹ء میں لکھا گیا ہوگا۔ ۵۔ عود اول "ساند اس"۔

۶۔ اردوے معلّٰی "مسکلود" عوداول وعوددوم "مسکلود"۔

۷۔ اردوے معلّٰی "کرکے"۔

۸۔ اردوے معلّٰی "مسکلود"۔ عوداول وعوددوم "مسکلود"۔

ص ۵۰۶

۱۔ اردوے معلّٰی "التفات"۔ عوداول وعوددوم "استنباط" اور "اختلاط"۔

۲۔ اردوے معلّٰی "مسکلود"۔ عوداول وعوددوم "مسکلود"

۳۔ عوداول وعوددوم "کہ" ندارد۔

۴۔ عوداول وعوددوم "سے" بجائے "کو"۔

۵۔ عوددوم "گیا"۔

۶۔ عوداول وعوددوم "افراز"۔

۷۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں فروری اور مارچ ۱۸۵۹ء کے واقعات کی تفصیل بیان کی ہے، اِس لیے یہ خط مارچ ۱۸۵۹ء میں لکھا گیا ہوگا۔

۸۔ اردوے معلّٰی "کیا" ندارد۔

۹۔ اردوئے معلّٰی "و" ندارد"۔

۱۰۔ عود اول و عود دوم "کما حقہ"۔

۱۱۔ "سررشتے کی پابندی ضرور ہے۔" یہ عبارت صرف "الناظر" میں ہے۔

ص ۵۰۷

۱۔ الناظر "روپیے کے" "کے" ندارد۔

۲۔ الناظر "سو" ندارد۔

۳۔ اردوئے معلّٰی "فوراً" ندارد۔

۴ اردوئے معلّٰی "سب روپیہ" بجائے "روپیہ سب"۔ ۵۔ اردوئے معلّٰی، عود اول "شاید" ندارد۔

۶۔ اردوئے معلّٰی، عود اول و عود دوم "کے"۔

۷۔ اردوئے معلّٰی "یہی کہ کر مجھ سے"۔

۸۔ الناظر "دے دی "دے" زائد"۔

۹۔ اردوئے معلّٰی، عود اول و عود دوم "جو" ندارد۔

۱۰ الناظر "میرن صاحب، میر سرفراز حسین"۔

۱۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں ہجری اور عیسوی تاریخیں لکھ دی ہیں لیکن سنہ نہیں لکھا۔ یہ سنہ ۱۸۵۹ء مطابق ۱۲۷۵ھ ہے کیوں کہ اسی سال غالب کی پنشن کا دوبارہ اجرا ہوا تھا۔

ص ۵۰۸

۱۔ الناظر "بہم" ندارد۔

۲ عود اول و عود دوم "یہاں کا بھائی"۔

۳۔ عود اول میں "برابر دہی .... مہینے میں" کتابت ہونے سے رہ گئی تھی۔ اس لیے یہ عبارت حاشیے پر لکھی گئی ہے۔

۴۔ الناظر "میرے" ندارد۔

۵۔ اردوئے معلّٰی، عود اول و عود دوم "اور دوسری گورنر جنرل بہادر کی کلکتہ کی نذر"۔ ندارد۔ یہ عبارت صرف "الناظر" میں ہے۔

۶۔ عود اول و عود دوم "وہاں"۔

۷۔ عود اول و عود دوم "سرافراز"۔

۸۔ الناظر" اور میر نصیر الدین" ندارد۔

۹۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے لکھا ہے "آج ۲۷ مارچ کی ہے" اور "دستنبو" کے بارے میں جو کچھ غالب نے لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط ۱۸۵۹ء میں لکھا گیا۔

۱۰-۱۱۔ عود اول و عود دوم "و" ندار"۔

ص ۵۰۹

۱۔ اردوے معلّٰی "عود اول "کا"۔

۲۔ عود اول و عود دوم "کیسا"۔ ۳۔ عود اول و دوم "آتی"۔

۴۔ عود اول و عود دوم "تھا"۔

۵۔ اردوے معلّٰی "چاہو، جاؤ اپنے گھر"۔

ص ۵۱۰

۱۔ عود دوم "پڑھا"۔

۲۔ اردوے معلّٰی، عود اول و عود دوم "جس وقت میں نے یہ قطعہ وہاں بھیجنے کے واسطے لکھا" الناظر "جس وقت وہاں بھیجنے کے واسطے لکھا"

۳۔ الناظر "اب خط کیوں لکھوں"۔

۴۔ عود اول و عود دوم "کر" ندارد۔

۵۔ عود اول "بیٹھتا"۔

۶۔ الناظر "مگر وہ جو کچھ تم نے سنا ہوگا" ندارد۔

۷۔ الناظر "میر" بجائے "سید"۔

۸۔ اردوے معلّٰی، عود اول و عود دوم "یعنی" ندارد۔

۹۔ اردوے معلّٰی "بادہ انگوری ۱۰۔ عود اول "

ص ۵۱۱

۱۔ الناظر "ہیں"۔

۲۔ اردوے معلّی، عودِ اول وعودِ دوم "لیکور کے معنی تم نہ سمجھے ہو گے۔" ندارد۔ یہ عبارت صرف "الناظر" میں ہے۔

۳۔ اردوے معلّی عودِ اول وعودِ دوم "فرہنگ سرور"۔

۴۔ اردوے معلّی، عودِ اول وعودِ دوم "ہو تو ہو"

۵۔ الناظر "مجتہد العصر کو" "کو" زائد۔

۶۔ الناظر "کہ وہ اُن کے علم کی کنجی ہیں اور ٹکے ٹکے کی کتابیں چالیس پچاس روپیے کو لے گئے ہیں" ندارد

۷۔ تاریخ تحریر صرف "الناظر" میں ہے۔

۸۔ عودِ دوم "تجھ کو"۔

۹۔ اردوے معلّی "عطاب"۔

۱۰۔ اردوے معلّی "اچھی" ندارد۔

ص ۵۱۲

۱۔ عودِ دوم "اِدھر پڑھا اُدھر ہی جواب لکھا" بجائے "اور پڑھا، اور یہ جواب لکھا"

۲۔ عودِ اول وعودِ دوم "کہا" بجائے "کیا سبب"

۳۔ عودِ اول وعودِ دوم "چارسو"۔

۴۔ عودِ اول وعودِ دوم "سرافراز"۔

۵۔ عودِ اول وعودِ دوم "دعا" ندارد۔

۶۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں لکھا ہے: "آج شنبہ ۱۵ اکتوبر" اس خط میں غالب نے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ ابھی پنشن جاری نہیں ہوئی۔ اس لیے یہ خط ۱۵ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو لکھا گیا۔

ص ۵۱۳

۱۔ "ٹاؤن ڈیوٹی" کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔

۲۔ اردوے معلّی "دونو"۔

۳۔ عودِ دوم "سمجھتے"۔

ص ۵۱۴

۱۔ عودِ اول وعودِ دوم "ہے" ندارد۔

۲۔ عود اول و عود دوم "یہ"

۳۔ عود دوم "درام" بجائے "رام پور"۔

۴۔ اردوے معلّٰی "میرن صاحب نے دو سطریں" بجائے "یہ میران صاحب نے جو دو سطریں"

۵۔ اردوے معلّٰی، عود اول و عود دوم "لکھیں"۔

۶۔ خط پر تاریخ تحریر موجود نہیں۔ اس خط میں غالب نے حاکم اکبر (لارڈ کیننگ) کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے تقریباً وہی باتیں یوسف علی خاں ناظم کے نام خط، مورخہ، نومبر ۱۸۵۹ء میں لکھی تھیں۔ اس لیے مجروح کے نام یہ خط بھی نومبر ۱۸۵۹ء میں لکھا گیا ہوگا۔

۷۔ اردوے معلّٰی، عود اول و عود دوم "ہے"۔

۸۔ عود اول، "چاندنی چوک"۔

۹۔ اردوے معلّٰی، "ہر روز مجمع بازار" بجائے "ہر روزہ بازار"۔ عود اول "کرندہ بازار" عود دوم "گزیدہ بازار"۔

ص ۵۱۵

۱۔ الناظر "دربار"۔

۲۔ الناظر، اردوے معلّٰی اور عود اول و دوم میں یہ قرأت "ہیں" ہے۔

۳۔ انتخاب "کا"۔

۴۔ انتخاب "کمشنر" بجائے "صاحب کمشنر بہادر" عود اول و عود دوم "صاحب کلکٹر بہادر"۔

۵۔ انتخاب "آیا"۔

۶۔ اردوے معلّٰی، عود اول و عود دوم "بس" ندارد۔

۷۔ اردوے معلّٰی، عود اول و عود دوم "رہے" ندارد۔

۸۔ اردوے معلّٰی "صدر الدین خاں" "خاں" زائد۔

۹۔ عود اول و عود دوم "خاں" ندارد۔ ۱۰۔ عود اول و دوم "خان" ندارد۔

۱۱۔ عود اول "جاؤ جاؤ" "جاؤ" زائد۔ الناظر میں "جاؤ" کے بعد کی عبارت قلم زد کر دی گئی ہے۔

۱۲۔ عود اول و عود دوم "سرفراز"۔

۱۳۔ صرف "انتخاب" میں تاریخ تحریر ہے، سنین اس میں بھی نہیں۔ غالب نے سالِ حال لکھا ہے۔ جو واقعات غالب

نے لکھے ہیں، وہ ۱۸۵۹ء کے ہیں۔ تقویم کی رو سے بھی ۱۸۵۹ء، مطابق ۱۲۷۶ھ قرار پاتا ہے۔

۱۴۔ "الناظر" میں یہ شعر نہیں ہے۔

ص ۵۱۶

۱۔ اردوے معلّٰی "ہاتھ" اردوے معلّٰی، عود اول و عود دوم "نہیں"۔

۲۔ اردوے معلّٰی، عود اول و عود دوم "وہ" ندارد۔

۳۔ اردوے معلّٰی "ڈور"۔

۴۔ انتخاب "ساقی کوثر..... ہائے غضب" ندارد۔

۵۔ انتخاب، الناظر "ڈپٹی کمشنر، صاحب کمشنر، لفٹنٹ گورنر بہادر"۔

۶۔ اردوے معلّٰی "کا"۔

۷۔ اردوے معلّٰی، عود اول و عود دوم "دربار کی" ندارد۔ ۷۔ انتخاب "بہادر" ندارد۔

۸۔ عود اول و عود دوم "ہفت" ندارد۔

۹۔ الناظر "میں" ندارد۔

۱۰۔ عود اول و عود دوم "مہینے"۔

۱۱۔ اردوے معلّٰی، عود اول و عود دوم "اُن کا"۔

۱۲۔ تاریخ تحریر صرف انتخاب میں ہے۔ ۱۳۔ اردوے معلّٰی "لارڈ"۔

ص ۵۱۷

۱۔ اردوے معلّٰی "دیرے"۔

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ لیکن خط میں غالب نے لکھا ہے آج یکشنبہ یکم جنوری ۱۸۶۰ء ہے۔

۳۔ عود اول و عود دوم "ہے" ندارد۔

۴۔ عود اول و عود دوم "صحت"

۵۔ عود اول "قیقہ"۔

ص ۵۱۸

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط رام پور سے لکھا گیا ہے۔ غالب دو بار رام پور گئے تھے۔ یہ خط پہلے سفر کے

دوران لکھا گیا غالب ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو دہلی سے روانہ ہو کر ۲۷ جنوری کو رام پور پہنچے تھے۔ اس لیے قیاس ہے کہ زیر بحث خط فروری ۱۸۶۰ء میں لکھا گیا۔

ص ۵۱۹

۱۔ تاریخ تحریر میں غالب نے سنہ نہیں لکھا۔ خط میں غالب نے لکھا ہے "جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینا ہے"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۱۸۶۰ء ہے۔ اردوے معلّٰی میں جمعہ ۱۶ اپریل چھپا ہے لیکن ۱۶ اپریل "گوشنبہ" ہے اور ۶ اپریل کو جمعہ ہے، غالباً ۱۶ اپریل سہو کاتب ہے، اصل تاریخ ۶ اپریل ہے۔

۲۔ عود اول و دوم "حق ناشناسی" ۲۔ عود اول و عود دوم "تم تو" "تو" زائد۔

۳۔ عود اول "زحیر" عود دوم "زخیر"۔

۱۔ "دریہ بال بال بچ گیا۔ جو اس کے خلاف کہے اس کو غلط جاننا" یہ عبارت اردوے معلّٰی میں حذف کر دی گئی ہے۔ عود اول اور عود دوم میں ہے۔ عود اول میں "دریہ" کے بدلے "اور یہ" ہے۔

۵۔ عود اول و عود دوم "روپیے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے"۔

۶۔ اردوے معلّٰی "ڈیڑھ سو متفرقات میں اٹھ گئے"۔ چوں کہ ڈیڑھ سو روپے دفتر کے ملازمین کو رشوت کے طور پر دیے گئے تھے، اس لیے اردوے معلّٰی کے مرتبین نے عبارت بدل دی۔

ص ۵۲۰

۱۔ عود اول و عود دوم "روپیے" ندارد۔

۲۔ اردوے معلّٰی "کرامت"۔

۳۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں پنشن کے جاری ہونے اور بقایا رقم کے ملنے کا ذکر کیا ہے۔ یہ رقم غالب کو ۴ مئی ۱۸۶۰ء کو ملی تھی۔ (دیکھیے غالب کا خط بنام مرزا ہرگوپال تفتہ، مورخہ ۶ مئی ۱۸۶۰ء) اس لیے یہ خط مئی ۱۸۶۰ء میں لکھا گیا ہوگا۔

۴۔ اردوے معلّٰی، عود اول و عود دوم "مگر" ندارد۔

ص ۵۲۱

۱۔ عود اول و عود دوم "سرافراز"۔

۲۔ اردوے معلّٰی، عود اول و عود دوم "کہ" بجاے "تاکہ"

۳۔ تاریخِ تحریر صرف "انتخاب" میں ہے۔

۴۔ اردوے معلّی "خاں دراں خاں"۔

۵۔ اردوے معلّی میں تاریخِ تحریر ہے لیکن سنین نہیں۔ تقویم کی رو سے یہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء ہے۔

ص ۵۲۲ ۱۔ اردوے معلّی "بھی"۔

ص ۵۲۳ ۱۔ جانِ غالب! تمھارا خط پہنچا، اگر ملا کر پڑھیں تو مصرع ہے۔

۲۔ عود اول و عود دوم "ہر کسی"

۳۔ انتخاب "گیا ہے" "ہے" زائد۔

۴۔ انتخاب "اے میر صاحب تمھیں"۔

ص ۵۲۴ ۱۔ انتخاب "ارے" ندارد۔ ۲۔ انتخاب "تم" بجائے "تو"۔ ۳۔ انتخاب "کرتے ہو"۔

۴۔ انتخاب "خس کی ٹٹی ۔ ۔ ۔ ۔ کربلا ہو جائے گا" ندارد۔ ۵۔ عود اول و عود دوم "اور لے جائیں"۔ ۶۔ عود اول "دھوبی واس کا واڑہ"۔ ۷۔ انتخاب "دلّی شہر نہیں ہے" بجائے "دلّی کہاں۔ واللہ اب"؛ عود اول و عود دوم "دلّی، واللہ اب شہر نہیں ہے۔"

۸۔ انتخاب میں خط یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ ۹۔ عود اول و عود دوم "مصاحب"۔

۱۰۔ عود اول و عود دوم "ورنہ وہ" "وہ" زائد۔

۱۱۔ عود اول و عود دوم "سرافراز"۔

ص ۵۲۵

۱۔ عود دوم "میر نصیر الدین کو دعا کہنا"۔

۲۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے الگزینڈر ہیڈرلی کا ذکر کیا ہے۔ ہیڈرلی کا انتقال ۷ جولائی ۱۸۶۱ء کو ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ خط اس تاریخ سے پہلے لکھا گیا۔ سڑکیں اور نئی عمارتیں بنانے کے لیے دہلی کے مکانات ۱۸۶۱ء میں ڈھائے گئے تھے۔ اس لیے یہ خط اسی سنہ میں لکھا گیا ہوگا۔

۳۔ انتخاب "کے"۔

۴۔ الناظر "آرزو"۔

۵۔ عوداول وعوددوم "مجنوں"۔

۶۔ انتخاب، الناظر، عوددوم "عمر کیا ہے" ندارد۔

۷۔ اردوئے معلی "معاش کیا ہے" ندارد۔

۸۔ عوددوم "خان" ندارد۔ عوداول ودوم۔ انتخاب "احمد حسین کی عمر کیا ہے؟"

۹۔ اردوئے معلی، عوداول وعوددوم "خوب چھان کر"۔

۱۰۔ تاریخ تحریر صرف "انتخاب" اور "الناظر" میں ہے۔ تقویم کی رو سے ۲۳ مئی کو "چہارشنبہ" ہے۔

۱۱۔ اردوئے معلٰی، عوداول "کو"

ص ۵۲۶

۱۔ اردوئے معلی "سبحان اللہ" ندارد۔

۲۔ عوداول وعوددوم "اس کو"۔

۳۔ عوداول وعوددوم "یہ اپنے" بجائے "میرے"۔

۴۔ عوداول وعوددوم "ہاری"۔

۵۔ عوداول وعوددوم "علی" ندارد۔ ۶۔ اردوئے معلٰی "پوچھو"۔

ص ۵۲۷

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں "ملکہ کی سالگرہ کی روشنی" کا ذکر کیا ہے۔ ۱۸ جون ۱۸۶۱ء میں ملکہ تخت نشین ہوئی تھی۔ یہ روشنی جون یا مئی میں ہوئی ہوگی۔ اس لیے یہ خط اسی زمانے میں لکھا گیا ہوگا۔

۲۔ عوداول وعوددوم "بھوکھ"۔

۳۔ عوددوم "ساتھ"۔

ص ۵۲۸

۱۔ عوداول "متابعت"۔

۲۔ عوداول وعوددوم "سرافراز"۔

۳۔ عوداول "ہیات"۔

۴۔ عوداول "کرو"۔

۵۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے مئی ۱۸۶۱ء کے خط میں غالب نے لکھا تھا کہ میرن صاحب "پنجشنبہ کو پانی پت واپس آنے کا پروگرام بنا رہے ہیں' اس خط میں اُن کی واپسی کا ذکر ہے' اِس لیے یہ خط بھی خط ۳۲ کے قریبی زمانے میں لکھا گیا ہو گا۔

۶۔ عود اول "انو"۔

۷۔ اردوے معلّٰی' عود اول و عود دوم "لے" ندارد۔

۸۔ اردوے معلّٰی "مگر" ندارد۔

۹۔ عود اول و عود دوم "میر محمود علی" "میر" زائد۔

۱۰۔ اردوے معلّٰی "کہ" ندارد۔

۱۱۔ اردوے معلّٰی "کہتے ہیں کہ .... پائیں گے" ندارد۔

ص ۸۲۹

۱۔ عود اول "پائے گے"۔

۲۔ عود اول و عود دوم "سرافراز"۔

۳۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں الور کے جو حالات بیان کیے ہیں وہ ۱۸۶۱ء کے ہیں۔ اس لیے یہ خط اسی سنہ میں لکھا گیا ہے۔

۴۔ اردوے معلّٰی' عود اول و عود دوم "اسی وقت"۔

۵۔ انتخاب "زیر باری ناحق"۔

۶۔ اردوے معلّٰی' عود اول و عود دوم "بھی" ندارد۔

۷۔ انتخاب "ہے"۔

۸۔ غالب نے میر سرفراز حسین اور میرن صاحب کو ملازمت کے لیے رام پور بھیجا تھا اور اُن کے سلسلے میں علی بخش خانساماں کو سفارشی خط لکھا تھا' مگر کسی وجہ سے ان دونوں میں سے کسی کو بھی ملازمت نہیں ملی۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کو شاید یہ پسند نہیں آیا کہ غالب نے سفارشی خط براہِ راست نواب صاحب کے نام بھیجنے کے علی بخش خانساماں کے نام بھیجا۔ غالب نے ۲۲ جولائی ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں نواب یوسف علی خاں ناظم کو لکھا: "میر سرفراز حسین اور میرن صاحب کو واللہ باللہ اگر میں نے بھیجا ہو۔ نوکری

کی جستجو کو نکلے تھے۔ میر سرفراز حسین نوکری پیشہ اور میرن مرثیہ خواں اور یہاں کے مرثیہ خوانوں میں ممتاز۔ خانساماں صاحب کو جو میں نے یہ لکھا کہ یہ ایسے ہیں اور ایسے ہیں غرض اس سے یہ تھی کہ محرم میں جہاں دس پانچ مرثیہ خواں اور مقرر ہوتے ہیں میرن صاحب بھی مقرر ہو جائیں۔ آخر جا بہ جا تھانے دار، کوتوال، تحصیل دار نوکر ہیں۔ میر سرفراز حسین ہوشیار اور کارگزار آدمی ہیں، کسی علاقے پر یہ بھی مقرر ہو جائیں۔ یہ دونوں امر یا ان دونوں میں سے ایک ہو جاتا بہتر تھا، نہ ہوا بہتر۔ درحقیقت سپارش نہ تھی، صرف معرف ہونا تھا۔ سپارش کرتا تو کیا میں آپ کو نہ لکھ سکتا تھا۔"

۹۔ عود اول و عود دوم "سرافراز"۔

۱۰۔ "انتخاب" میں یہ خط یہیں ختم ہو جاتا ہے۔

۱۱۔ عود اول و عود دوم "پڑا"۔

ص ۵۳۰

۱۔ عود اول و عود دوم "گا" ندارد۔

۲۔ عود دوم "خاوند"۔

۳۔ عود اول و عود دوم "مزاج"۔

۴۔ انتخاب کے خط میں دن اور ہجری و عیسوی تاریخیں تو دی گئی ہیں لیکن سنین نہیں دیے گئے۔ یہ ۱۸۶۱ء مطابق ۱۲۷۸ھ ہے۔

ص ۵۳۱

۱۔ اردوے معلّٰی "محمد حسن خاں"۔

ص ۵۳۲

۱۔ اردوے معلّٰی "قمری" ندارد۔ یہ قیاسی تصحیح غالباً پہلی بار مولوی مہیش نے کی تھی۔

۲۔ تاریخ تحریر میں سنہ نہیں۔ میر سرافراز اور میرن صاحب کے رام پور جانے اور مطبعِ احمدی میں دیوانِ غالب (اردو) چھپنے کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۸۶۱ء ہے۔

۳۔ انتخاب "مجتہد العصر کے مسودے..... بھیج دیا۔ اور" ندارد۔

۴۔ عود اول و عود دوم "کاغذ کو بار بار" "کاغذ کو" زائد۔

۵۔ انتخاب "تمھارا دماغ چل گیا ہے..... پاؤ گے کیا یعنی" ندارد۔

۶۔ اردوے معلّٰی عود اول وعود دوم "کہ" ندارد۔

۷۔ اردوے معلّٰی "سے" ندارد۔

۸۔ انتخاب "خط تمھارا..... بھیجتے رہو" ندارد۔

۹۔ انتخاب "برخوردار سے کہو" لکھ کر قلم زد کر دیا گیا ہے اور حاشیے پر "کہنا" لکھا گیا ہے۔

۱۰۔ انتخاب "طرز تھی یا اور" "یا اور" ندارد۔

۱۱۔ انتخاب "واہ کیا شیوہ ہے" بجاے "ہاے، کیا اچھا شیوہ ہے۔"

۱۲۔ انتخاب "اور پھر جب" اور "پھر" زائد۔

۱۳۔ اردوے معلّٰی، عود اول وعود دوم "گویا" ندارد۔

۱۴۔ اردوے معلّٰی، عود اول وعود دوم "کہ" ندارد۔

۱۵۔ انتخاب "اور وقت" ندارد۔

۱۶۔ انتخاب "کیا"۔

۱۷۔ انتخاب "اور اگر تمھاری.... خفا نہ ہو" ندارد

۱۸ اردوے معلّٰی، عود اول "نثر" ندارد۔

ص ۵۳۳

۱۔ صرف "انتخاب" میں تاریخ تحریر ہے اور سنہ اس میں بھی نہیں۔ غالب نے خط میں حسن علی خاں کے انتقال کا ذکر کیا ہے جو ۱۸۶۱ء میں ہوا تھا۔ اس لیے یہ خط ۲۲ ستمبر ۱۸۶۱ء میں لکھا گیا۔

ص ۵۳۴

۱۔ غالب نے خط کا آغاز ۱۵ مئی ۱۸۶۲ء بروز پنجشنبہ کیا تھا۔ مگر اس کا آخری حصہ اگلے دن یعنی جمعہ ۱۶ مئی ۱۸۶۲ء کو لکھا گیا۔

لکھتے ہوئے غالب سے سہو ہوا ہے۔

۲۔ انتخاب "ڈھکوسلا۔"

۳۔ انتخاب "ہوں" ندارد۔

۴۔ انتخاب "محرم کے بعد"۔
۵۔ اردوئے معلیٰ، عود اول و عود دوم "دے" ندارد۔
۶۔ انتخاب "تو" بجائے "سو"۔ عود اول و دوم "سو پہلے تو"۔
۷۔ اردوئے معلیٰ عود اول و عود دوم "گاہ گاہ" ندارد۔
۸۔ انتخاب "تارے اگر۔"
۹۔ تمام مجموعوں میں "جگنوں"۔
۱۰۔ انتخاب "جگہ"۔

ص ۵۳۵

۱۔ انتخاب "غلہ"۔ ا۔ اردوئے معلیٰ "زیادہ کیا لکھوں" ندارد۔
۲۔ تاریخ تحریر صرف "انتخاب" میں ہے۔ غالب نے تاریخِ تحریر میں دن، مہینے اور تاریخوں کے ساتھ "سالِ رستاخیز ۱۲۷۸ھ" لکھا ہے، جب کہ ۱۲۷۹ھ ہے۔
۳۔ "انتخاب" میں یہ خط "برسات کا حال نہ پوچھو۔" سے شروع ہوتا ہے۔
۴۔ اردوئے معلیٰ "و" ندارد۔
۵۔ عود اول و عود دوم "وہ خط" "خط" زائد۔
۶۔ عود اول "درد"۔
۷۔ اردوئے معلیٰ، عود اول و عود دوم "لکھتے"۔

ص ۵۳۶

۱۔ اردوئے معلیٰ "حسن"۔
۲۔ عود اول و عود دوم "یعنی میر" "یعنی زائد۔ عود دوم "امیر" بجائے "میر"۔
۳۔ اردوئے معلیٰ "مجتہد العصر کو دعا کہنا اور یہ خط پڑھا دینا" ندارد۔
۴۔ عود اول و عود دوم "نہیں"۔
۵۔ عود اول و عود دوم "کچھ حاصل ہو رسائی"۔
۶۔ اردوئے معلیٰ "قاسم خاں"۔

۷۔ انتخاب، عود اول و عود دوم "وہ گر" "وہ زائد۔
۸۔ انتخاب "چھلنیاں"۔ اردوے معلّی "چھلنی ہوگئیں ہیں"۔
۹۔ انتخاب "خط لکھوں کہاں بیٹھ کر"۔
۱۰۔ انتخاب "فکر" ندارد۔
۱۱۔ انتخاب "طول"۔

ص ۵۳۷

۱۔ یہ الور کے مہاراجا کا ذکر ہے۔
۲۔ اردوے معلّی، عود اول و عود دوم "ہاں ملے گا" ندارد۔
۳۔ اردوے معلّی، عود اول و عود دوم "بہت" ندارد۔
۴۔ انتخاب "مجتہد العصر" لکھ کر قلم زد کردیا ہے۔ "جناب" زائد۔
۵۔ عود اول و عود دوم "سرافراز۔" انتخاب "جناب سرفراز حسین۔"
۶۔ اردوے معلّی، عود اول "آدمی" ندارد۔
۷۔ عود دوم "بھئی۔" انتخاب جے پور کے.... میرن صاحب" ندارد۔
۸۔ تاریخ تحریر صرف "انتخاب" میں ہے۔

ص ۵۳۹

۱۔ تاریخ تحریر میں غالب نے سنہ کے بجائے سالِ حال لکھا ہے۔ یہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء ہے۔
۲۔ انتخاب میں مصرع سے پہلے "نظم" لکھا گیا ہے۔
۳۔ اردوے معلّی "عشرہ مبشرہ یعنی" ندارد۔
۴۔ غالب نے جن تین لوگوں کے نام لکھے ہیں، اُن کے علاوہ چھے اراکین کے نام ہیں۔ محمد حسین، نصیر الدین، حافظ داؤد، حافظ میر محمد، محبوب بخش، منشی تراب علی۔ یہ دستاویز کرم خوردہ ہے۔ ایک نام اور ہے جو پڑھا نہیں جاتا۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد جامع مسجد پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا تھا۔ غالباً ۱۸۶۱ء میں حکومت نے جامع مسجد کے واگذاشت کرنے کا ارادہ کیا۔ علما کے دو گروہ مسجد کے انتظام کے دعوے دار ہوگئے۔ بہت دن تک یہ جھگڑا چلتا رہا کہ مسجد کس کے حوالے

کی جائے۔ بالآخر حکومت نے مندرجہ بالا حضرات پر مشتمل ایک انتظامیہ کمیٹی بنا کر ۲۸ نومبر ۱۸۶۲ء کو مسجد اُن کے حوالے کر دی۔ اس کمیٹی سے انگریزی میں جو معاہدہ ہوا تھا اس میں یہ شرائط بھی تھیں؛

رات کو سب لوگ نماز پڑھ کر گھر چلے جائیں گے۔

رات کو خادم اور موذن کے علاوہ اور کوئی مسجد میں نہیں رہے گا۔

اب تک ہندوؤں کو مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں لیکن اب اُن کو اجازت ہوگی۔ بشرطیکہ اُن کا مسجد میں رویہ درست ہو۔

یورپین آفیسرز اور دوسرے یورپین مسجد میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اُن پر جوتے اُتارنے کی پابندی عائد نہیں ہوگی۔ کتے اندر نہیں جا سکتے۔ اگر یہ لوگ مسجد میں سگریٹ پئیں تو انھیں منع کر دینا چاہیے۔

یورپین سپاہی، ڈسٹرکٹ آفیسر یا کمانڈر آفیسر سے پاس لیے بغیر مسجد میں داخل نہیں ہوں گے۔

ملاحظہ ہو:

DEPT OF ARCHIVES, DELHI-S NO 1860 B/-171

۵۔ اردوئے معلّیٰ "ابن فضل اللہ خاں" ندارد۔

۶۔ اردوئے معلّیٰ "اور" ندارد۔

۷۔ "انتخاب" میں "جاڑا پڑ رہا ہے۔۔۔۔ بوتل گلاس موقوف" لکھ کر قلم زد کر دیا گیا ہے اور خط یہیں ختم ہو گیا ہے۔

ص ۵۴۰

۱۔ اردوئے معلّیٰ "گور"۔

۲۔ غالب نے تاریخِ تحریر میں سنین نہیں لکھے۔

۳۔ انتخاب میں "برخوردار" لکھ کر قلم زد کر دیا گیا ہے۔

۴۔ یہ خط صرف "انتخاب" میں ہے۔

ص ۵۴۱

۱۔ انتخاب "یک طرف"۔

۲۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ انبالے کے دربار کا ذکر غالبؔ نے نواب یوسف علی خاں ناظمؔ اور مرزا ہرگوپال تفتہؔ کے نام اُن خطوط میں بھی کیا ہے، جو انھوں نے مارچ ۱۸۶۳ء میں لکھے تھے۔ اس خط میں غالبؔ نے لکھا ہے کہ: "یہاں مہاوٹیں برس گئی ہیں"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط دسمبر ۱۸۶۲ء یا جنوری ۱۸۶۳ء میں لکھا گیا۔ اس کا امکان زیادہ ہے کہ جنوری ۱۸۶۳ء میں لکھا گیا ہو۔

ص ۵۴۲

۱۔ اردوئے معلّیٰ مجتبائی "خیر"۔

ص ۵۴۳

۱۔ غالبؔ نے تاریخِ تحریر صرف ہجری لکھی ہے۔

ص ۵۴۴

۱۔ عودِ اول "این"۔

۲۔ عودِ اول و عودِ دوم "سرافراز"۔

۳۔ عودِ اول و عودِ دوم "الست"۔

۴۔ عودِ اول و عودِ دوم "ہما"۔

ص ۵۴۵

۱۔ عودِ دوم "مکسورہ"۔

۲۔ عودِ اول "دن" بجائے "وزن"۔

ص ۵۴۶

۱۔ عودِ اول "خُرم جہاں"۔

۲۔ عودِ اول "بہ" ندارد۔

۳۔ عودِ اول و عودِ دوم "خور"

۴۔ عودِ اول "ور"۔

۵۔ عودِ اول "جسم"۔

۶۔ عودِ اول و عودِ دوم "کہتے"۔

۷۔ عود اول "کہا" ندارد۔

۸۔ عود دوم "تو"۔

۹۔ عود دوم "کر ہوا"، "ہوا" زائد۔ عود اول "لگے کر اور" "کر" زائد۔

۱۰۔ عود دوم "شراب"۔

ص ۵۴۷

۱۔ عظیم الدین میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ یہ غالبؔ کا اردو دیوان شائع کرنا چاہتے تھے لیکن کسی وجہ نہ چھاپ سکے۔ غالبؔ نے مسودہ واپس لے کر منشی شیونرائن کو آگرے بھیج دیا۔ غالبؔ نے اس کی تفصیل منشی شیونرائن آرام کے نام ایک خط مورخہ اپریل ۱۸۶۰ء میں بیان کی ہے۔

ص ۵۵۰

۱۔ غالبؔ نے تاریخ تحریر میں سنین نہیں لکھے۔ تقویم کی رو سے یہ ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۶۰ء ہے

ص ۵۵۳

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خطوط نمبر ۵، ۶، ۷ کے مضامین مشترک ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی زمانے میں اور بنارس سے لکھے گئے ہیں۔ خط نمبر ۵ کی تاریخ تحریر ۱۲ فروری ۱۸۶۱ء ہے اس لیے یہ خط بھی جنوری یا فروری میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۵۵۴

۱۔ اردوے معلّٰی مجتبائی "لفظوں"۔

ص ۵۵۷

۱۔ غالبؔ نے تاریخ تحریر میں ہجری اور عیسوی سنین نہیں لکھے۔ چونکہ جامع مسجد کے واگزار ہونے کا ذکر کیا ہے اس لیے یہ خط ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا۔ لیکن تاریخ لکھنے میں کاتب سے سہو ہوا ہے۔ یہ "۲۱ ذی قعدہ" ہے "۲" نہیں۔ ۲۱ ذی قعدہ کو مئی کی ۲۰ ہے۔ اردوے معلّٰی میں ۲ ذی قعدہ و مئی چھپا ہے۔

۲۔ اردوے معلّٰی "دونو"

ص ۵۵۸

۱۔ اردوے معلّٰی "ہول" ندارد۔ ۲۔ اردوے معلّٰی "جون شنبہ" "شنبہ" زائد۔

ص ۵۵۹

۱۔ اردوے معلّٰی "فرزند فرخ فال" "فال" زائد۔

ص ۵۶۰

۱۔ اردوے معلّٰی "سکا"

۲۔ اردوے معلّٰی میں اس خط کا سنہ تحریر ۱۸۶۶ء چھپا ہے۔ تقویم کی رو سے یکم مارچ ۱۸۶۶ء کو "سہ شنبہ" نہ تھا اس خط میں غالب نے خط نہ لکھنے کی سیاح سے شکایت کی ہے۔ اگر یہ ۱۸۶۶ء کا ہوتا تو اس شکایت کا کوئی موقع نہیں، کیوں کہ ۱۲ فروری ۱۸۶۶ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۰ فروری کو غالب کو سیاح کا خط ملا تھا۔ اس لیے یہ خط ۱۸۶۴ء میں لکھا گیا ہوگا۔

۳۔ غالب "درفشِ کاویانی" کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہ "قاطعِ برہان" کا دوسرا اڈیشن تھا۔ اس کی طباعت کے لیے میر غلام بابا خاں نے سو روپے دیے تھے۔

ص ۵۶۱

۱۔ تاریخ تحریر میں غالب نے سنین نہیں لکھے۔ تقویم کی رو سے یہ ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۴ء ہے۔

ص ۵۶۲

۱۔ غالب نے صرف ہجری تاریخ لکھی ہے۔

ص ۵۶۳

۱۔ غالب نے صرف ہجری تاریخ لکھی ہے۔

۲۔ غالب نے لکھا ہے: "ایک قرن بارہ برس سے فردوس مکان نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور اپنے اشعار میرے پاس بھیجتے تھے اور سو روپے مہینا ماہ بہ ماہ بہ سبیلِ ہنڈوی بھجواتے تھے۔" اس حساب سے نواب یوسف نے ۱۸۵۳ء میں غالب کا تلمذ اختیار کیا۔ حال آں کہ ایسا نہیں تھا۔ نواب صاحب نے غالب کے نام ۵ فروری ۱۸۵۷ء کے خط میں غالب کا تلمذ اختیار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور اصلاح کے لیے کچھ کلام بھی بھیجا تھا اور جولائی ۱۸۵۹ء میں غالب کا سو روپیہ ماہوار مقرر ہوا۔ (مکاتیبِ غالب، پہلا اڈیشن ص ص ۲-۷۴)

ص ۵۶۴

۱۔ غالب کا یہ بیان درست نہیں۔ "قاطعِ برہان" کا پہلا اڈیشن منشی نول کشور نے چھاپا تھا اور

غالبؔ نے اس کی طباعت پر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا تھا اور نہ ہی نواب رام پور نے اس سلسلہ میں غالبؔ کو کوئی رقم دی۔ یہ غلط بیانی دراصل حسنِ طلب ہے۔ غالب چاہتے ہیں کہ نواب میر غلام بابا خاں "قاطع برہان" کے دوسرے اڈیشن کے لیے دو سو روپے دے دیں۔ غالبؔ کو اپنے مقصد میں کامیابی تو ہوئی لیکن پوری نہیں۔ نواب صاحب نے دو سو نہیں سو روپے دیے۔ غالبؔ نے ان روپوں کا شکریہ ۱۱ ستمبر ۱۸۶۵ء کے خط میں کیا ہے۔ ۲۔ مطبوعہ اڈیشن میں یہ قرأت "پرسوں" ہے۔ میں کاظم علی خاں کے اس خیال سے متفق ہوں کہ یہ قرأت "نرسوں" ہے۔

ص ۵۶۶ ۱۔ اردو کے معنی "ستمبر"۔

۲۔ نواب میر غلام بابا خاں نے "درفشِ کاویانی" کی طباعت کے اخراجات کے لیے غالبؔ کو سو روپے بھیجے تھے۔ سو روپے میں تین سو کتابیں تیار ہوئی تھیں۔ ممکن ہے پہلے نواب صاحب نے لکھا ہو یا خود غالبؔ نے تجویز کیا ہو کہ ان تین سو کتابوں میں سے ڈیڑھ سو نواب صاحب کو بھیجی جائیں گی اور باقی ڈیڑھ سو غالبؔ رکھ لیں گے۔ غالبؔ نے ڈیڑھ سو کتابوں کا بنڈل بھیجنے کی کوشش کی لیکن ڈاک خانے والوں نے اتنا بڑا بنڈل قبول نہیں کیا۔ غالبؔ نے سیاحؔ کو لکھ کر پوچھا کہ اب کیا کیا جائے اور پھر خود چھتیس کتابوں کا بنڈل بھیج دیا۔ اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ نواب صاحب نے ڈیڑھ سو کے بجائے بہت کم تعداد میں کتابیں مانگیں۔ غالبؔ چھتیس کتابیں بھیج چکے تھے۔ پھر غالباً مزید کتابیں نہیں بھیجیں۔

ص ۵۶۸

۱۔ قاضی صاحب بڑودہ سے مراد "تذکرہ مخزنِ شعرا" کے مولف قاضی نورالدین حسین فائقؔ ہے۔ غالباً قاضی صاحب نے غالبؔ کے خلاف کچھ لکھا تھا۔ شہاب الدین احمد خاں کے نام خط میں غالبؔ نے انھیں کے بارے میں لکھا تھا۔ "وہ قاضی تو مسخرہ چوتیا ہے۔"

۲۔ دیوانِ غالبؔ میں یہ مصرع اس طرح ہے:

غالبؔ بُرا نہ مان، جو واعظ بُرا کہے

ص ۵۶۹

۱۔ اردو کے معنی "تھس"۔

ص ۵۷۰

۱۔ اگرچہ "لطائفِ غیبی" میاں داد خاں سیاح کے نام سے چھپی تھی لیکن ایسے بہت سے شواہد موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کتاب کے اصل مصنف خود غالب تھے۔ اس خط میں یہ فقرہ "میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ سے چلتی رہے گی" بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۲۔ غالب نے قتیل کے کلام پر خود ایک اعتراض لکھا اور سیاح کے نام سے اسے شائع کرایا۔

ص ۵۷۲

۱۔ اردوے معلّٰی "مر" بجائے "میر"۔

ص ۵۷۳

۱۔ اردوے معلّٰی "پکلا"۔

۲۔ اردوے معلّٰی "کا"۔

ص ۵۷۶

۱۔ اردوے معلّٰی۔ شعر ندارد۔

۲۔ عود اول و دوم۔ "اغلب اور اکثر"

۳۔ عود اول: "پہنچتا"

۴۔ عود اول و دوم: "پیر مرشد"

۵۔ اردوے معلّٰی "کر کے جلد بھیج دیجے"۔

۶۔ عود اول۔ جناب چودھری صاحب غلام رسول"۔

۷۔ اردوے معلّٰی "شیخ"

۸۔ خط میں غالب کے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب اور سرور کے تعلقات ابتدائی منزل میں ہیں۔ خط ۲ مارچ اپریل ۱۸۵۵ء میں لکھا گیا ہے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ زیرِ نظر خط مارچ ۱۸۵۵ء سے کچھ ہی عرصے قبل لکھا گیا ہوگا۔

ص ۵۷۷

۱۔ عرفی کے ایک قصیدے کا شعر ہے:

من کہ باشم عقلِ کل را ناوک انداز ادب
مرغ اوصاف تو از اوج بیان انداختہ

۲۔ عرفی کے ایک اور قصیدے کا ایک شعر ہے:

انعامِ تو بردوختہ چشم و دہن آز
احسانِ تو بشگافتہ ہر قطرۂ یم را

۳۔ عود اول "نظم"

ص ۵۷۸

۱۔ عود دوم "ہے" ندارد۔

ص ۵۷۹

۱۔ عود اول "سنودمی"

۲۔ عود اول "مقرر"

۳۔ عود دوم "پرسش"

۴۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالب نے مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط مورخہ ۱۲ اپریل ۱۸۵۸ء میں لکھا ہے "بھائی منشی نبی بخش کی خیر و عافیت بھی معلوم ہوئی۔ وہ تو پنسن کی فکر میں تھے، ظاہرا یوں مناسب دیکھا ہوگا کہ نوکری کی خواہش کی۔" زیرِ نظر خط میں بھی غالب نے منشی نبی بخش حقیر اور اُن کی پنشن کا ذکر کیا ہے۔ جس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ خط مارچ اپریل ۱۸۵۸ء میں لکھا گیا ہوگا۔ ۵۔ اردوے معلّیٰ (مجتبائی) میں یہ خط نامکمل شکل میں شہزادہ بشیر الدین کے نام شائع ہوا ہے، جو غلط ہے۔ ۶۔ عود اول "قبل"

ص ۵۸۰

۱۔ عود اول "اواج"

۲۔ عود اول "میں"

۳۔ عود اول و دوم "کا" ندارد۔

۴۔ عود دوم "لکھے"

۵۔ عود دوم "آئے گے"۔

ص ۵۸۱

۱۔ عوداول "وست"۔

۲۔ کلیاتِ غالب (مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۲۵ء) میں یہ قرأت "جمع" ہے۔

۳۔ عوداول "ر"

۴۔ عود اول ودوم "یم" کلیات میں یہ قرأت "ہم" ہے۔

۵۔ عوداول "معقولہ"۔

۶۔ عوداول "مرفوع"۔

۷۔ عوداول "ہے" ندارد۔

۸۔ عوداول "و" ندارد۔

۹۔ عوداول "سباب" ۱۰۔ عوداول "نہیں نظر آتی"۔

ص ۵۸۲

۱۔ عوداول "سوائے عجم"۔

۲۔ عوداول "یہ بحر" "یہ زائد"۔

۳۔ عوددوم "مفاعلین" ۴ عوداول "جس"۔

۵۔ عوداول "کھویا" "یا" زائد۔

ص ۵۸۳

۱۔ عوداول "ہیں" بجائے "تین"۔

۲۔ عوداول "فقرے میں"۔

۳۔ عوداول "فقرہ"۔

ص ۵۸۴

۱۔ عوداول "دہشت"۔

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ سرور کے نام مارچ یا اپریل ۱۸۵۸ء کے خط میں غالب نے عرفی

کے شعر "منکہ باشم عقل کل ۔ الخ" پر بحث کی ہے اور اس خط میں بھی اس شعر پر بحث ہے اس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ خط اپریل یا مئی ۱۸۵۸ء میں لکھا گیا ہوگا۔

۳۔ عود اول "بر و نی"۔

۴۔ عود اول "تو"۔

۵۔ عود اول "ذمیمہ"۔

۶۔ عود اول "یہ"۔

۷۔ عود اول و دوم "زمان"۔

ص ۵۸۵

۱۔ "پیسے ہوتے"۔ "ہوئے" زائد۔

۲۔ عود اول "ہے" ندارد۔

۳۔ عود اول "حضرت کی" ندارد۔

۴۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے اس خط میں لکھا ہے: "آج پنجشنبے کے دن اٹھارہ نومبر یہاں پہنچا" خط میں "دستنبو" کا نسخہ بھیجنے کا ذکر ہے۔ "دستنبو" کی تیئیس جلدیں غالب کو بارہ نومبر کو موصول ہوئی تھیں۔ اس لیے یہ خط اٹھارہ نومبر ۱۸۵۸ء کو لکھا گیا۔

ص ۵۸۶

۱۔ عود اول و دوم "نام آور"۔

۲۔ اردوئے معلّٰی "اب" ندارد۔

۳۔ اردوئے معلّٰی "مگر" ندارد۔

۴۔ اردوئے معلّٰی "کچھ" ندارد۔

۵۔ اردوئے معلّٰی "بڑی"

۶۔ عود اول و دوم "چودھری صاحب غلام رسول"۔

۷۔ اردوئے معلّٰی "سن"۔

۸۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے لکھا ہے "دن بدھ کا، ربیع الثانی کی چوبیسویں اور

دسمبر کی پہلی" اس خط میں پارسل کی رسید کا بھی ذکر ہے۔ یہ کتاب "دستنبو" ہے جس کے بھیجنے کی اطلاع غالب نے ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں دی ہے۔ تقویم کی رو سے بھی یہ ۱۸۵۸ء ہے۔

ص ۵۸۷

۱۔ عود اول "جز"۔

۲۔ عود اول "مغربی"۔

۳۔ عود اول "دیگرانی"۔

۴۔ عود اول و دوم "خواجہ بقراط"۔

۵۔ عود اول "وہ سب"۔

۶۔ عود اول "دیوانی سکّہ"۔

۷۔ عود اول "کیوں " ندارد۔

۸۔ عود اول "تشر کدہ"۔

۹۔ عود اول "گلہ"۔

ص ۵۸۸

۱۔ عود اول "بنی" ندارد۔

۲۔ عود دوم "یہ۔"

۳۔ عود دوم "ہے" ندارد۔

۴۔ عود اول "قطرہ ہے"۔ "ہے" زائد۔

۵۔ عود اول "حاشا"۔

۶۔ عود اول و دوم "تصرف کی"۔ "کی زائد۔

۷۔ عود اول "کرتا"۔

۸۔ عود اول و دوم "ایک" بجائے "تک"۔

۹۔ عود اول "پڑے۔"

ص ۵۸۹

۱۔ عود اول "نشان"۔

۲۔ عود اول "اُن"۔

۳۔ غالب نے سرور کے نام مارچ ۱۸۵۹ء اور مارچ یا اپریل ۱۸۵۹ء کے خطوط میں نثر کی اقسام پر گفتگو کی ہے۔ اس خط میں بھی وہی گفتگو ہے، اور خط پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس موضوع پر گفتگو کا آغاز اسی خط سے ہوا تھا۔ اس لیے یہ خط بھی مارچ ۱۸۵۹ء میں لکھا گیا ہوگا۔

۴۔ عود اول "اور اُس میں اُن کو... چکا ہوں" ندارد۔

۵۔ عود اول "کر"۔

ص ۵۹۰

۱۔ عود دوم "شعر"۔

ص ۵۹۱

۱۔ عود اول "کرنا" ندارد۔

۲۔ عود دوم "حکم"۔

۳۔ عود اول "کرتا ہوں"۔

۴۔ عود اول "اہل فارسی"۔

۵۔ عود اول "کیسی"۔ ۶۔ عود اول "و" ندارد۔

ص ۵۹۲

۱۔ عود اول "پڑھا"۔

۲۔ عود اول "اگر" ندارد

۳۔ عود اول "کہ جس کو" "کہ زائد۔

۴۔ عود اول "کیا"۔

۵۔ عود دوم "ہے" ندارد۔

۶۔ عود دوم "حضرات"۔

۷۔ عود اول و دوم "کہا"۔

۸۔ عوداول "سی" ندارد

۹۔ عوداول "بعد اتمام خط کی تحریر کے"

۱۰۔ عوداول "سو" ندارد۔

ص ۵۹۳

۱۔ عوداول ودوم "دونو" ۲۔ عوداول "عقدہ"

۳۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ غالب نے خط میں لکھا ہے کہ بائیس مہینے سے شراب نہیں پی۔ دوسرے لفظوں میں بائیس مہینے سے پنشن نہیں ملی۔ مئی ۱۸۵۷ء میں پنشن بند ہوتی تھی۔ اس حساب سے یہ خط مارچ ۱۸۵۹ء میں لکھا گیا ہوگا۔

۴۔ عوداول ودوم "جہاں"

ص ۵۹۴

۱۔ عوداول "بڈھوں"۔

۲۔ عوداول "بڑھیوں"۔

۳۔ عوددوم "زہے یہ"۔ "یہ" زائد۔

۴۔ عوداول "آگے"۔

ص ۵۹۵

۱۔ عوداول "احتاط"۔

۲۔ عوداول "سات"۔ ۳۔ عوداول "طادو"۔

ص ۵۹۶

۱۔ عوداول میں یہ قرأت پڑھی نہیں جاتی۔

۲۔ عوددوم "کا لکھا چاہیے"

۳۔ عوداول "کہ جائز" "کہ زائد۔

۴۔ عوداول "یاے" ندارد۔

۵۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ مارچ ۱۸۵۹ء کے خط بنام سرور میں غالب نے نثرِ مرجز اور مسجع

پر بحث کی ہے۔ اس خط میں بھی اسی موضوع پر گفتگو ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیرِ نظر خط بھی اسی زمانے میں لکھا گیا ہوگا۔

۹۔ اردوے معلّٰی "اگر خبر نہ ہو تو نہ ہو۔"

ص ۵۹۷

۱۔ عود اول و دوم "یہ" بجائے "بہ"۔
۲۔ عود اول و دوم "نہ بر آئے گی۔"
۳۔ عود اول "حروفِ حکایت"۔
۴۔ اردوے معلّٰی "مارہرہ"۔
۵۔ عود دوم "ہو گئی ہے" بجائے "ہو گئی، ہے ہے"
۶۔ اردوے معلّٰی "کاغذ"۔
۷۔ اردوے معلّٰی "فرمائیں"۔
۸۔ اردوے معلّٰی "اپنے" ندارد۔
۹۔ عود اول کہہ دیا ہے"۔
۱۰۔ عود اول و دوم "میرا شیخ صاحب سے سلام کہیے گا"۔
۱۱۔ عود اول "کچھ"۔
۱۲۔ اپریل ۱۸۵۹ء میں غالب نے سرور کو جو خط لکھا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرور کسی شاعر کی مثنوی اور قصیدہ اصلاح کے لیے غالب کو بھیجنا چاہتے تھے اور غالب نے سرور کو اجازت دی کہ وہ مثنوی اور قصیدہ بھیج دیں۔ زیرِ نظر خط میں غالب نے مثنوی اور اس پر اصلاح کے بارے میں گفتگو کی ہے جس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ خط اپریل، مئی اور حد سے حد جون ۱۸۵۹ء میں لکھا گیا ہوگا۔
۱۳۔ عود دوم "قبول"۔

ص ۵۹۸

۱۔ اردوے معلّٰی "ہے" ندارد۔

۲۔ عوداول ودوم "سے" ندارد۔

۳۔ عوداول "یافتہ"۔

۴۔ اردوے معلّیٰ "یہاں" ندارد۔

۵۔ اردوے معلّیٰ "ہاں"۔

۶۔ عوداول "کہ" زائد۔

۷۔ عوددوم "بہ مثل" ندارد۔

۸۔ غالب نے اس خط میں سرور سے "دہلی اردو اخبار" کے دو شمارے مانگے ہیں، جن میں ذوق کا کہا ہوا سکہ شائع ہوا تھا۔ ۱۸ جون ۱۸۵۹ء کے خط میں غالب نے مرزا یوسف کو لکھا تھا: اگر وہاں اس کا (دہلی اردو اخبار) پتا پاؤ گے اور وہ پرچہ اخبار بجنسہٖ مجھ کو بھجواؤ گے تو بڑا کام کرو گے۔ میں نے اکبرآباد، فرخ آباد، مارہرہ، میرٹھ اپنے احباب کو لکھا ہے"۔ اس کا مطلب ہے کہ غالب، سرور کو جو مارہرے میں تھے، پہلے ہی خط لکھ چکے تھے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ سرور کے نام زیر نظر خط ۱۸ جون ۱۸۵۹ء سے ایک دو روز قبل لکھا گیا ہوگا۔

۹۔ اردوے معلّیٰ "میرے" ندارد۔

۱۰۔ عوداول "وف" بجائے "طرف"۔

ص ۵۹۹

۱۔ عوداول "بھی" بجائے "سے"۔

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ زیر نظر خط میں سکے کے سلسلے میں "دہلی اردو اخبار" کا ذکر ہے۔ اس سلسلے کا پہلا خط غالب نے سرور کو ۱۸ جون ۱۸۵۹ء سے ایک دو دن قبل لکھا تھا۔ اس لیے یہ خط جولائی یا اگست ۱۸۵۹ء میں لکھا ہوگا۔

۳۔ اردوے معلّیٰ "اب یہ عالم ہے"۔ بجائے "اب یہ عالم ہوگیا ہے"۔

۴۔ اردوے معلّیٰ "یہ لکھا گیا ہوگا"۔

ص ۶۰۰

۱۔ عوداول "الزام"۔

۲۔ خطوط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالب نے سکے کے سلسلے میں "دہلی اردو اخبار" کا جس طرح ذکر کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط بھی جولائی اگست ۱۸۵۸ء میں لکھا گیا ہوگا۔

۳۔ عوداول ودوم "دو تو"۔

۴۔ عوداول "دو طرح پر ہے تجنیس"۔

۵۔ عوداول ودوم "لطف کے" "کے" زائد۔

۶۔ عوداول ودوم "دو تو"۔

۷۔ عوداول "ہے" زائد۔

ص ۶۰۱

۱۔ عودودوم "بھی" ندارد۔

۲۔ عوداول ودوم "اُس کا"۔

ص ۶۰۲

۱۔ عوداول ودوم "شور"۔

۲۔ عوداول "گئی۔"

۳۔ اس خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے "قاطع برہان" کے مکمل ہونے کی اطلاع دی ہے۔ غالب نے "درس الفاظ / ۱۲۷۶ھ" سے "برہانِ قاطع" کی تاریخ نکالی تھی یعنی ۱۲۷۶ھ کا آغاز جولائی ۱۸۵۹ء میں ہوا تھا۔ اس خط میں غالب نے لفظ "طرح" پر بحث کی ہے۔ یہی بحث جنون بریلوی کے نام ۲۸ اگست ۱۸۵۹ء کے خط میں کی ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ سرور کے نام زیرِ نظر خط بھی قریبی زمانے میں لکھا گیا ہے۔

۴۔ اردوئے معلیٰ "اب" ندارد۔

ص ۶۰۳

۱۔ عوداول ودوم "ہوں" ندارد۔

۲۔ عوداول "سکا" ندارد۔

۳۔ اردوئے معلیٰ، عوداول "اعضائے"۔

۴ - اردوے معلّٰی "معہذا کیوں کیوں ؟" ندارد ۔ عود اول "کہنڈ کیوں کہوں ؟" عود دوم "مہند کیوں کیوں ؟"

۵ - اردوے معلّٰی، عود اول "یہاں سے .... طرف ہے" ندارد ۔

۶ - اردوے معلّٰی "حال کچھ معلوم نہیں ۔"

۷ - اردوے معلّٰی "کرگے"

۸ - اردوے معلّٰی "ظاہر" ندارد ۔

۹ - عود اول و دوم "منگاتے ۔"

۱۰ - اردوے معلّٰی، عود اول "کوئی" ندارد ۔

ص ۶۰۴

۱ - عود دوم "برج حمل" ۔

۲ - اردوے معلّٰی، عود اول دوم "دونو"

۳ - عود اول و دوم "روز شب" ۔

۴ - عود اول و دوم "گراپ" ۔

۵ - عود اول و دوم "ہیں" بجاے "میں نے"

ص ۶۰۵

۱ - عود اول و دوم "و" ندارد ۔

۲ - خط پر تاریخ تحریر نہیں ۔ سکے اور "دلی اردو اخبار" کے بارے میں غالب نے یوسف مرزا اور سرور کو جون ۱۸۵۹ء سے لکھنا شروع کیا ہے ۔ اس خط میں بھی ذکر ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط جون ۱۸۵۹ء کے کئی مہینے بعد لکھا گیا ۔ اس خط میں غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "نواب گورنر جنرل بہادر یہاں آتے ہیں ۔ بالکل یہی بات انھوں نے نواب یوسف علی خاں ناظم کو، ۷ نومبر ۱۸۵۹ء کے خط میں لکھی تھی ۔ اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ یہ خط اکتوبر یا نومبر ۱۸۵۹ء میں لکھا گیا ہوگا ۔

۳ - عود اول "مطاتو" ۔

۴ - عود اول و دوم "مطالق" ۔

ص ۶۰۶

۱۔ شیخ صاحب سے مراد عطا حسین عطا ہے۔

۲۔ اردوے معلٰی "یہی" بجائے "یہ ہے"۔

۳۔ اردوے معلٰی، عود اول "نشاط" ندارد۔

۴۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالب نے خط کے شروع میں سرور کے ایک خط کی ہجری اور عیسوی تاریخیں لکھی ہیں لیکن سنین نہیں لکھے۔ تقویم کی رُو سے یہ ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۶۰ء ہے۔ غالب نے خود خط میں لکھا ہے کہ یہ آخر اپریل ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آخر اپریل ۱۸۶۰ء میں خط لکھا گیا ہوگا۔

۵۔ عود اول "نہ" ندارد۔

ص ۶۰۷

۱۔ اردوے معلٰی "اسٹامپ" ندار۔

۲۔ اردوے معلٰی "ہو"۔

۳۔ عود اول ودوم "بازار نامی"۔

۴۔ عود اول ودوم "کہ کہاں تھے"۔ ندارد۔

۵۔ اردوے معلٰی "سیر" ندارد۔

۶۔ عود اول ودوم "اساڑھ"۔

۷۔ عود اول دوم "رفعات"۔

ص ۶۰۸

۱۔ عود اول ودوم "کہیں"۔

۲۔ اردوے معلٰی "یہ خلافِ واقعہ کسی نے"۔

۳۔ عود اول "کیسی" ندارد۔ عود دوم "کیا" بجائے "کیسی"۔

ص ۶۰۹

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالب نے اپنی پنشن کے بارے میں جو تفصیلات بیان کی ہیں اُن سے

اندازہ ہوتا ہے کہ زیرِ نظر خط ستمبر ۱۸۶۰ء میں لکھا گیا ہوگا۔

۲۔ عود اول "دنوں"۔

۳۔ عود اول و دوم "خارج از مبحث" "از" ندارد۔

۴۔ اردوئے معلّیٰ "کے" ندارد۔

۵۔ اردوئے معلّیٰ "یہ" بجائے "نہ"

ص ۶۱۰

۱۔ عود اول و دوم "طالع" ندارد۔

۲۔ اردوئے معلّیٰ "میں" ندارد۔

۳۔ عود اول و دوم "قدرت"

۴۔ عود اول "پیشگی" بجائے "پیش کیے"

۵۔ عود اول و دوم "کر" ندارد۔

۶۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے اس خط میں لکھا ہے کہ "منشی نبی بخش۔۔۔۔ ماہِ گذشتہ میں گزر گئے" منشی صاحب کا انتقال اکتوبر ۱۸۶۰ء میں ہوا تھا۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ زیرِ نظر خط نومبر ۱۸۶۰ء میں لکھا گیا ہوگا۔ ص ۶۱۱ ــ ۱۔ اردوئے معلّیٰ "آتا"۔

ص ۶۱۲

۱۔ عود اول و دوم "گرد"۔

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے لکھا ہے کہ "قاطعِ برہان" اول جولائی میں اُن کے پاس پہنچے گی۔ "قاطعِ برہان" ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ زیرِ نظر خط جولائی ۱۸۶۲ء سے کچھ قبل اور غالباً جون ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا ہے۔

ص ۶۱۳

۱۔ عود اول و دوم "محلات درا عات"

۲۔ عود اول "لفتِ پا"

۳۔ عود اول "جز" اردوئے معلّیٰ "جزوی"

۴۔ عود اول و دوم "اشعار کو۔"

۵۔ عود اول و دوم "اور" ندارد۔

۶۔ عود اول و دوم "اور" ندارد۔

۷۔ اردوے معلّٰی "میزان یہ ہے" ندارد۔

۸۔ اردوے معلّٰی، عود اول و دوم "سنائی۔"

۹۔ اردوے معلّٰی "سعدی ..... متعدد نہیں" ندارد۔

۱۰۔ عود اول و دوم "لایا" ندارد۔

۱۱۔ عود اول "بھی" بجائے "نے"۔ عود دوم "بھی" زائد۔

۱۲۔ عود اول و دوم "چرچا۔"

ص ۶۱۴

۱۔ عود اول و دوم "فعالی"

۲۔ عود اول و دوم "یہ طرز۔"

۳۔ عود اول "اگر" اردوے معلّٰی "بہ چیز دگر۔"

۴۔ عود اول و دوم "پارسیوں کے حصے میں آتی ہے۔"

۵۔ عود اول و دوم۔ مرتضیٰ۔

ص ۶۱۵

۱۔ عود اول و دوم "اب تجھ۔"

۲۔ عود اول و دوم "بھی" ندارد۔

۳۔ عود اول "ناسخ کے یاں کمتر آتش کے ہاں بیشتر۔" عود دوم ناسخ کے یاں کمتر آتش کے یاں بیشتر۔"

۴۔ عود اول و دوم۔ "آپ کا۔"

۵۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب کے جسم پر پھوڑے ۱۸۶۲ء میں ہوئے تھے۔ جولائی ۱۸۶۳ء میں بائیں پاؤں پر پھوڑے کی وجہ سے ورم ہو گیا۔ غالب نے ۱۳ جولائی ۱۸۶۳ء کے خط میں مرزا

ہر گوپال تفتہ کو لکھا تھا: " بائیں پاؤں میں مہینا بھر سے ورم ہے" اور اس ورم کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ یہی تمام باتیں غالب نے سرور کو لکھی ہیں۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ غالب نے یہ خط ۱۸۶۳ء میں لکھا ہوگا۔

۶۔ عود اول و دوم " چرتے "۔

۷۔ عود اول و دوم " بائیں پاؤں پر ورم "۔

۸۔ اردوے معلیٰ، عود اول " تک " ندارد۔

ص ۶۱۶

۱۔ عود اول " سلام " ندارد۔

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں جس بیماری کا ذکر کیا ہے اُس کا آغاز رجب ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں سیدھے ہاتھ پر ایک پھوڑے سے ہوا تھا۔ اس خط میں غالب کہتے ہیں کہ برس دن سے فسادِ خون کے عوارض میں مبتلا ہوں۔" جس کا مطلب ہے کہ یہ خط دسمبر ۱۸۶۳ء میں لکھا گیا ہوگا۔

۳۔ عود دوم " مایہ "۔

۴۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں اپنی بیماری کا حال جن الفاظ میں بیان کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط اواخر دسمبر ۱۸۶۳ء یا جنوری ۱۸۶۴ء میں لکھا گیا ہوگا۔ (ملاحظہ ہوں سرور کے نام خطوط نمبر ۱۹ اور ۲۰)

ص ۶۱۷

۱۔ چودھری عبدالغفور سرور کے ایک عزیز حبیب انور زبیری کے پاس سرور کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نعتیہ قصیدہ اور آٹھ نو قطعات ہیں۔ انہی صفحات کے ایک گوشے پر یہ خط بھی غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر مختارالدین احمد نے پہلی بار اس خط کا عکس 'آجکل' (دہلی، فروری ۱۹۵۵ء) میں شائع کیا تھا۔ بعد میں یہ خط غالب کی نادر تحریریں اور نقوش (مکاتیب نمبر جلد ۱، ص ۱۰۵) میں بھی شائع ہوا۔

ص ۶۱۸

۱۔ اردوے معلیٰ " کے " ندارد۔

۲۔ عود اول "خلعت"

۳۔ اردوے معلّیٰ "اب پیر و مرشد۔۔۔ خطاب ہے۔" ندارد۔

۴۔ اردوے معلّیٰ "بھر"۔

۵۔ اردوے معلّیٰ "کھاتا" ندارد۔

ص ۶۱۹

۱۔ اردوے معلّیٰ "اب" ندارد ۲۔ عود دوم "سقر"۔

۳۔ اردوے معلّیٰ، عود اول "ہوتا"۔

ص ۶۲۰

۱۔ اردوے معلّیٰ "تمھارا"۔

۲۔ عود اول و دوم "لگا لیا"۔

۳۔ عود اول و دوم "تیری تعریف بہت کرتے رہتے ہیں"۔ ۴۔ عود دوم "ہے۔"

ص ۶۲۱

۱۔ عود اول و دوم "یک طرف"۔

۲۔ عود دوم "تمھارے"۔

۳۔ اردوے معلّیٰ "جناب ممتاز علی خاں۔۔۔۔ میرا سلام" ندارد۔

ص ۶۲۲

۱۔ عود اول "وہ جو"۔

ص ۶۲۳

۱۔ غالب نے خط میں صرف ہجری تاریخ لکھی ہے۔

ص ۶۲۵

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے ۲۱ دسمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں حکیم غلام نجف خاں کو لکھا تھا کہ شیر زماں خاں نے مجھے آگرے سے خط لکھا۔ اس خط میں غالب نے لکھا ہے کہ شیر زماں خاں نے میرے خط میں تم کو بندگی لکھی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں خطوط قریبی زمانے میں لکھے گئے۔

اگرچہ یہ امر یقینی نہیں۔

۲۔ حکیم صاحب سے مراد حکیم احسن اللہ خاں ہے۔

۳۔ اردوئے معلیٰ "۱۸۴۷ء"۔ اردوئے معلیٰ میں "یکم مئی" چھپا ہے، جب کہ تقویم کی رو سے یہ یکم اپریل ہے۔

ص ٦٢٦

۱۔ اردوئے معلیٰ "تامل"۔

۲۔ اردوئے معلیٰ "ہوگا"۔

ص ٦٢٧

۱۔ اردوئے معلیٰ "لکھو"۔

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں اپنی عمر باسٹھ سال لکھی ہے۔ اس حساب سے یہ خط ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷-۵۸ء میں لکھا گیا۔ امکان یہ ہے کہ ۱۸۵۸ء کے اوائل میں لکھا گیا۔

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ خط میں غالب نے لکھا ہے کہ: "باہر نکلنا بے ٹکٹ ممکن نہیں۔" ۷ فروری ۱۸۵۸ء کے خط میں غالب نے مجروح کو لکھا تھا: "اگر آؤ تو بے ٹکٹ کے نہ آنا۔ اس کا مطلب ہے کہ اسی زمانے میں ٹکٹ جاری ہوئے تھے۔ اس لیے یہ خط فروری یا مارچ ۱۸۵۸ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ٦٢٨

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے پنشن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مگر پندرہ مہینے پچھلے ملتے نظر نہیں آتے۔" پنشن مئی ۱۸۵۷ء میں بند ہوئی تھی۔ اس حساب سے یہ خط اگست ۱۸۵۸ء میں لکھا گیا ہے۔

۲۔ اردوئے معلیٰ "دیں"۔

۳۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے اگست ۱۸۵۸ء کے خط میں الور کے حادثے کے بارے میں دریافت کیا ہے۔ اس خط میں الور کا ذکر ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ خط اگست کے اواخر یا مئی ۱۸۵۹ء کے اوائل میں لکھا گیا ہے۔

ص ۶۲۹

۱۔ خط پر دن اور تاریخ تو ہے سنہ نہیں۔ یہ ۱۸۶۱ء ہے۔ کیوں کہ غالب نے خط میں رام پور کے اس سفر کا ذکر کیا ہے جس کے لیے وہ دہلی ۱۹ جنوری ۱۸۶۱ء کو روانہ ہوتے تھے۔

۲۔ اردوے معلیٰ "پوست"

ص ۶۳۱

۱۔ اردوے معلیٰ" کی" ندارد۔

ص ۶۳۳

۱۔ اردوے معلیٰ "ایسی"

۲۔ اردوے معلیٰ "معصل"

۳۔ غالب نے تاریخ تحریر میں سنین نہیں لکھے۔ تقویم کی رو سے یہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۵ء ہے۔

ص ۶۳۴

۱۔ غالب نے تاریخ تحریر نہیں لکھی۔ غالب نے مکان کی تبدیلی کا ذکر کیا ہے۔ یہ واقعہ ستمبر ۱۸۶۵ء کا ہے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: اردوے معلیٰ دہلی یونیورسٹی، غالب نمبر ۱، ص ۸۸۔

۲۔ خط میں تاریخ تحریر نہیں لکھی۔ غالب نے خط میں ہجری اور عیسوی تاریخیں لکھی ہیں لیکن سنین نہیں لکھے۔ خط میں رام پور کے جس سفر کا ذکر ہے، اس کے لیے غالب ۷ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو دہلی سے روانہ ہوئے تھے۔ اس لیے یہ خط ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا۔

ص ۶۳۵

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے لکھا ہے کہ ۴ جمادی الثانی کی اور ۲۴ اکتوبر کی ہے۔ تقویم کی رو سے یہ ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۵ء ہے۔ البتہ تقویم کی رو سے ہجری اور عیسوی تاریخ میں ایک دن کا فرق ہے۔

ص ۶۳۷

۱۔ اردوے معلیٰ "۱۸ء" بجائے "۱۸۶۵ء"۔

۲۔ اردوے معلیٰ "ایسے"

ص ۶۳۹

۱۔ عود اول "خط ہی باکرامت ہے"۔ عود دوم "یہ خط بھی باکرامت ہے"۔

۲۔ اردوے معلّٰی "حجت"۔

۳۔ عود دوم "تو امیر"۔

۴۔ عود اول و عود دوم "چھٹویں"۔

۵۔ عود اول و عود دوم "کر رہا ہوں"۔

۶۔ عود اول و دوم "والی"۔

۷۔ عود اول و دوم "والی"۔

۸۔ اردوے معلّٰی "چیف ندارد۔

۹۔ عود دوم "نہ" ندارد۔

۱۰۔ عود اول "امر آخری" عود دوم "امر آخر ہے"۔

۱۱۔ اردوے معلّٰی "اب"۔

ص ۶۴۰

۱۔ عود اول "خطوں" ندارد۔

۲۔ عود دوم "حرت" بجائے "صرت"۔

۳۔ عود دوم "پائیں گے"۔ "گے" زائد۔

۴۔ عود اول و دوم "مجھ کو" ندارد۔

۵۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں لکھا ہے کہ ۲۸ نومبر کو پانچ دن پہلے پارسل اور خط بھیجے ہیں۔ اس حساب سے "۲ دسمبر" ہوا۔ غالب نے "دستنبو بھیجی" کا ذکر کیا ہے۔ "دستنبو" کا پہلا اڈیشن مطبع مفید خلائق سے نومبر ۱۸۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ خط ۲ دسمبر ۱۸۵۸ء کو لکھا گیا۔

۶۔ عود اول "واہ"۔

۷۔ اردوے معلّٰی "اس پارسل اور" ندارد۔

۸۔ اردوے معلّیٰ "کر کے"۔

۹۔ عود اول و عود دوم "سپارش"۔

ص

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ خط میں جن خطوط اور پارسلوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ ۲۸ نومبر ۱۸۵۵ء کو بھیجے گئے تھے۔ (ملاحظہ ہو بے تے خبر کے نام غالب کا خط مورخہ ۲ دسمبر ۱۸۵۵ء) اِس لیے یہ خط دسمبر ۱۸۵۵ء کے اوائل میں لکھا گیا ہوگا۔

۲-۳ عود اول و عود دوم "دونو"

۴۔ عود اول "کی" ندارد۔

۵۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے اُس "دستنبو" کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے ۲۸ نومبر کو پارسل کے ذریعے بھیجی تھی۔ اس لیے یہ خط اواخر دسمبر ۱۸۵۵ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۶۴۲

۱۔ عود اول و دوم "اور" عود اول "سے" ندارد۔

۲۔ عود اول "سے" ندارد۔

۳۔ اردوے معلّیٰ "بیس" بجائے "بیس بیس"۔

۴۔ عود اول و دوم "کدائیں"۔

ص ۶۴۳

۱۔ عود دوم "مرہ"۔

۲۔ عود دوم "سو" ندارد۔

۳۔ عود اول و دوم "پہنچی ہو"۔

۴۔ غالب نے تاریخِ تحریر خط کے شروع میں لکھی ہے۔

۵۔ غالب نے ۱۸۵۶ء میں ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں ایک قصیدہ کہا تھا اور لارڈ ایلن برا کی معرفت یہ قصیدہ بھیجا تھا۔ برطانیہ کے وزیر اعظم نے وصولیابی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا کہ اس قصیدے

کے بارے میں جو حکم جاری ہوگا، حکومتِ ہند کی جانب سے ہوگا۔ غالب ابھی صلے کا انتظار ہی کر رہے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا ناکام انقلاب ہوگیا۔

ص ۶۴۴۔ ۱۔ اردوئے معلّٰی "بھی" ندارد۔

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے لکھا ہے کہ "پنشن قدیم اکیس مہینے سے بند ہے۔ اور پھر خود غالب نے بیس جنوری کا ذکر کیا ہے۔ اگلے خط میں غالب نے لکھا ہے کہ انھوں نے ۳۰ جنوری کو خط لکھا تھا۔ غالباً یہی وہ خط ہے جو ۳۰ جنوری کو لکھا گیا۔

۳۔ اردوئے معلّٰی "ستائیس جنوری کو لکھ کر بھیج دیے، کیوں نہ کہوں"۔

۴۔ عود اول و دوم "کہوں کہ" "کہ" زائد۔

۵۔ اردوئے معلّٰی "۳۰"۔

۶۔ اردوئے معلّٰی "ڈاک میں خط"۔

۷۔ اردوئے معلّٰی "۳۱"۔

۸۔ اردوئے معلّٰی، عود اول و دوم "اڈ منسٹن"۔ ۹۔ اردوئے معلّٰی "یہ کہ"۔

۱۰۔ عود اول و دوم "جائے"۔

۱۱۔ اردوئے معلّٰی، عود اول "ایک" ندارد، عود دوم "ایک اور"۔

ص ۶۴۵

۱۔ اردوئے معلّٰی، عود اول "قیاساً"۔

۲۔ عود دوم "درلایت"۔

۳۔ عود اول و عود دوم "و"۔

۴۔ عود اول و دوم "نظر"۔

۵۔ عود اول و عود دوم "کرنا" بجائے "کرتا ہے"۔

۶۔ اردوئے معلّٰی "تو" ندارد۔

۷۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط کے آخری حصے میں لکھا ہے "کل کا بھیجا ہوا خط اور یہ آج کا خط الخ.... اس فقرے میں ۳۰ جنوری والے خط کا ذکر معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے یہ خط ۳۱ جنوری کو لکھا گیا ہوگا۔

ص ۶۴۶

۱۔ عودِ اول "خلعت پر" "پر" زائد۔

۲۔ عودِ اول و عودِ دوم "لا معلوم۔"

۳۔ عودِ اول و عودِ دوم "بھیجی۔"

۴۔ عودِ اول و دوم "کھلتی ہوئی"

۵۔ عودِ اول و عودِ دوم "ہوں" ندارد۔

۶۔ اردوئے معلّٰی "استفتا" ندارد۔

۷۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے رام پور سے واپسی کا ذکر کیا ہے۔ غالب ۲۴ مارچ ۱۸۶۶ء کو دلّی واپس آئے تھے۔ اس لیے ممکن ہے کہ یہ خط اسی مہینے کے آخر میں لکھا گیا ہو۔

ص ۶۴۷

۱۔ خواجہ غلام غوث خاں بے خبر نے غالب کے خطوط جمع کیے تھے تاکہ انھیں ترتیب دے کر شائع کریں۔ اس مجموعے کا نام مہرِ غالب رکھا گیا۔ بے خبر چاہتے تھے کہ خطوط کے اس مجموعے پر غالب دیباچہ لکھیں لیکن بیماری اور ضعف کی وجہ سے غالب نے دیباچہ نہیں لکھا۔

۲۔ عودِ دوم "اور" ندارد۔

۳۔ عودِ دوم "کتے" بجائے "کہتے"

ص ۶۴۸

۱۔ اس خط میں "نامراد" اور "بے مراد" پر بحث کی گئی ہے۔ غالب نے صاحبِ عالم مارہروی کے نام خط میں بھی ان الفاظ پر گفتگو کی ہے۔ مگر اُس خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ تفتہ کے نام خط (مورخہ ۲۷ اگست ۱۸۶۲ء) میں غالب لکھتے ہیں: "وہ گھا گھس الو عبدالواسع ہانسوی لفظِ "نامراد" کو غلط کہتا ہے۔" اس سے قیاس ہوتا ہے کہ بے خبر کے نام یہ خط بھی تقریباً اس زمانے میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۶۴۹

۱۔ عودِ دوم "علیہ الرحمۃ" ندارد۔

۲ - عوداول و عود دوم "بیگالی" بجائے "بنگالی"۔

۳- عود دوم "کہتے"۔

۴ - بےؔ خبر کے نام ۹ میں بھی دیباچہ کا ذکر ہے۔ اس لیے یہ خط بھی ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۶۵۰

۱ - عوداول و دوم "می دانیم ما" غالباً پہلی بار مولانا غلام رسول مہرؔ نے ہماری توجہ اس طرف مبذول کی ہے کہ عاصی کی جس غزل کا یہ شعر ہے، اس کی ردیف "می سازیم ما" ہے اس لیے غالبؔ سے یا کاتب سے سہوا ہوا ہے۔

ص ۶۵۱

۱ - عود دوم "ہیں"۔

۲ - خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں غالبؔ نے "خرابہ اور خراب" پر بحث کی ہے۔ یہی بحث شیفتہؔ کے نام ایک خط (مورخہ ۱۱ مارچ ۱۸۶۲ء) میں کی گئی ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ خط بھی اسی سال میں لکھا گیا ہوگا۔

۳ - عوداول "وہ" ندارد۔

ص ۶۵۲

۱ - عود دوم "جو" بجائے "جواب"۔

۲ - اس عبارت کے بعد بےؔ خبر کا حاشیہ ہے، جو غلطی سے عوداول کے متن میں شامل ہو گیا ہے۔ البتہ عود دوم میں حاشیے میں ہے۔

۳ - خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالبؔ نے انہی الفاظ پر بےؔ خبر کے نام ۱۸۶۲ء کے خط میں بحث ہے۔ اس لیے یہ خط بھی اسی زمانے میں لکھا گیا ہوگا۔

۴ - عود دوم "آپ"۔

ص ۶۵۳

۱ - عود دوم "شہر"۔

۲ - عود دوم "غم"۔

۳۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ چوں کہ خط میں انھی مطالب کا بیان ہے، جو ۱۸۶۲ء کے دوسرے خطوط میں ہیں، اِس لیے یہ خط بھی ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۶۵۴

۱۔ عود اول و دوم "محل"۔

۲۔ عود اول "اور" ندارد۔

۳۔ عود اول و دوم "خودستائی"۔

۴۔ عود اول "سے" بجائے "ہے"۔

۵۔ عود دوم "کلا"۔

ص ۶۵۵

۱۔ عود اول و دوم "ایں جابہ" بجائے "ایں خانہ"۔

۲۔ یہ قرات "می سازیم ما" کیوں کہ غالب کی غزل کی ردیف "می سازیم ما" ہے۔

۳۔ عود اول "نہ گرازد" عود دوم "نہ گرارد"۔

۴۔ عود اول "خان"۔

۵۔ عود اول "دونو"۔

۶۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے اس خط میں جن الفاظ پر گفتگو کی ہے، انھی الفاظ پر بے خبر کے نام ۱۸۶۳ء کے دوسرے خطوط میں بھی بحث کی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط بھی ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا ہوگا۔ ۷۔ عود اول و دوم میں مصرعوں کی ترتیب بدلی ہوئی ہے۔ ۸۔ عود دوم "کے"۔

ص ۶۵۶

۱۔ اردوے معلٰی "اور آخر" عود دوم "آخر"۔

۲۔ عود اول "کے" ندارد۔

۳۔ اردوے معلٰی۔ عود اول "گورنری"۔

۴۔ عود اول و دوم "معرفت"۔

۵۔ عود اول "حسام"۔

۶۔ عود اول "یہ"۔

۷۔ اردوے معلّٰی "دن بعد" "بعد" زائد۔

ص ۶۵۷

۱۔ اردوے معلّٰی "کہ" ندارد۔

۲۔ اردوے معلّٰی "میں" ندارد۔

۳۔ غالب کا یہ بیان کہ "اب انبالے کہاں جاؤں؟ جیتا رہا تو اور دربار میں کامیاب ہو رہوں گا" درست نہیں ہے۔ لفٹنٹ گورنر نے غالب کو خلعت دیا تو غالب نے پوچھا "میں انبالے جاؤں"۔ جواب ملا: "البتہ انبالے جانا ہوگا"۔ گویا خود غالب نے انبالے جانے کی خواہش کی تھی۔ جب اجازت مل گئی تو انھوں نے نواب یوسف علی خاں ناظم کو خط لکھ کر سفر کے اخراجات کی درخواست کی۔ نواب صاحب نے ۱۱ مارچ ۱۸۶۳ء کو دو سو روپے کی ہنڈوی بھیج دی۔ غالب نے انبالے جانے کی پوری تیاری کر لی۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کو ۴ مارچ ۱۸۶۳ء کے خط میں لکھا: "جیتا رہا تو انبالے سے آکر خط لکھوں گا"۔ اور پھر ۱۲ مارچ ۱۸۶۳ء کو نواب رام پور کو لکھا "دو سو میں سے سو لے کر ساز و سامان درست کیا ہے اور سو مہاجن کے ہاں ڈاک اور خرچ راہ کے واسطے رہنے دیے ہیں"۔ اس دوران میں "شہر میں شہرت ہوئی کہ دلّی کے لوگ انبالے جانے سے ممنوع ہیں"۔ غالب نے اس خبر کی اطلاع دیتے ہوئے نواب رام پور کو لکھا: "تار برقی میں جناب نواب صاحب سے حکم منگواؤں گا، جو حکم آئے گا آپ سے عرض کر کے اُس کی تعمیل کروں گا"۔ اس خط کا جواب دیتے ہوئے نواب صاحب نے غالب کو رائے دی کہ اُن کا رام پور جانا مناسب نہیں ہے۔ اِس سلسلے میں نواب صاحب نے غالب کو لکھا: "اُس واسطے تشریف لے جانا آپ کا انبالے کو بلا استجازت ضرور معلوم نہیں ہوتا۔ آیندہ جو رائے زریں آپ کی اِس خصوص میں مقتضی ہو"۔ غالب اس دربار میں شریک نہ ہوئے۔ اصل وجہ کیا تھی یہ بتانا مشکل ہے۔ غالب نے میر سرفراز حسین کو ۲۷ مارچ ۱۸۶۳ء کو لکھا: "رجب کے مہینے میں سیدھے ہاتھ پر ایک پھنسی ہوئی۔ پھنسی پھوڑا ہو گئی۔ پھوڑا پھوٹ کر زخم بنا۔ زخم بگڑ کر غار ہو گیا۔ اب یہ قدر ایک کفِ دست وہ گوشت مردار ہو گیا۔ انبالے نہ جانے کی بھی یہی وجہ ہوئی۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہوں: خط بہ نام مرزا ہرگوپال تفتہ، مورخہ ۴ مارچ ۱۸۶۳ء۔ خط بہ نام نواب یوسف علی خاں ناظم،

مورخہ ۱۶ مارچ ۱۸۶۳ء خط بہ نام میر سرفراز حسین مورخہ ۲۷ مارچ ۱۸۶۳ء۔

۴- خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں انبالے کے دربار کا ذکر اس انداز سے کیا ہے جیسے اس واقعے کو زیادہ دن نہیں ہوئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط مارچ ۱۸۶۳ء میں لکھا گیا۔

۵- منشی شیونرائن آرام اور منشی ہرگوپال تفتہ کو سب سے پہلے غالب کے خطوط کا مجموعہ مرتب کرنے کا خیال آیا تھا۔ نومبر ۱۸۵۸ء میں آرام اور تفتہ نے خطوط لکھ کر غالب سے اُن کے خطوط مرتب کرنے کی اجازت مانگی۔ غالب نے منع کر دیا۔ غالب کا خیال تھا کہ "کوئی خط ایسا ہوگا کہ جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔" (خط بنام منشی شیونرائن آرام) غالب نے کچھ اس لب و لہجے میں منع کیا کہ ان دونوں کو اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ دو سال بعد خواجہ عبدالغفور سرور اور منشی ممتاز علی خاں نے غالب کے خطوط مرتب کرنے شروع کیے اور غالب سے اجازت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اس مجموعے کا نام "مہر غالب" رکھا گیا۔ ابھی یہ دونوں خطوط جمع کر رہے تھے، معلوم ہوا کہ منشی غلام غوث خاں بے خبر غالب کی ایما سے اُن کے خطوط کا مجموعہ مرتب کر رہے ہیں۔ بے خبر نے ۱۸۶۱ء میں کام شروع کیا۔ خواجہ عبدالغفور سرور اور منشی ممتاز علی خاں اس سے کچھ قبل یہ کام شروع کر چکے تھے۔ لیکن بہت عرصے تک طباعت کی منزل نہیں آئی۔ بے خبر کو محسوس ہوا کہ وہ یہ کام مکمل نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے انھوں نے اپنے مرتب کیے ہوئے خطوط بھی منشی ممتاز علی خاں کو دے دیے۔ اس مجموعے کا نام "عود ہندی" رکھا گیا۔ ادھر جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ غالب کے اردو خطوط شائع ہو رہے ہیں تو انھوں نے غالب سے تقاضے شروع کیے۔ غالب اس غیر معمولی تاخیر سے تنگ آ چکے تھے۔ اس لیے جب دلّی کے کچھ احباب نے ایک نیا مجموعہ مرتب کرنا چاہا تو غالب نے نہ صرف اجازت دے دی بلکہ اُس کے لیے خود خطوط جمع کرنے لگے۔ انھوں نے بے خبر کو لکھا کہ وہ اپنے جمع کیے ہوئے خطوط بھیج دیں۔ علائی سے اُن کے نام کے لکھے ہوئے خطوط مانگے۔ اس طرح یہ نیا مجموعہ مرتب ہو گیا۔ اس کا نام "اردوے معلّیٰ" رکھا گیا۔ "عود ہندی" ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو "اردوے معلّیٰ" ۶ مارچ ۱۸۶۹ء کو شائع ہوئی۔

۶- خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے بے خبر سے اپنے خطوط یا اُن کی نقلیں مانگی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ "اردوے معلّیٰ" کے لیے منگے گئے ہیں۔ اسی مجموعے کے لیے غالب نے ۱۸۶۳ء میں نواب علاؤالدین

احمد خاں علائی سے خطوط مانگے تھے اور ۳۰ مئی ۱۸۶۳ء کے خط میں ان خطوط کی وصولیابی کی اطلاع ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ بے خبر کے نام یہ خط بھی ۱۸۶۳ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۶۵۸

۱۔ عود اول و دوم "آرزو کی"۔

۲۔ عود اول "گا" ندارد۔

۳۔ عود اول "ہے" عود دوم "کی"۔

۴۔ عود دوم "فتح" ندارد۔ عود اول "جدید" ندارد

۵۔ عود اول "جدید" ندارد۔ عود دوم "فتح" ندارد۔

۶۔ عود اول و دوم "الجن"۔

۷۔ امیر کبیر سے مراد لارڈ جان لارنس ہے۔

۸۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں لکھا ہے۔ "آج سات مارچ کی ہے" اور ایک سطر پہلے لکھا ہے "۱۳ فروری ۱۸۶۴ء حال کو قصیدہ مع عرضداشت ارسال کیا۔ اس لیے گمان ہوتا ہے کہ یہ خط ۷ مارچ ۱۸۶۴ء کو لکھا گیا۔

ص ۶۵۹

۱۔ عود اول "تکال"۔

۲۔ محمد حبیب اللہ ذکا نے غالب کو لکھا تھا کہ: "(مولوی غلام امام شہید) کے بیان کے مطابق منشی غلام غوث بے خبر اُن کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور آج کل "قاطع برہان" کا رد لکھنے میں مصروف ہوں"۔

۳۔ مولوی نجف علی کے اس رسالے کا نام "دافع ہذیان" ہے۔ یہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۵ء میں اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوا تھا۔

۴۔ عود اول و عود دوم "مختصر"۔

۵۔ اردوئے معلی "یہ فتح ایے"۔

۶۔ عود دوم "کے" ندارد۔

۷۔ اردوے معلّیٰ "مسلمان"۔

۸۔ عودِ اول و دوم "کی" ندارد۔

۹۔ عودِ دوم "ہوں" ندارد۔

۱۰۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالبؔ نے سوالاتِ عبدالکریم اور مولوی نجف علی کی "دافعِ ہذیان" کا ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں ۱۲۸۱ھ ۱۸۶۴-۱۸۶۵ء میں شائع ہوئی تھیں۔ غالبؔ نے "دافعِ ہذیان" "سوالاتِ عبدالکریم" اور لطائفِ غیبی" کا ایک پارسل محمد حبیب اللہ ذکاؔ کو بھیجا تھا۔ اس پارسل کا ذکر اور ان کتابوں کی تفصیلات غالبؔ نے ذکاؔ کے نام خط مورخہ ۲۸ نومبر ۱۸۶۴ء میں لکھی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بے خبرؔ کے نام یہ خط اکتوبر، نومبر ۱۸۶۴ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۶۶۰

۱۔ اردوے معلّیٰ "ہے" ندارد۔

۲۔ عودِ اول و دوم "ہوں" ندارد۔

۳۔ عودِ دوم "زمزمہ"۔

۴۔ اردوے معلّیٰ "سلمہ اللہ تعالیٰ"

۵۔ عودِ اول و دوم "کو" ندارد۔

۶۔ عودِ دوم "مجھے نہ" بجاے "نہ مجھے"۔

۷۔ اردوے معلّیٰ، عودِ اول "میں" ندارد۔

۸۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ اس خط کے مطالب وہی ہیں جو اکتوبر و نومبر ۱۸۶۴ء کے خط میں بیان ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ خط بھی اسی زمانے میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۶۶۱

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالبؔ نے خط میں لکھا ہے: "ہاں حضرت، وہ مجموعہ چھپے گا بالفتح یا چُھپے گا بالضم۔ یہی بات ۷ مارچ ۱۸۶۴ء کے خط میں اس طرح لکھی تھی: "وہ مجموعۂ اردو چھپے یا چُھپا ہی رہے گا۔" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط ۱۸۶۴ء میں لکھا گیا ہوگا۔

۲۔ اردوے معلّیٰ "آئندہ"۔

۳ ۔ عود اول "ہر"۔

ص ۶۶۲

۱ ۔ اردوئے معلّیٰ "دی ہے" "ہے" زائد ۔

۲ ۔ اردوئے معلّیٰ "ہے ۔"

۳ ۔ عود اول و دوم میں قصیدہ اور غزل دونوں نقل ہوئے ہیں لیکن اردوئے معلّیٰ میں یہ خط یہیں ختم ہو جاتا ہے۔

۴ ۔ عود اول و دوم "فقلاے"۔

۵ ۔ عود اول و دوم "مشاہراہ ۔"

ص ۶۶۳

۱ ۔ عود اول "حنجان"۔

۲ ۔ " ظہور"۔

۳ ۔ عود اول "ز" عود دوم "و" ندارد ۔

۴ ۔ عود اول و دوم "گرہ"۔

۵ ۔ عود اول "یار"

۶ ۔ عود اول "زیرند" عود دوم "زبرند"۔

۷ ۔ عود اول "لوے"۔

۸ ۔ عود دوم "میور"۔

۹ ۔ عود اول "زانوے"۔

ص ۶۶۴

۱ ۔ عود دوم "و" ندارد ۔

۲ ۔ عود اول "قر ون" عود دوم "قرون"۔

۳ ۔ عود اول دعائیم"

۴ ۔ عود اول "تیودے ۔"

ص ۶۶۵

۱ ۔ عود اول و دوم میں یہ مصرع اس طرح ہے "زکر دگار بود روز و شب بندہ قصور"۔ "مکاتیبِ غالب"

سے یہ قرأت درست کی گئی ہے۔

۲۔ عودِ دوم "خستگی"۔

۳۔ عودِ اول و دوم "بالتذہ"۔

۴۔ عودِ اول "چوں"۔

۵۔ عودِ دوم "آں کہ"۔

ص ۶۶۷

۱۔ خواجہ صاحب سے مراد خواجہ صدر الدین سے ہے۔ یہ بے خبر کے منجھلے ماموں تھے۔ بے خبر نے ان کی وفات کا ذکر حافظ نظام الدین کے نام خط میں کیا ہے۔ (فغانِ بے خبر ص ۴۷)

۱۔ عودِ اول و عودِ دوم "حدت"۔

۲۔ غالب نے خط میں بے خبر کی جس غزل کا ذکر کیا ہے، بے خبر نے "عودِ ہندی" میں خط کے آخر میں یہ غزل نقل کر دی ہے "اردوئے معلّٰی" میں یہ غزل نہیں ہے۔ چوں کہ غالب کے خط کا اس غزل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اِس لیے ہم نے بھی یہ غزل حذف کر دی ہے۔

۴۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے رام پور کے سفر کا ذکر کیا ہے۔ غالب ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو دِلّی پہنچے تھے اور چوں کہ غالب نے پرسوں دِلّی پہنچنے کا ذکر کیا ہے۔ اِس لیے یہ خط ۱۰ جنوری ۱۸۶۶ء کو لکھا گیا۔

۵۔ عودِ اول و دوم "ہمارے"۔

ص ۶۶۸

۱۔ عودِ اول و دوم "محبت"۔

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ یہ خط رام پور کے دوسرے سفر کی واپسی پر لکھا گیا ہے۔ غالب ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو دِلّی واپس آئے تھے۔ اِس لیے یہ خط جنوری کے وسط میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۶۶۹

۱۔ عودِ اول "طبع" ندارد۔ طبع دوم "ہیچ"۔

۲۔ عودِ اول "اُس"۔

۳۔ عود دوم "سی" ندارد۔

۴۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں دن اور تاریخ لکھی ہے، سنہ نہیں لکھا۔ تقویم کی رو سے یہ ۱۸۶۶ء ہے۔

۵۔ اردوے معلّیٰ "گر"۔

۶۔ عود اول و عود دوم "مفقود" بجاے "معدوم"۔

۷۔ عود اول "مقصود" عود دوم "مفقود"۔

۸۔ عود اول و عود دوم "بہت۔"

ص ۶۷۰

۱۔ اردوے معلّیٰ "یہ" ندارد۔

۲۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ بے خبر کے نام ۲۳ جولائی ۱۸۶۶ء کے خط میں غالب نے "بوستانِ خیال" کا تعارف کراتے ہوئے تحریداری کی فرمایش کی ہے۔ غالب نے ۲۲ مارچ ۱۸۶۶ء کے خط میں میر غلام بابا خاں سے بھی "بوستانِ خیال" کی تحریداری کی فرمایش کی ہے۔ اس خط میں بھی وہی ذکر ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ خط بھی اسی سال لکھا گیا ہوگا۔

۳۔ عود اول و دوم "کھوئی"۔

۴۔ یہاں مولوی صاحب سے غلام امام شہید مراد ہیں۔ غالب کو شہید سے کوئی ذاتی رنجش نہیں تھی لیکن پیشہ ورانہ حسد ضرور تھا۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ غالب نے نومبر ۱۸۶۱ء میں ایک قصیدہ کہہ کر مختار الملک کی خدمت میں حیدر آباد بھیجا تھا۔ یاد دہانی کے باوجود مختار الملک متوجہ نہ ہوئے۔ اس دوران نواب محی الدولہ محمد یار خاں نے ایک ہزار روپے بھیج کر غلام امام شہید کو حیدر آباد بلایا اور کچھ عرصے بعد مختار الملک کی سرکار سے ان کی چار سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کرادی۔ چوں کہ غالب کو خیال تھا کہ بے خبر شہید کی عزت کرتے ہیں اس لیے دروغِ مصلحت آمیز سے کام لے رہے ہیں، ورنہ انھوں نے ذکا اور غلام نجف خاں کے نام خطوط میں شہید کے بارے میں نامناسب باتیں لکھی ہیں۔

۵۔ عود اول و دوم "تھے" ندارد۔ عود اول و دوم اردوے معلّیٰ "ہوئی تھی" ندارد۔

۶۔ عود اول و دوم "فقط" ندارد۔

ص ۶۷۱

۱۔ عود دوم "کیا"۔

ص ۶۷۳

۱۔ اصل خط "گرٗھ پھنک"۔ ۲۔ اصل خط "چھ" ۳۔ اصل خط خط "ملو"۔

ص ۶۷۵

۱۔ اصل خط "آپ کو" "کو" ندارد۔

۲۔ اصل خط "اسی"

۳۔ اصل خط "نہ کی" صاف نہیں پڑھا جاتا۔ یہ قیاسی تصحیح ہے۔

ص ۶۷۶

۱۔ اصل خط "نے" ندارد۔

ص ۶۷۷

۱۔ اصل خط "اسطبل"۔

۲۔ اصل خط "نکاہ"۔

۳۔ غالب نے تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے اور ہجری و عیسوی سنین نہیں لکھے۔ تقویم کی رو سے ۱۲۷۶ھ ہجری اور ۱۸۵۹ء ہے۔

ص ۶۷۸

۱۔ خط میں تاریخِ تحریر میں سنہ نہیں لکھا۔ خط میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، وہ ۱۸۵۹ء کے ہیں۔ اور تقویم کی رو سے ۲۹ اکتوبر کو شنبہ ۱۸۵۹ء میں تھا۔

ص ۶۷۹۔ ۱۔ یہ دراصل "ٹاؤن ڈیوٹی" یعنی چونگی ہے۔

ص ۶۸۰

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالب نے لکھا ہے کہ "آج بدھ کا دن نو نومبر کی" اور خط میں جو واقعات بیان کیے ہیں، وہ سب ۱۸۵۹ء کے ہیں۔ پھر تقویم کی رو سے ۱۸۵۹ء میں نو نومبر کو چہار شنبہ تھا۔ اس لے

یہ خط چار شنبہ، ۹ نومبر ۱۸۵۹ء کو لکھا گیا۔

ص ۶۸۱

۱۔ یہ اسی قصیدے کا ذکر ہے جو غالب نے امجد علی شاہ کی مدح میں کہا تھا اور بعد میں ممدوح کا نام بدل کر واجد علی شاہ کر دیا۔ غالب یہ قصیدہ لکھنؤ کے کچھ علما کے ذریعے واجد علی شاہ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے تھے۔

۲۔ مفتی صاحب سے مراد غالباً مفتی محمد عباس ہے۔

ص ۶۸۲

۱۔ اردوے معلّٰی "کوچ"۔

۲و۳۔ اردوے معلّٰی "المشتری"

ص ۶۸۳

۱۔ اردوے معلّٰی میں "سہ شنبہ" ہے، جب کہ ۳۱ دسمبر ۱۸۵۹ء کو "شنبہ" ہے۔

ص ۶۸۴

۱۔ اردوے معلّٰی "یوم الخمیس"۔

۲۔ غالب نے خط کے آخر میں صرف ہجری تاریخ لکھی ہے۔

ص ۶۸۵

۱۔ اردوے معلّٰی "سرک"۔

۲۔ اردوے معلّٰی "ڈیوڑھیوں۔"

۳۔ اردوے معلّٰی "ایک" ندارد۔

ص ۶۸۶

۱۔ اردوے معلّٰی "زمن"۔

۲۔ غلام حسین خاں غالب کی بیوی امراؤ بیگم کی بہن بنیادی بیگم کے شوہر تھے۔ بہت رنگین مزاج تھے انھوں نے سنجی جان نامی ایک اور خاتون سے شادی کر لی تھی۔ بنیادی بیگم اور اُن کے بطن سے پیدا ہونے والے بچوں کی طرف سے بہت لاپروا تھے۔ غالب کا اشارہ اسی طرف ہے۔

ص

۱۔ اردوئے معلّٰی "ہو" بجائے "ہوتا"۔

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالبؔ نے خط میں لکھا ہے "آج ۲۲ جون کی ہے"۔ لیکن سنہ نہیں لکھا۔ مہر اس کا سنہ تحریر ۱۸۶۱ء اور فاضل ۱۸۶۵ء بتاتے ہیں لیکن دونوں کوئی دلیل پیش نہیں کرتے۔ ۳۔ غالبؔ نے تاریخ تحریر ہجری میں لکھی ہے۔

ص ۶۹۰۔ ۱۔ اردوئے معلّٰی "ہو"۔

۱۔ غالبؔ نے تاریخ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

ص ۶۹۱

۱۔ پہلی بار یہ خط ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اردوئے معلّٰی (دہلی، غالبؔ نمبر، حصہ ۲) میں شائع کیا تھا۔ نارنگ صاحب نے لکھا ہے کہ یہ خط علاء الدین احمد خاں علائی کے نام خط مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۸۶۵ء کا آخری پیراگراف ہے۔ یہی خط ڈاکٹر مختار الدین احمد نے نقوش (مکاتیب نمبر، جلد ۱، ص ۱۰۷) میں شائع کرایا اور اس کے بارے میں لکھا کہ "اس رقعے پر مکتوب الیہ کا نام درج نہیں، لیکن قریب بہ یقین ہے کہ مرزا نے یہ رقعہ نواب امین الدین خاں کو لکھا ہو"۔ خط کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ نے یہ خط نواب امین الدین احمد خاں کے نام لکھا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ علائی ہی کے خط میں نواب امین الدین احمد خاں کو بھی لکھ دیا ہو۔ غالبؔ نے اکثر ایسا کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر نارنگ اور ڈاکٹر مختار الدین احمد نے نہ جانے کن مصلحتوں کے پیش نظر یہ نہیں بتایا کہ انھیں یہ خط کہاں سے ملا۔ مجھے شبہ ہوتا ہے کہ یہ خط مولوی مہیش پرشاد نے حاصل کیا تھا اور وہ اسے خطوطِ غالبؔ کی دوسری جلد میں شائع کرنا چاہتے تھے۔ اگر میرا قیاس درست ہے تو نواب امین الدین احمد خاں کے نام غالبؔ کا یہ خط علاحدہ تھا اور علائی کے نام خط کا حصہ نہیں تھا کیوں کہ علائی کے نام کے خطوط "خطوطِ غالبؔ" مرتبہ مولوی مہیش پرشاد میں شامل ہیں اور اُن خطوط میں یہ خط شامل نہیں ہے۔

ص ۶۹۳

۱۔ اردوئے معلّٰی "کہنے" بجائے "کونے"۔

ص ۶۹۴

۱۔ اردوئے معلّی "داا" بجائے "دادا"۔

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ مہیش، مہرؔ اور فاضل کا خیال ہے کہ یہ خط مارچ ۱۸۵۸ء میں لکھا گیا لیکن ان میں سے کسی نے دلائل پیش نہیں کیے۔ غالبؔ نے خط میں لکھا کہ کہیں جاگیر پر جلد جانے کی اجازت ہو جائے تاکہ سب یکجا باہم آرام سے رہو۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد برطانوی حکومت نے لوہارو ریاست ضبط کر لی تھی۔ اگست ۱۸۵۸ء میں جاگیر واگذار ہوئی۔ غالبؔ کا اشارہ اسی طرف ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط اگست ۱۸۵۸ء سے قبل لکھا گیا تھا۔

ص ۶۹۵۔ التقویم کی رو سے یہ "دوشنبہ" ہے۔ ص ۶۹۶۔ ۱-۲

ثاقبؔ کے نام غالبؔ کے اس خط کا عکس جناب کالی داس گپتا رضاؔ نے عنایت فرمایا ہے۔ غالبؔ نے ایک ہی کاغذ پر علائیؔ اور ثاقبؔ کے نام خطوط لکھے تھے۔ علائی کے نام خط پر تاریخ تحریر لکھی گئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ خط بھی اسی تاریخ کو لکھا گیا ہوگا۔

ص ۶۹۷

۱۔ اردوئے معلّی "پلکنوے"۔

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالبؔ نے خط میں رام پور کے دوسرے سفر کا ذکر کیا ہے۔ اس سفر پر وہ ۷ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو روانہ ہوئے تھے۔ میرے خیال سے غالبؔ ۸ اکتوبر کو ہاپوڑ تھے۔ اس لیے ۸ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو یہ خط لکھا گیا۔

ص ۶۹۸

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ ۵ ستمبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں غالبؔ نے سیّاحؔ کو قاضی کی ناراضگی کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ بظاہر یہ قاضی نورالدین فائقؔ کا ذکر ہے۔ اس لیے ثاقبؔ کے نام یہ خط ستمبر ۱۸۶۶ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۷۰۰

۱۔ عودِ اول "پونڈ"۔

۲۔ عودِ اول "سمجھیں سمجھیں" ایک "سمجھیں" زائد۔

۳۔ عود دوم "احسان ہی" "ہی" زائد۔

۴۔ عود اول "خط" ندارد۔ اردوے معلیٰ "وہ" ندارد۔

۵۔ عود دوم "آپ کو میں نے" بجائے "میں نے آپ کو"۔

۶۔ اردوے معلیٰ "بندہ نواز" ندارد۔ عود اول "بندہ" بجائے "بندہ نواز"۔

ص ۷۰۱

۱۔ عود اول و دوم "فارسی سے بھی پایہ خوبی میں کم نہیں"۔

۲۔ عود اول و دوم "گویا" ندارد۔

۳۔ عود اول و دوم "خط" ندارد۔

۴۔ اردوے معلیٰ "بھی حال"۔

۵۔ عود اول و دوم "روپیے" ندارد۔

۶۔ عود اول "نہیں" ندارد۔

۷۔ عود اول "کا" ندارد۔

۸۔ اِس خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں لکھا ہے: "خدا کرے وہ خط جس میں، میں نے آپ کو سلام لکھا تھا آپ کی نظر سے گزر گیا ہو۔ احیاناً اگر نہ دیکھا ہو تو اب مرزا تفتہ سے لے کر پڑھ لیجے گا۔ اور خط کے لکھنے کے احسان کو اُس خط کے پڑھ لینے سے دو بالا کیجے ..... جب آپ نے بغیر خط کے بھیجے، خط مجھ کو لکھا ہو تو کیوں کر مجھ کو اپنے خط کے جواب کی نہ تمنا ہو۔" اس عبارت سے دو باتوں کا اندازہ ہوتا ہے کہ (۱) غالب نے تفتہ کے خط میں مہر کو سلام لکھا ہے (۲) کچھ دن بعد غالب کو مہر کا خط موصول ہوا۔ تفتہ کے نام غالب کے خطوط میں مہر کا نام پہلی بار ۷ جون جولائی ۱۸۵۸ء کے خط میں آیا ہے جس میں غالب نے لکھا ہے: "مرزا حاتم علی صاحب مہر کی جناب میں میرا سلام کہنا۔ اور پھر ۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء کے خط میں غالب تفتہ کو لکھتے ہیں: "... حاتم علی صاحب مہر کا شفقت نامہ آیا۔ یہاں سے اُس کا جواب بھیجا گیا۔ وہاں سے اُس کا جواب آگیا۔" امکان یہی ہے کہ غالب زیرِ نظر خط کا ذکر کر رہے ہیں۔ اگر میرا قیاس درست ہے تو غالب نے مہر کے نام یہ خط جولائی ۱۸۵۸ء کے شروع میں لکھا ہے۔

ص ۷۰۲

۱۔ عود اول "اب۔"

۲۔ عود اول و دوم "وہ" ندارد۔

۳۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ مولوی مہیش نے ۵ مارچ ۱۸۵۵ء تجویز کی ہے لیکن کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ غالب نے اس خط میں تفتہ کے بارے میں لکھا ہے: "میں یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ (تفتہ) ان دنوں میں کہاں ہیں۔ آج تو کلت علی اللہ، سکندر آباد خط بھیجتا ہوں" ۶ مارچ ۱۸۵۵ء کے خط میں غالب نے لکھا ہے کہ: "کل میں نے تم کو سکندر آباد میں سمجھ کر خط بھیجا" اس سے احتمال ہوتا ہے کہ غالب نے مہر کے نام ۵ مارچ ۱۸۵۵ء کو خط لکھا اور غالباً اسی بنیاد پر مولوی مہیش نے بھی یہ تاریخ تجویز کی ہے۔ لیکن یہ تاریخ درست نہیں کیوں کہ مرزا حاتم علی مہر کے نام غالب کا پہلا خط اوائل جولائی ۱۸۵۵ء کا ہے۔ خط زیر بحث کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہر اور غالب کے درمیان کافی خط و کتابت ہو چکی ہے۔ اس لیے یہ خط جولائی ۱۸۵۵ء کے خاصے بعد کا ہے۔ کوئی ایسا اشارہ بھی نہیں ملتا جس سے تاریخ تحریر کا تعین کیا جا سکے۔

ص ۷۰۳

۱۔ عود اول و دوم "اخبار" ندارد۔

۲۔ عود دوم "ہی" بجائے "بھی"۔

۳۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ ۲۱ ستمبر ۱۸۵۵ء کے خط میں غالب نے مہر کو لکھا ہے "کل دوشنبے کا دن بیس ستمبر کی تھی۔ صبح کو میں نے آپ کو شکایت نامہ لکھا اور بیرنگ ڈاک میں بھیج دیا۔ دوپہر کو ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ تمھارا اور مرزا تفتہ کا خط لایا۔ اس لیے یہ خط ۲۰ ستمبر ۱۸۵۵ء کو لکھا گیا ہوگا۔

۴۔ عود اول "تصور"

۵۔ عود اول "اب"

۶۔ عود دوم "ہو جاوے گا"

ص ۷۰۴

۱۔ عود دوم "باب" ندارد۔

۲۔ عود اول "حیز"

۳۔ اردوئے معلیٰ "بہادر" ندارد۔

۴۔ ملکۂ معظمہ کی مدح میں قصیدے کے بارے میں تقریباً یہی باتیں غالب نے ۲۲ ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں منشی نبی بخش حقیر کو بھی لکھی تھیں۔ غالب نے دونوں کو لکھا ہے کہ انھوں نے یہ قصیدہ انہی دنوں میں کہا ہے، جو حقیقت نہیں۔ غالب نے یہ قصیدہ ۱۸۵۳ء میں بہادر شاہ ظفر کی طویل بیماری کے بعد غسلِ صحت کے موقع پر کہا تھا۔ اس قصیدے میں سے کچھ اشعار نکال کر اور کچھ لفظی تبدیلیاں کر کے اسے ملکۂ معظمہ کی مدح میں کر دیا۔ ساٹھ اشعار کے اس قصیدے کا مطلع ہے:

در روزگار ما نتواند شمار یافت
خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت

ملاحظہ ہو: مالک رام، غالب کے فارسی قصیدے، نقوش لاہور، مارچ ۱۹۶۳ء، ص ۲۳

۵۔ عود اول "کے" ندارد۔ ۶۔ عود اول و دوم "خلد الہ ملکہ"

۷۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں لکھا ہے: "کل دوشنبے کا دن تیس ستمبر کی تھی۔ خط میں "دستنبو" کی طباعت کا ذکر ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط ۲۱ ستمبر ۱۸۵۸ء کو لکھا گیا۔

ص ۷۰۵

۱، ۲۔ عود اول و دوم "اڈمنسٹن" ۲۔ عود اول و دوم "لارڈ کنگ"

۳۔ عود اول و دوم "خان" ندارد۔

ص ۷۰۶

۱۔ عود دوم "تمھارا"

۲۔ عود اول و دوم "دو تو"

۳۔ عود اول "مولانا"

۴۔ عود دوم "اور نہ"

۵۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ اس خط میں غالب نے لکھا ہے: "اس خط کو لکھ کر بند کر چکا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ میرے مشفق، منشی شیو نرائن صاحب کا خط لایا۔ بارے قصیدے کا مسودہ پہنچ گیا اور منشی صاحب نے اس کا چھاپنا قبول کیا۔ یہ تشویش بھی رفع ہو گئی۔ آپ اُن سے میرا سلام کہیے گا اور میرا

کہیے گا:

شکر را نتہاے تو چند انکہ را نتہاے تو

غالبؔ نے مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام خط مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۸۵۵ء میں لکھا ہے: "قصیدے کے چھاپے جانے کی بشارت صاحبِ مطبع (منشی شیونرائن آرام) نے بھی مجھ کو دی ہے۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ کل مرزا صاحب (مرزا حاتم علی مہر) کے خط میں اُن کو ایک مصرع کسی استاد کا لکھ چکا ہوں۔ میں سراسر اُن کا ممنونِ احسان ہوں۔"

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ نے مہر کے نام زیرِ نظر خط ۲۹ ستمبر ۱۸۵۵ء کو لکھا تھا۔

۶۔ عود اول و دوم "آفریں" ندارد۔

۷۔ مہرؔ نے "دستنبو" کا قطعہ تاریخ کہا تھا جو تفتہ کے قطعہ تاریخ کے ساتھ "دستنبو" کے آخر میں شائع ہوا تھا۔ اس قطعہ میں مہرؔ نے "یدِ بیضا" کا استعمال کیا ہے۔ چھپنے سے پہلے مہرؔ نے غالبؔ کو قطعہ لکھ کر بھیجا تھا۔ قطعہ یہ ہے:

اسد اللہ خاں غالبؔ، مہر
حبذا زر رقم چہ دستنبو
نامہ خود سال خویش داد نشاں
یدِ بیضا ستم چہ دستنبو
۱۸۵۷ء

۸۔ عود اول و دوم "وہ آیتنے کے آیتنے ہیں"

ص ۷۰۷

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ "دستنبو" طباعت کی جس منزل میں ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ خط ستمبر ۱۸۵۵ء میں لکھا گیا ہوگا۔ (مرزا ہرگوپال تفتہ اور منشی شیونرائن آرام کے نام ستمبر ۱۸۵۵ء میں لکھے گئے غالبؔ کے خطوط ملاحظہ ہوں)

ص ۷۰۸

۱۔ اردوئے معلّٰی "ہر" ندارد۔

۔ عود اول و دوم "کیا پوچھتا ہے اور کیا کہتا ہے۔"

۳۔ عود اول و دوم۔ "رہتا"

۴۔ عود اول و دوم "ذلیل"

ص ۱۰۹

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ "دستنبو" کی طباعت ۱۸۵۸ء میں ہوئی تھی اور غالب نے زیر نظر خط میں لکھا ہے:
"اسی اکتوبر کے مہینے میں"۔ اس کا مطلب ہے کہ اکتوبر ۱۸۵۸ء میں یہ خط لکھا گیا۔

۲۔ عود اول و دوم "بھیجی"

۳۔ عود اول و دوم "ہوئیں"

۴۔ عود اول و دوم "بہادر" ندارد۔

۵۔ غالب نے خط میں لکھا ہے "مطبع میں سے سادہ کتابیں (دستنبو) یقین ہے کہ آج کل پہنچ جائیں" یہ کتابیں ۲ نومبر ۱۸۵۸ء کو غالب کو موصول ہوئیں ملاحظہ ہو خط ۱) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیر بحث خط نومبر کے اوائل میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۱۱۰

۱۔ اردوئے معلیٰ "پانچوں۔" ۲۔ اردوئے معلیٰ "دو" ندارد۔

۳۔ اردوئے معلیٰ "پانچوں۔"

۴۔ عود اول "کاریگروں۔"

۵۔ عود اول "پہنچے۔"

۶۔ عود اول و دوم "کو" ندارد۔

۷۔ عود اول و دوم "نواب" ندارد۔

۸۔ عود اول و دوم "نواب" ندارد۔

ص ۱۱۱

۱۔ اردوئے معلیٰ "اس کے" ندارد۔

۲۔ اردوئے معلّٰی میں یہ شعر حذف ہوگیا ہے۔

۳۔ اردوئے معلّٰی میں یہ خط مرزا تفتہ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ حال آنکہ خط کے مضمون سے واضح ہے کہ خط مرزا حاتم علی مہر کے نام ہے۔ غالباً قاضی عبدالودود نے پہلی بار اس غلطی کی طرف توجہ دلائی تھی۔

ص ۱۲ء۔

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے لکھا ہے: "کل جمعے کا دن ۲۱ نومبر کو پہنچیں۔" یہ "دستنبو" کا ہے۔ ۱۸۵۸ء میں دستنبو چھپی تھی۔ اس لیے زیر نظر خط شنبہ، ۲۳ نومبر ۱۸۵۸ء کو لکھا گیا ہوگا۔

ص ۱۳،۱ء

۱۔ عود دوم "اظہار۔"

۲۔ عود اول "یکے۔"

۳۔ عود دوم "آیا۔"

۴۔ اردوئے معلّٰی، عود اول "زیادہ" ندارد۔"

۵۔ اردوئے معلّٰی، عود اول "کس طرح۔"

۶۔ اردوئے معلّٰی، عود اول "کیوں کر۔"

۷۔ عود اول، اردوئے معلّٰی "تکلیف۔"

۸۔ عود دوم عود اول "تحصیل۔"

۹۔ اردوئے معلّٰی، یہ پورا مصرع حذف ہوگیا ہے۔

۱۰۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے سات جلدوں کے پارسل کی وصول یابی کی اطلاع دی ہے۔ غالب نے اسی پارسل کی وصول یابی کی اطلاع منشی شیونرائن آرام کو ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں ان الفاظ میں دی ہے۔ "کل جمعے کا دن، ۱۹ نومبر ۱۸۵۸ء کو سات کتابوں کے دو پارسل پہنچے۔ اس کا مطلب ہے کہ زیر نظر خط بھی ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء کو لکھا گیا۔

۱۱۔ عود اول و دوم "کا۔"

ص ۱۴ء

۱۔ عود اول و دوم "توجہ۔"

۲۔ اردوے معلّٰی "ہے"۔ ۳۔ اردوے معلّٰی "اور اردو" "اور" زائد

۴۔ اردوے معلّٰی، عود اول "جائے"۔

۵۔ اردوے معلّٰی: "میرا ایک۔"

ص ۷۱۵

۱۔ عود اول "بہر"۔

۲۔ دیوانِ غالب میں یہ قطعہ شامل ہے۔ اس کے دو شعر ہیں:

مسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے
داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے
سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے

غالب نے سہواً دونوں شعروں کا ایک ایک مصرع لے کر شعر بنا دیا۔ (نسخۂ عرشی، پہلا اڈیشن ص ۱۲۲)۔

۳۔ دیوانِ غالب میں یہ مصرع اس طرح ہے:

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض

(نسخۂ عرشی، پہلا اڈیشن ص ۱۲۲)

۴۔ عود اول و دوم "کہیو۔"

۵۔ عود دوم "کہیو۔"

۶۔ اردوے معلّٰی، عود اول و دوم "کلام"۔

ص ۷۱۶

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ منشی شیونرائن آرام "دستنبو" کی ایک جلد غالب کی مرضی کے مطابق تیار کر رہے تھے جس کی کچھ تفصیلات آرام کے نام خط مورخہ ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء میں موجود ہیں۔ اُس خط میں غالب نے کتاب کا تقاضا کیا ہے۔ زیرِ نظر خط میں بھی غالب نے مہر کو لکھا ہے کہ وہ منشی شیونرائن آرام سے وہ کتاب جلد بھجوائیں۔ آرام کے نام غالب کا خط مورخہ ۳۰ نومبر

۱۸۵۵ء موجود ہے، جس میں اس کتاب کا ذکر ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب مل چکی تھی
اور وصول یابی کی اطلاع بھی دی جا چکی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ زیرِ نظر خط ۲ نومبر ۱۸۵۵ء
اور ۳۰ نومبر ۱۸۵۵ء کے درمیان یعنی اواخر نومبر میں لکھا گیا۔

۲۔ اردوے معلّٰی "کر کے"۔

۳۔ عود اول و دوم "پس۔"

ص ۱۷ء

۱۔ عود اول "موج"۔

۲۔ عود اول و دوم "ہیں۔"

۳۔ عود اول و دوم "رکھتی۔"

ص ۱۸ء

۱۔ عود دوم "کہی"۔

۲۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالبؔ نے خط میں لکھا ہے کہ انھوں نے مختلف لوگوں کو "دستنبو" بھیجی ہے۔
ظاہر ہے کہ یہ واقعہ ۱۸۵۵ء کا ہے۔ خط کے آخر میں غالبؔ نے لکھا ہے: "دوشنبے کا دن ۲۰ دسمبر
کی صبح کا وقت ہے"۔ اس کا مطلب ہے کہ زیرِ نظر خط بیس دسمبر ۱۸۵۵ء کو لکھا گیا۔

۳۔ عود اول و دوم "اظہار"۔

۴۔ عود اول و دوم "یہ" ندارد۔

۵۔ اردوے معلّٰی "حیرت"

۶۔ اردوے معلّٰی، عود اول "کھیلتے تھے"

۷۔ اردوے معلّٰی "یہ ایک زمانہ۔"

ص ۱۹ء

۱۔ عود اول دوم "دل نشیں ہے" "ہے" زائد۔

۲۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ مہرؔ نے اپنے صاحبزادے اور ماموں کی مدد سے دو انگریز مردوں، دو
عورتوں اور تین لڑکیوں کی جان بچائی تھی۔ جس کے صلے میں ۱۲ فروری ۱۸۵۸ء کو مہرؔ اور اُن کے

صاحبزادے کے لیے دو ہزار روپے انعام کا حکم ہوا۔ ۱۸ دسمبر ۱۸۵۸ء کو گورنر جنرل کے حکم سے مہر کے لیے ایک ہزار روپے کی مالیت کا خلعت منظور ہوا۔ ۴ اپریل ۱۸۵۹ء کو گورنر جنرل نے دربار عام کے موقع پر خلعت اور جاگیر سے نوازا۔ غالب نے انھی انعامات کی مبارک باد دی ہے۔ غالب اور مہر کے درمیان خط و کتابت کا آغاز اوائل جولائی ۱۸۵۸ء میں ہوا تھا۔ اس لیے ۱۲ فروری ۱۸۵۸ء کے اعلان کے موقع پر یہ مبارکباد نہیں دی گئی۔ ۱۸ دسمبر ۱۸۵۸ء کے اعلان یا ۴ اپریل ۱۸۵۹ء کے دربار کے موقع پر غالب نے تہنیت دی ہے۔ تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو "غالب کے خطوط" کی چوتھی جلد میں مہر کے حالات۔ زیادہ امکان ۴ اپریل ۱۸۵۹ء کا ہے۔ اس لیے یہ خط غالباً اپریل ۱۸۵۹ء میں لکھا گیا۔ کاظم علی خاں اسے ۲۳ اگست ۱۸۵۸ء کا خط مانتے ہیں۔ (خطوط غالب کا تحقیقی مطالعہ ص ۳۰)

۳۔ عود اول و دوم "اُن ہیں۔"

۴۔ عود دوم "دکھاتے۔"

۵۔ اردوے معلّیٰ "ہیں" ندارد۔

۶۔ اردوے معلّیٰ "بال سفید۔"

ص ۷۲۰

۱۔ عود اول و دوم "صاحب بندہ۔"

۲۔ اردوے معلّیٰ "اڈمنسٹن" عود اول "ادمیسن" عود دوم "اڈمنسٹن"۔

۳۔ عود اول "اب۔"

۴۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں غزل کا مطلع نقل کر کے لکھا ہے "اگر ہم فقیر سچے ہیں اور اس غزل کے طالب کا ذوق پکا ہے تو یہ غزل اس خط سے پہلے پہنچ گئی ہوگی۔" غزل کے طالب سے مراد منشی شیو نرائن آرام ہے۔ غالب نے ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء کے خط میں آرام کو یہ غزل بھیجی تھی۔ اس لیے زیر نظر خط اپریل ۱۸۵۹ء کے اواخر میں لکھا گیا ہوگا۔ ۱۰ مارچ اور ۱۴ مارچ کا ذکر خود غالب نے خط میں کیا ہے۔

ص ۷۲۱

۱۔ عود دوم میں اس شعر میں کئی لفظ غلط چھپے ہیں۔

۲۔ عوداول و دوم "تیر"۔

۳۔ عوداول "ناانصاف"۔

۴۔ عود دوم "قرورع"۔

۵۔ اردوے معلٰی "ہے"۔

۶۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ اپریل ۱۸۵۹ء کے خط میں غالب نے لکھا ہے "انشاء اللہ خاں کا بھی قصیدہ میں نے دیکھا ہے۔ تم نے بہت بڑھ کر لکھا ہے اور سماں باندھا ہے"۔ زیرِ نظر خط میں بھی غالب نے لکھا ہے "سبحان اللہ تم نے قصیدے میں وہ رنگ دکھایا کہ انشا کو رشک آیا"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیرِ بحث خط اپریل ۱۸۵۹ء میں لکھا گیا ہوگا۔ (کاظم علی خاں اسے ۲۳ اگست ۱۸۵۸ء کے فوری بعد کا خط مانتے ہیں)

ص ۷۲۲

۱۔ اردوے معلٰی "نوبہار"۔

۲۔ عوداول و دوم "ہمہ" بجاے "بہ ہمہ"۔

۳۔ اردوے معلٰی "من"۔

۴۔ اردوے معلٰی "سب اُس" "سب" زائد۔

۵۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں مہر کی محبوبہ چناجان کی وفات کا ذکر ہے۔ چناجان کا انتقال ۳۱ مئی ۱۸۶۰ء کو ہوا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط جون ۱۸۶۰ء میں لکھا گیا۔

۶۔ اردوے معلٰی "غم فزا" عوداول و دوم "غم افزا"۔

ص ۷۲۳

۱۔ اردوے معلٰی "ہو جائے"۔

۲۔ عوداول و دوم "ہوے"۔

۳۔ اردوے معلٰی "مغلبچے"۔

۴۔ اردوے معلٰی "مغلبچہ"۔

۵۔ اردوے معلٰی "گیا ہوں" "گیا" زائد۔

۶۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ جون ۱۸۶۰ء کے خط میں غالب نے مہر کی محبوبہ کی وفات کے بارے میں

غیر سنجیدہ لب و لہجہ اختیار کیا تھا۔ ممکن ہے کہ مہر کو یہ انداز ناگوار گزرا ہو اور یوسف علی خاں عزیز کے ذریعے غالب کو اس کا علم ہو گیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جون ۱۸۶۰ء کا خط لکھنے کے بعد یوسف علی خاں عزیز نے مہر اور چنا جان کی محبت کی سنجیدگی کا احساس دلایا تو غالب نے زیرِ نظر خط لکھا۔ بہ ہر حال، جون یا جولائی ۱۸۶۰ء میں یہ خط لکھا گیا۔

۷۔ عودِ اول "اشعار"۔ ۸۔ اصل میں "جشیوں" ہے لیکن کاظم علی خاں کی اطلاع ہے کہ اصل کی روشنی میں یہ قرأت "جشنوں" ہونا چاہیے)

ص ۷۲۴

۱۔ اردوے معلیٰ میں یہ شعر نہیں ہے۔

۲۔ اردوے معلیٰ "آٹھ دس مہینے سے"

۳۔ اردوے معلیٰ "ایک ہندو امیر... کر لیا ہے" ندارد۔

۴۔ عودِ اول و دوم "قرب"۔ ۵۔ اردوے معلیٰ "مکتب کو" ندارد۔

۶۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے مہر کی مثنوی 'شعاعِ مہر' کی تعریف کی ہے اور اس طرح ذکر کیا ہے جیسے یہ مثنوی کچھ ہی دن ہوئے انھیں وصول ہوئی تھی۔ یہ مثنوی دسمبر ۱۸۶۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس لیے غالب نے یہ خط جنوری ۱۸۶۱ء میں لکھا ہو گا۔

ص ۷۲۶

۱۔ آزاد کے نام پہلا خط پہلے اردو (اردو میں یہ خط شفق کے نام تھا۔ اورنگ آباد۔ جنوری ۱۹۳۴ء ص ۹۵-۱۹۴) میں شائع ہوا تھا۔ پھر یہ دونوں خطوط محمد آصف الحق صاحب نے نقوش (لاہور، خطوط نمبر جلد اس ۴۲۰) میں شائع کیے۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ یہ خطوط ان کے جد مولوی محمد نعیم الحق صاحب کے نام ہیں۔ شواہد کے بغیر آن کے اس بیان پر یقین کرنا مشکل ہے۔

ص ۷۲۷

۱۔ خط پر غالب نے دن اور تاریخ تو لکھی ہے لیکن سنہ نہیں لکھا۔ غالب نے لکھا ہے کہ "دلی احاطہ پنجاب کے تحت آ گئی"۔ یہ واقعہ مارچ ۱۸۵۹ء کا ہے۔ غالب نے اس واقعے کی اطلاع خواجہ عبد الغفور سرور کو ۷ مارچ کے خط میں دی ہے۔ اِس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ خط مارچ ۱۸۵۹ء میں لکھا گیا ہو گا۔

ص ۷۳۰

۱۔ اصل خط میں "کہ" صاف نہیں پڑھا جاتا۔

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط کے آخری پیراگراف سے اندازہ ہوتا ہے کہ "قاطع القاطع" کو شائع ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ "قاطع القاطع" کے مصنف امین الدین امین دہلوی تھے اور یہ کتاب ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء یا ۱۸۶۷ء) میں شائع ہوئی تھی۔ اس لیے قیاس ہے کہ یہ خط ۱۸۶۶ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۷۳۲

۱۔ مولانا عباس رفعت کے نام ان دونوں خطوط کے عکس ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی (مئی ۱۹۷۰ء ص ص ۱۴۔۱۵) میں آفاق احمد صاحب (بھوپال) نے شائع کرائے تھے۔ اب یہ دونوں اصل خط غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی میں محفوظ ہیں۔

۲۔ غالب نے ۲۴ محرم لکھا ہے۔ اگر اسے "۲۳ محرم" کر دیا جائے تو دن، عیسوی اور ہجری مہینوں اور سنوں کی مطابقت ہو جاتی ہے۔ غالب نے تاریخ تحریر میں سنین نہیں لکھے۔ لیکن سالِ "رستاخیز بے ۱۲۷۸ھ (مطابق ۱۸۶۱ء) برآمد ہوتا ہے لیکن تقویم "یک صد و دو سالہ" کے مطابق ۲۴ محرم کو جمعہ ہے۔

ص ۷۳۴

۱۔ غالب نے تاریخ تحریر میں سنین نہیں لکھے۔ میرے خیال سے یہ سنہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء ہے۔ ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۷۸ھ کو یکشنبہ تھا۔ لیکن ٹومبر کی ۳ تاریخ تھی، جب کہ غالب نے "۴" تاریخ لکھی ہے۔

ص ۷۳۶

۱۔ محمود مرزا کے دو چچا تھے۔ مرزا عباس بیگ اور مرزا جواد علی بیگ۔ یہاں غالباً مرزا عباس بیگ سے مراد ہے۔

۲۔ غالب نے تاریخِ تحریر میں سنین نہیں لکھے۔ تقویم کی مدد سے ہجری اور عیسوی سنین کا تعین کیا گیا ہے۔ عکس میں تاریخ میں "ذی قعدہ" اور "۱۳" نہیں چھپا۔ عکس کی خرابی ہے۔ ایوانِ غالب میں اس خط کا بہت بڑا عکس موجود ہے۔ اس میں الفاظ پورے ہیں۔ تقویم کی رو سے "چہارشنبہ" کا دن تھا۔

ص ۷۳۷

۱۔ یہ خط پہلی بار سہ ماہی اردو (اورنگ آباد) اپریل ۱۹۲۲ء) میں شائع ہوا تھا اور اس کا مکتوب الیہ

عبدالحق کو بتایا گیا تھا۔ میں نے جب غالب کی "نادر تحریریں" میں یہ خط شامل کیا تو عبدالحق کو مولانا فضل خیرآبادی کا صاحبزادہ بتایا۔ بعد میں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ کیوں کہ غالب اپنے دوست کے لڑکے کے ساتھ وہ لب و لہجہ اختیار نہیں کر سکتے تھے جو اس خط میں ہے۔ دلی میں ایک بزرگ حکیم عبدالحق تھے۔ یہ دہلی کے رہنے والے اور محمد حسن بخش کے صاحبزادے تھے۔ رجانا ہرسنگھ والی بلب گڈھ کے دیوان تھے۔ ۱۸۵۷ء کے دوران یہ بہادر شاہ ظفر کے اڈیکانگ بن گئے تھے۔ بغاوت کے الزام میں انھیں پھانسی دی گئی تھی۔ عین ممکن ہے کہ اس خط کے مکتوب الیہ یہی عبدالحق ہوں۔ مالک رام صاحب کا خیال ہے کہ یہ خط حکیم غلام نجف خاں کے نام ہے۔ (آجکل، نئی دہلی، فروری ۱۹۶۵ء ص) حکیم صاحب کے نام غالب کے خطوط موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب اُن کے ساتھ وہ لب و لہجہ ہرگز اختیار نہیں کر سکتے تھے جو زیر نظر خط میں ہے۔

ص ۳۸۔

۱۔ خط میں جس رقعے کا ذکر ہے، وہ شہزادہ جواں بخت کی شادی کا ہے۔ شہزادے کی منگنی مئی ۱۸۵۱ء میں اور شادی یکم اپریل ۱۸۵۲ء کو ہوئی تھی۔ اس لیے یہ خط مارچ ۱۸۵۲ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۴۰۔

۱۔ اس خط کا عکس پہلی بار ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے ہندوستانی (الہ آباد، ۱۹۳۳ء) میں شائع کیا تھا۔ خط پر مکتوب الیہ کا نام نہیں ہے۔ ڈاکٹر صدیقی نے مشکور علی کے حوالے سے حکیم محب علی کے نام بتایا ہے۔

۲۔ اصل خط کے عکس میں پہلے فقرے کے یہ الفاظ دورانِ طباعت حذف ہو گئے ہیں: "ہے کہ آ" "میں ملے تھے مگر"۔

۳۔ عکس میں شعر صاف نہیں چھپا۔

۴۔ غالب نے تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔ تاریخ اور مہینا صاف نہیں چھپا۔

ص ۴۳۔

۱۔ اس خط کا عکس پہلی بار ہندوستانی (الہ آباد، ۱۹۳۴ء، ص ص ۱۰۵-۹۸) میں شائع ہوا تھا۔

۲۔ خط کے عکس میں "و" صاف نہیں پڑھا جاتا۔

ص ۴۴۔

۱۔ عکس "کیومرث" غالباً طباعت کے دوران "ایک نقطہ" حذف ہو گیا۔

۲۔ عکس "ہا" بجائے "ہاے"۔

ص ۷۴۵

۱۔ "آئے" کے بعد غالب نے دو تین لفظ لکھ کر قلم زد کیے ہیں، جن کے ساتھ لفظ "لیکن" بھی قلم زد ہوگیا۔

۲۔ عکس "دیگر"۔

ص ۷۴۹

۱۔ عکس "ویاس"۔

۲۔ اُس "استفتا" کا ذکر ہے جسے "سوالاتِ عبدالکریم" کے آخر میں شامل کیا گیا تھا۔ استفتا میں دو سوال ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے: قواعدِ مقررۂ فارسی کے مطابق صیغۂ امر کے بعد مجرّد الف نون زائدہ معنیِ فاعلیت کرتا ہے، اور اسم جامد کے آگے الف نون مفیدِ معنی جمع ہے۔ الف نون سے معنی فاعل کے لینے کا قصد کرنا ناشی غفلت سے ہے، یا نہیں؟ خدا بخش مدرّس نورمل اسکول، دہلی۔ محمد نصیر الدین، متعلق نورمل اسکول، دہلی۔ محمد لطیف حسین، مدرّس مدرسۂ سرکاری اور محمد فضل اللہ نے اس سوال کے جو جواب دیے تھے اور جو ظاہر ہے کہ غالب کی مرضی کے مطابق ہیں، شائع کیے گئے ہیں۔

دوسرا سوال ہے: روان و دوان و افتان و خیزان یعنی صیغہ ہاے امر کے آگے الف نون جو آتا ہے، وہ حالیہ کہلاتا ہے۔ الف نون حالیہ کے وجود کا منکر مسلماتِ جمہور کا منکر ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب سعادت علی خاں، ملازم گورنمنٹ اسکول دہلی۔ خدا بخش، مدرّس نورمل اسکول دہلی۔ محمد نصیر الدین اور محمد لطیف حسین (جنھوں نے پہلے سوال کے بھی جواب دیے تھے) نے دیے تھے، جو "سوالاتِ عبدالکریم" میں شائع کیے گئے ہیں۔

ص ۷۴۷

۱۔ عکس "حالب"۔

۲۔ عکس "لعدیہ"۔

۳۔ عکس "اسے"۔

۴۔ عکس "بہ الوف"

ص ۷۴۹

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں لکھا ہے: "ایک مجلد درفشِ کاویانی تذکر کرتا ہوں"۔ درفش

کاویانی" اکمل المطابع، دہلی سے دسمبر ۱۸۶۵ء میں شائع ہوئی۔ جب غالب رام پور کے سفر سے ۸ جنوری کو دہلی واپس آئے تو انھیں تین سو جلدیں ملیں۔ چونکہ مولوی ضیاء الدین ضیا دہلی میں مقیم تھے، اس لیے امکان یہی ہے کہ انھیں جنوری کے اوائل میں "درفش کاویانی" دی ہوگی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ خط اوائل جنوری ۱۸۶۶ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۷۵۲

۱۔ عکس میں یہ لفظ "تنخواد" چھپا ہے۔ غالباً طباعت کے دوران "دو" حذف ہو گیا۔

۲۔ (ا) منشی شیو پرشاد نے تیسرا سکّہ پسند کر کے اس پر صواد بنا دیا۔

(ب) غالب کو اس سکّے کا معاوضہ ایک ہزار روپیہ ملا۔ جو بقول اطہر ہاپوڑی ریاست کی فائل میں درج ہے۔ اطہر ہاپوڑی، غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط "آجکل ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء۔

(ج) اس خط کا عکس پہلی بار اطہر ہاپوڑی نے آجکل، ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء میں شائع کیا تھا۔

ص ۷۵۳۔۱۔

خط کے متن کے آغاز میں تاریخ تحریر لکھی گئی ہے

ص ۷۵۴

۱۔ تاریخِ تحریر میں "دوشنبہ" ہے۔ جب کہ تقویم کی رو سے "یکشنبہ" ہے۔ غالب یا کاتب سے سہو ہوا ہے۔

ص ۷۵۵

۱۔ اردوئے معلّیٰ، مجتبائی (ص ۱۵۱) میں اس شعر پر حاشیہ لکھا ہے کہ "یہ شعر نواب غفران مآب محمد مصطفےٰ خاں حسرتی تخلص کا ہے۔" اُن کے نام کی جگہ استاد کا لفظ یا تو اس لیے لکھا ہے کہ اُس وقت یاد نہیں رہا کہ کس کا شعر ہے یا اس خوف سے لکھا ہے کہ ہندی شاعر کا نام لکھنے سے مخاطب کے دل میں کچھ سند کی وقعت نہ ہو۔" میرا خیال ہے کہ یہ حاشیہ مولانا حالی نے لکھا ہوگا۔

۲۔ اردوئے معلّیٰ مجتبائی "متوقع" ۳۔ اردوئے معلّیٰ مجتبائی "نہیں" ندارد۔

ص ۷۵۶ ۔۔ ۱۔ غالب نے صرف ہجری تاریخ لکھی ہے۔

ص ۷۵۸

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ خط کے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط اسی دوران میں لکھا گیا ہے۔

جب باقر علی خاں کاآمل الور میں تھے۔ کاآمل کے نام غالبؔ کے باقی دو اور خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتاہے کہ زیرِ نظر خط بھی اسی زمانے میں یعنی اواخر ۱۸۶۷ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۷۶۲

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالبؔ نے خط میں لکھا ہے کہ "آج ساتویں شوال کی اور ستائیسویں مارچ کی ہے۔" لفٹنٹ گورنر پنجاب کا خلعت دے کر انبالے کی دعوت دینا اور غالبؔ کے پھوڑے پھنسی ہونا، یہ دونوں واقعات ۱۸۶۳ء کے ہیں۔ اِس لیے یہ خط ۲۷ مارچ ۱۸۶۳ء کو لکھا گیا۔ تقویم کی رو سے ۲۷ مارچ کو ۶ شوال ہے۔ لیکن تقویم میں ایک دن کا فرق عام ہے۔

ص ۷۶۳

۱۔ عودِ اول "بتاؤ"
۲۔ عودِ اول و دوم "کچھ" ندارد۔
۳۔ عودِ اول و دوم "وہاں" ندارد۔
۴۔ عودِ اول و دوم "ہو" بجائے "ہوں"۔

ص ۷۶۴

۱۔ "فرزند" سے مراد "مرزا محمود" ہے، جن کی شادی میں غالبؔ شریک نہیں ہوسکے تھے۔
۲۔ یہاں "کاغذ" کرم خوردہ ہے۔ "صاحب" قیاسی تصحیح ہے۔
۳۔ غالبؔ نے غلام غوث خاں بےخبر کو ایک خط مورخہ مارچ ۱۸۶۳ء میں لکھا ہے: "اواخرِ ماہِ گذشتہ یعنی فروری ۱۸۶۳ء میں نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب دِلّی آئے۔ اہالیِ شہر سب ڈپٹی کمشنر بہادر صاحب کمشنر بہادر کے پاس دوڑے اور اپنا نام لکھوا لائے۔ میں تو بیگانۂ محض اور مطرود حکام تھا۔ جگہ سے نہ ہلا، کسی سے ملا۔ دربار ہوا۔ ہر ایک کا مرگار ہوا۔ شنبہ ۲۸ فروری کو آزادانہ منشی من پھول سنگھ صاحب کے خیمے میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر بہادر کے پاس بھیجا۔ مہربان پاکر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی۔ وہ بھی حاصل ہوئی۔ حاکم جلیل القدر کی وہ عنایتیں دیکھیں، جو میرے تصور میں نہ تھیں۔" جبکہ مرزا عباس کو غالبؔ لکھتے ہیں کہ "مجھ کو یاد کیا"۔ بےخبر کو غالبؔ نے جو کچھ لکھا وہ درست ہے۔

ص ۷۶۷

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ اس خط میں غالب نے شاہ اودھ (واجد علی شاہ) کے بنارس آنے کا ذکر کیا ہے۔ انگریزوں نے جب واجد علی شاہ کو معزول کیا ہے تو ۳ مارچ ۱۸۵۶ء کو وہ کانپور کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں کچھ دن قیام کیا اور پھر ۷ اپریل کو کانپور سے روانہ ہو کر ۱۶ اپریل کو بنارس پہنچے۔ دس دن بنارس رہ کر واجد علی شاہ کلکتے کے لیے روانہ ہو گئے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ اودھ حصہ ۵ ص ص ۲۷۱-۲۷۳) اس لیے یہ خط اپریل ۱۸۵۶ء کے اواخر میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۷۶۸

۱۔ مولانا فضل حق خیرآبادی سے مراد ہے۔

ص ۷۶۹

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے سکے کا ذکر کیا ہے۔ غالب نے سکے کے الزام کی پوری تفصیل حسین مرزا کو ایک خط مورخہ ۱۸ جون ۱۸۵۹ء میں لکھی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیرِ نظر خط جون کے آخر یا جولائی میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۷۷۱

۱۔ غالب نے تاریخِ تحریر میں ہجری اور عیسوی سنین نہیں لکھے۔ غالب نے جو واقعات بیان کیے ہیں اُن کے مطابق یہ ۱۲۷۵ھ اور ۱۸۵۹ء ہے۔ تقویم کی رو سے بھی یہی سنین ہیں۔

ص ۷۷۲

۱۔ اردو معنی "بارگہہ"۔

ص ۷۷۳

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ مولوی مہیش نے اس خط پر ۲۸ جولائی ۱۸۵۹ء تاریخ دی ہے۔ غالب نے اس خط میں دلّی کی بعض عمارتوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ڈھائی جائیں گی۔ ۲ دسمبر ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں میر مہدی مجروح کو اور ۱۶ دسمبر ۱۸۵۹ء کے خط میں حسین مرزا کو غالب نے اطلاع دی ہے کہ یہ عمارتیں ڈھادی گئیں۔ گویا دلّی کی یہ عمارتیں ۱۸۵۹ء کے آخر تک ڈھائی جا چکی تھیں۔ بلاقی بیگم کا کوچہ البتہ معرضِ التوا میں تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ غالب نے زیرِ نظر خط ۱۸۵۹ء میں لکھا۔

لیکن ہیش نے ۲۸ جولائی کیسے لکھا۔ بہت کوشش کے باوجود مجھے اس تاریخ کا ماخذ نہیں ملا۔

ص ۷۷۴

۱۔ غالب نے خط کی تاریخ تحریر "پنجشنبہ ' ۱۸ محرم" لکھی" ہے۔ خط میں جاں نثار خاں کے چھتے کی سڑک نکلنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ ۱۸۵۹ء کا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ خط ۱۸ محرم ۱۸۵۹ء کو لکھا گیا ہوگا۔ تقویم کی رو سے دن اور تاریخ میں ایک دن کا فرق پڑتا ہے۔

ص ۷۷۵

۱۔ اردوے معلّٰی "شمایل"۔

ص ۷۷۷

۱۔ ۶۵ اشعار کا یہ قصیدہ "کلیاتِ غالب" میں بغیر کسی تبدیلی کے موجود ہے۔ اس کا مطلع ہے :

شادم کہ گردشی بسزا کرد روزگار
بے بادہ کام عیش روا کرد روزگار

امجد علی شاہ کا نام اس طرح آیا ہے :

امجد علی شہ آں کہ بذوق دعاے او
صدرہ نماز صبح قضا کرد روزگار

ص ۷۷۹

۱۔ اردوے معلّٰی "لوٹ"۔

۲۔ اردوے معلّٰی "ساتھ"۔

۳۔ غالب کی اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن دنوں یوسف مرزا کلکتے میں تھے۔ غالباً اپنی ضبط شدہ املاک کے لیے کوشش کر رہے تھے۔

ص ۷۸۰

۱۔ خط پر تاریخ تحریر میں غالب نے سنین نہیں لکھے۔ تقویم کی رو سے ۱۸۵۹ء مطابق ۱۲۷۶ھ ہے۔

ص ۷۸۱

۱۔ اردوے معلّٰی "دونو"۔

۲۔ غالب نے تاریخ تحریر میں سنین نہیں لکھے۔ تقویم کی رو سے یہ ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۶۰ء ہے۔

۳۔ غالب سے سہو ہوا ہے۔ یہ رمضان کا نہیں شوال کا مہینا ہے۔

ص ۷۸۲

۱۔ تاریخ تحریر میں غالب نے سنین نہیں لکھے۔ تقویم کی رو سے یہ ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۶۰ء ہے۔

ص ۷۸۳

۱۔ یعنی "مرزا قربان علی بیگ سالک۔"

۲۔ اردوئے معلّٰی "دونو"۔

۳۔ غالب نے خط پر تاریخ تحریر نہیں لکھی۔ البتہ خط میں لکھا ہے: "آج بدھ، سترہ شوال اور ۹ مئی کی۔" تقویم کی رو سے یہ ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۶۰ء ہے۔

۴۔ اردوئے معلّٰی "تڑپ"۔

۵۔ اردوئے معلّٰی "تڑپے"۔

ص ۷۸۴

۱۔ تاریخ تحریر میں سنین نہیں۔ تقویم کی رو سے یہ ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۶۰ء ہے۔

ص ۷۸۶

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ مولوی احمد حسن قنوجی کے نام غالب کے دو خطوط ہیں۔ دوسرا خط ۲۱ دسمبر ۱۸۶۰ء کو لکھا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیر نظر خط ۲۱ ستمبر ۱۸۶۰ء سے کچھ ہی قبل لکھا گیا ہو گا۔ غالب نے خط میں اپنی عمر ۶۰ سال بتائی ہے۔ اس سے بھی ۱۸۶۰ء قرار پاتا ہے۔

ص ۷۸۸

۱۔ اردوئے معلّٰی "آگر"۔

۲۔ اردوئے معلّٰی میں یہ قرأت "دوشنبہ" ہے۔ حال آں کہ اس خط کے آغاز میں غالب نے لکھا ہے: "آج شنبہ چار نومبر کی ہے"۔ تقویم کی رو سے بھی ۴ نومبر کو شنبہ ہے۔ غالباً یہ سہو کاتب ہے۔

۳۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط کے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رام پور سے لکھا گیا ہے۔ غالب نے خط میں لکھا ہے: "آج شنبہ چار نومبر کی ہے"۔ غالب دربار رام پور گئے تھے۔

اس تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا ہے۔ اس دفعہ غالب ۷ اکتوبر کو دہلی سے روانہ ہوئے اور ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو دہلی پہنچے۔

۴۔ اردوے معلّی "اسباب"۔

۵۔ خط میں تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے رام پور کے سفر کا ذکر کیا ہے اور خط کے آخر میں مہینا "ربیع الثانی لکھا ہے۔ میرے خیال سے غالب نے مہینے کے ساتھ تاریخ بھی لکھی تھی مگر کاتب سے تاریخ رہ گئی۔ غالب رام پور کے دوسرے سفر سے ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو دلی پہنچے تھے۔ اس سنہ میں ربیع الثانی اور اگست میں مطابقت تھی۔ اس لیے یہ خط اگست ۱۸۶۶ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۷۹۲

۱۔ تقویم کی رُو سے ۹ نومبر ۱۸۵۸ء کو "سہ شنبہ" ہے۔

ص ۷۹۵

۱۔ یہ خط پہلی بار انشاے اردو (مرتبہ کریم الدین، لاہور، ۱۸۷۲ء، ص-۴۰) میں چھپا تھا۔ خط پر مکتوب الیہ کا نام نہیں ہے۔ تمام شواہد اس حق میں ہیں کہ یہ خط پیارے لال آشوب کے نام ہے۔

۲۔ اسسٹنٹ کمشنر سے مراد ہے کپتان میک ماہن۔ دہلی سوسائٹی کے دو صدر تھے۔ ایک تو مرزا الٰہی بخش اور دوسرے کپتان میک ماہن۔

ص ۷۹۶

۱ اس خط میں غالب دہلی سوسائٹی کے جلسوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس سوسائٹی کا پہلا جلسہ ۲۸ جولائی ۱۸۶۵ء کو اور دوسرا ۱۱ اگست ۱۸۶۵ء کو منعقد ہوا۔ دہلی سوسائٹی کے جلسوں کی روداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب پہلی بار ۱۱ اگست ۱۸۶۵ء کے جلسے میں شریک ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک مقالہ بھی پڑھا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیرِ نظر خط اوائل اگست ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا ہوگا۔ دہلی سوسائٹی کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو: دہلی سوسائٹی اور مرزا غالب از عبدالستار صدیقی۔ علی گڑھ میگزین۔ (۴۹-۱۹۴۸ء غالب نمبر ص ص ۶۴-۴۹)

ص ۷۹۹

۱۔ یہ خط پہلی بار نقوش، لاہور، مکاتیب نمبر جلد ۱ میں شائع ہوا تھا۔ غالب نے ذکی کے دیوان پر

ایک سارٹی فیکٹ بھی لکھا تھا جسے سید مرتضیٰ حسین فاضل نے 'آج کل' دہلی مارچ ۱۹۵۱ء میں شائع کیا تھا چوں کہ یہ سارٹی فیکٹ خط کی صورت میں نہیں ہے۔ اس لیے اس مجموعے میں شریک نہیں کیا گیا۔

ص ۸۰۰

۱۔ نقوش مکاتیب نمبر جلد ا "الوفا"۔

اصل خط میں "چہار شنبہ ۹ جنوری ۱۸۶۳ء" ہے جو خلافِ تقویم ہے میرے خیال سے یہ تاریخ "چہار شنبہ ۲۹ جنوری" ہے (خطوطِ غالب کا تحقیقی مطالعہ ص ۰۰) میں بھی یہی تاریخ پیش کی گئی ہے۔

ص ۸۰۱

۱۔ اردوئے معلّٰی "میر"۔

۲۔ اردوئے معلّٰی "جناب"

۳۔ اردوئے معلّٰی "مہر" ندارد۔

۴۔ عود اول و دوم "میں سے" "میں" زائد۔

۵۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں "دستنبو" کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ستمبر ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ زیرِ نظر خط اواخر ۱۸۵۹ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۸۰۲

۱۔ عود اول و دوم "قصیدے کی احتیاط"۔

۲۔ عود اول "ہائے"۔

۳۔ عود اول "ہے" ندارد۔

ص ۸۰۳

۱۔ عود اول و دوم "مفہوم"۔

۲۔ عود اول "خشخاش و" "و" زائد۔

۳۔ عود اول و دوم "ڈورے"۔

۴۔ یہ خط سید فرخ حیدر نے پہلی بار ادب (الہ آباد، دسمبر ۱۹۳۱ء) میں شائع کیا تھا۔ اس کے بعد سید

فرخ حیدر سے لے کر ڈاکٹر عبدالحق نے اردو (اورنگ آباد، جنوری ۱۹۳۲ء) میں شائع کیا۔
یہاں "اردو" سے لیا گیا ہے۔

ص ۸۰۵

۱۔ عود اول و دوم "دہنگ"۔

۲۔ عود اول و دوم "خط میں خط"۔ دوسرا "خط" زائد۔

۳۔ عود اول و دوم "اُٹرا"۔

ص ۸۰۸

۱۔ اصل خط میں یہ قرأت "کے" پڑھی جاتی ہے۔

۲۔ اصل خط میں "تو یہ" نہیں پڑھا جاتا۔

ص ۸۱۰

۱۔ اس خط کا عکس پہلی بار اورنٹیل کالج میگزین (لاہور، فروری ۱۹۴۷ء) میں محمد داؤد رہبر نے شائع کرایا تھا۔ انھیں مکتوب الیہ کا نام نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ مالک رام کا خیال ہے کہ یہ خط محمد محسن صدر الصدور کے نام ہے۔ (ذکرِ غالب، ص ۱۲۷) مجھے مالک رام صاحب کی رائے سے اتفاق ہے۔

۲۔ غالب ۸ جنوری کو دہلی پہنچے تھے۔ زیرِ نظر خط کے آغاز میں غالب نے لکھا ہے: "پرسوں گیارہ بجے دن کو اپنے گھر پہنچا"۔ اس حساب سے خط کی تاریخ تحریر ۱۰ جنوری ہے۔ غالب نے سہواً "اترسوں" کے بجائے "پرسوں" یا ۱۰ جنوری کے بجائے ۱۱ جنوری لکھ دیا ہے۔

ص ۸۱۱

۱۔ یہ خط پہلی بار سہ ماہی حیاتِ نو (اپریل ۱۹۳۴ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس رسالے کے ص ۳ پر شذرات کے تحت لکھا گیا ہے: "موجودہ ہندوستانی رسائل میں یہ فوقیت صرف "حیاتِ نو" ہی کو حاصل ہے کہ اس میں مرزا غالب مرحوم کے غیر مطبوعہ خطوط کا سلسلہ جاری ہے اور ہر پرچے میں ہم مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ خط مسلسل شائع کر رہے ہیں"۔ یہ رسالہ حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت کی طرف سے شائع ہوتا تھا۔ اس کا پہلا شمارہ ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا تھا اور اپریل ۱۹۳۴ء کا

شمارہ چوتھا۔ (یہ شمارہ میرے پاس موجود ہے) شیخ محمد بدرالاسلام فضلی اس کے اڈیٹر تھے۔ سرورق پر ڈائرکٹر آف پالیسی کی حیثیت سے حالی کے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین کا نام ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ وہی خطوط ہیں جو مولانا حالی کے پاس تھے۔ میں نے ہندوستان اور خاص طور سے پنجاب اور ہریانہ کی بے شمار لائبریریوں میں "حیاتِ نو" کا فائیل تلاش کیا، کہیں نہیں ملا۔

۲- خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں لکھا ہے کہ "اب کے رجب کی آٹھویں تاریخ سے سال ہفتادم شروع ہوا"۔ اس سے قیاس ہوتا ہے ہوتا ہے کہ زیرِ نظر خط ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا۔

ص ۸۱۲

۱- یہ خط پہلی بار خطوطِ غالب مرتبہ مہیش میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے حاشیے میں لکھا ہے: "جن صاحب سے اس رقعے کی نقل ملی اُن کا بیان ہے کہ کوئی منشی صاحب خوش نویس دہلوی" تھے۔ جن کے نام یہ خط لکھا گیا۔ خود خط سے معلوم ہوتا ہے کہ لالہ جگل کشور دلّی کے خوش نویس تھے۔ جن کو غالب نے ایک مسودہ خوش خط نقل کرنے کو دیا تھا اور مکتوب الیہ اس خط کا کوئی اور ہے۔ یہ کسی طرح لازم نہیں آتا کہ مکتوب الیہ بھی خوش نویس ہوں۔ سید مرتضیٰ حسین فاضل نے اس خط کا مکتوب الیہ منشی بہاری لال مشتاق کو تسلیم کیا ہے لیکن انھوں نے کوئی دلیل پیش نہیں کی۔

ص ۸۱۵

۱- خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط کے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط رام پور سے لکھا گیا ہے۔ غالب دوبار رام پور گئے تھے۔ دوسری دفعہ غالب ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو رام پور پہنچے تھے اور ۲۲ دسمبر ۱۸۶۵ء کو واپس روانہ ہو گئے تھے۔ یہ خط اسی قیام کے دوران لکھا گیا ہے۔

ص ۸۱۶ ۱- عود دوم "معل خیر" بجائے "مع الخیر"۔

ص ۸۱۸-۱ سمجھ میں نہیں آتا کہ غالب کس تنخواہ کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس خط میں غالب کے بیان سے تو یہ اندازہ

ہوتا ہے کہ ان کے سسرال والے ان کی مدد کرتے تھے اور پچاس روپے ماہوار دیتے تھے۔ غالبؔ نے ان پچاس روپے ماہوار کا ذکر اس خط کے علاوہ اور کہیں نہیں کیا۔

۲۔ غالبؔ نے تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

۳۔ یہ خط اکبر علی خاں صاحب کی دریافت ہے۔ ملاحظہ ہو: فروغِ اردو (غالب نمبر) لکھنؤ ۱۹۶۸ء

ص ۸۲۲

۱ یہ خط کم سے کم تین بار شائع ہو چکا ہے، ایک دفعہ ڈاکٹر مختارالدین احمد نے اردوئے معلّٰی (دہلی یونیورسٹی، شمارہ ۲) میں دوسری دفعہ تحسین سروری نے اردو نامہ (کراچی، جولائی تا ستمبر، شمارہ ۵) میں شائع کی تیسری دفعہ اصل خط کا عکس آجکل (دہلی، اپریل ۱۹۶۳ء) میں شائع ہوا۔ خط پر مکتوب الیہ کا نام نہیں ہے۔ بہ ظاہر میر محمد زکی زکیؔ دہلوی کے نام معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ اصل خط میں "دیا" ندارد۔ ممکن ہے اصل میں ہو اور فوٹو میں یہ قرات رہ گئی ہو۔

ص ۸۲۳

۱۔ اصل خط "اور"

۲۔ غالبؔ نے اپنی عمر ۷۶ سال بتائی ہے جو درست نہیں۔ ہجری حساب سے غالبؔ کی وفات ۷۳ سال میں اور عیسوی حساب سے ۷۱ سال میں ہوئی تھی۔

ص ۸۲۴

۱۔ اردوئے معلّٰی اور عودِ اول میں اس کے بعد مردان علی خاں رعنا کا وہ شعر نقل کیا گیا ہے جس پر غالبؔ نے اصلاح دی تھی۔ شعر یہ ہے:

گزرا ہے مرا نالۂ دل چرخِ کہن سے
تھا روح کا ہمدم، نہ پھرا جا کے وطن سے

متن میں یہ شعر غالبؔ نے نہیں مرتبین نے لکھا ہے۔ عودِ دوم میں یہ شعر حاشیے ہی پر ہے۔

۲۔ اردوئے معلّٰی "و"

۳۔ اردوئے معلّٰی "خدا تم کو اور ان کو سلامت رکھے" ندارد۔

۴۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں منشی نول کشور کے دہلی آنے کا ذکر ہے۔ غالب نے ۳ دسمبر ۱۸۶۳ء کے خط میں مرزا علاء الدین احمد خاں علائی کو لکھا تھا: "منشی نول کشور صاحب بہ سبیل ڈاک یہاں آئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط دسمبر ۱۸۶۳ء میں لکھا گیا۔

۵۔ عود دوم "یہی"

ص ۸۲۶

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے نواب ضیاء الدین خاں ضیا سے کلیاتِ نظمِ فارسی مانگا تھا۔ بہ قولِ مالک رام صاحب ۱۸۶۲ء تک جو کچھ دوبارہ جمع ہو سکا، وہ منشی نول کشور نے نواب ضیاء الدین احمد خاں کے صاحبزادے مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب سے منگوا لیا اور اپنے مطبع میں چھاپنا شروع کر دیا۔ (ذکرِ غالب، پانچواں اڈیشن، ص ۱۵۴) مزید ملاحظہ ہو: غالب کا خط بہ نام سید بدر الدین احمد المعروف بہ فقیر، مورخہ ستمبر ۱۸۶۳ء۔

ص ۸۲۸

۱۔ مرقع ادب، حصہ ۲ "خواہا"۔

ص ۸۳۱

۱۔ یہ خط پہلی بار اردوے معلیٰ (علی گڈھ، دسمبر ۱۹۰۷ء) میں شائع ہوا تھا۔ پھر اردوے معلیٰ، مکمل شائع کردہ شیخ مبارک علی، لاہور ۱۹۲۳ء میں نقل ہوا۔

مجھے شبہ ہے کہ یہ خط جعلی ہے اور اس سلسلے میں میرے تین دلائل ہیں: (۱) خط میں ایک فقرہ ہے۔ "اسّی برس کا بڈھا ہونے آیا ہوں"۔ غالب یہ فقرہ ہرگز نہیں لکھ سکتے، کیوں کہ غالب کا انتقال عیسوی حساب سے بہتّر اور ہجری حساب سے تہتّر سال کی عمر میں ہوا تھا (۲) خط میں مولانا فضل حق کی وفات کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے جیسے یہ حال ہی کا واقعہ ہو۔ مولانا کا انتقال ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء کو ہوا۔ خط میں صحت کا حال جو بیان کیا گیا ہے وہ ۱۸۶۷ء کے آس پاس کا ہے۔ (۳) مفہوم کی ادائیگی کے لیے غالب اشعار کا استعمال کرتے ہیں لیکن اتنے زیادہ اشعار کا نہیں! اس میں چھے اشعار نقل ہوئے ہیں۔ چوں کہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خط جعلی ہے اس لیے "غالب کے خطوط" میں شامل کیا گیا ہے۔

ص ۸۳۳

۱۔ اردوئے معلیٰ "کاس ٹمین"۔

۲۔ اردوئے معلیٰ "اوڈٹام"۔

۳۔ اردوئے معلیٰ "دونو"۔

۴۔ اردوئے معلیٰ "گرچھال"۔

ص ۸۳۴

۱۔ اردوئے معلیٰ "اوڈٹام"۔

۲۔ "چوبس"۔

۳۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالب نے ۲۹ دسمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں کاس ٹیلین اور اولڈٹام کی قیمت دریافت کی۔ خط زیرِ نظر سے اندازہ ہوتا ہے کہ بابو ہرگوبند سہائے نے قیمت لکھ دی۔ غالب اس خط کی وصولیابی کی اطلاع دے رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط جنوری ۱۸۵۹ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۸۳۵

۱۔ عودِ اوّل و دوم "سکتا"۔

۲۔ عودِ دوم "کو"

ص ۸۳۶

۱۔ عودِ دوم "مرادف"۔

۲۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاکر کے نام غالب کا یہ پہلا خط ہے۔ شاکر کے نام غالب کا وہ پہلا خط جس کی تاریخِ تحریر کا تعین کیا جا سکتا ہے، اکتوبر، دسمبر ۱۸۶۵ء کا ہے۔ اس لیے یہ خط ۱۸۶۵ء یا اس سے قبل کا ہوگا۔

۳۔ اردوئے معلیٰ "ہوئے گا"، عودِ اول و دوم "ہوں گا"۔

۴۔ اردوئے معلیٰ "اصلاع"۔

ص ۸۳۷

۱۔ اردوئے معلیٰ "علاوہ"۔

۲۔ اردو ئے معلیٰ "کہ" ندارد

۳۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالب نے جس طرح رام پور جانے کا ذکر کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط اوائل اکتوبر ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا، کیوں کہ ۷ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو غالب دہلی سے روانہ ہوئے تھے۔

۴۔ عودِ دوم "نفس"۔

۵۔ عودِ اول "نہیں ہے" "ہے" زائد۔ عودِ دوم "نہیں کہیے"۔ "کہیے" زائد۔

ص ۸۳۸

۲۔ عودِ اول و دوم "گو"۔

۳۔ عودِ اول و دوم "ہر فشاں"۔

۴۔ عودِ اول "تیر بر" "بر زائد"

۵۔ عودِ اول و عودِ دوم "سیلاب چیں"۔ سیلاب چی" منھ ہاتھ دھونے کا برتن کو کہتے تھے۔ ناسخ کا شعر ہے:

ماہِ کامل تیرے منھ دھونے کی ہے سیلاب چی آفتاب اے ماہِ تاباں آفتابہ ہو گیا

(فرہنگِ آصفیہ، جلد ۳، ص ۱۵۰)

۶۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالب نے اس خط میں "نامۂ غالب" کا ذکر کیا ہے۔ یہ خط اگست ۱۸۶۵ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا تھا اور غالب نے بعض دوستوں کو اس مہینے میں نامۂ غالب کی اشاعت کی اطلاع دی تھی۔ زیرِ نظر خط میں غالب نے لکھا ہے کہ "دِلّی پہنچ کر ڈھونڈوں گا"۔ ۱۸۶۵ء میں غالب رام پور پہنچے تھے۔ اور ۲۸ دسمبر ۱۸۶۵ء کو دلّی کے لیے روانہ ہوئے۔ اس لیے میرا قیاس ہے کہ یہ خط اکتوبر اور دسمبر ۱۸۶۵ء کے درمیان رام پور میں لکھا گیا۔

ص ۸۳۹

۱۔ غالب کی "قاطع برہان" شائع ہوئی تو اس کے جواب میں سید سعادت علی نے "محرقِ قاطع برہان" شائع کی۔ اس خط میں "صاحبِ تپ محرق" سے مراد یہی سید سعادت علی ہیں۔ "محرقِ قاطعِ برہان" کے جواب اور غالب کی حمایت میں تین رسالے چھپے۔ مولوی نجف علی خاں کی "دافع ہذیان"، میاں داد خاں سیاح کی "لطائفِ غیبی" اور عبدالکریم کی "سوالاتِ عبدالکریم"۔ آخری دو رسالوں کے مصنف خود غالب تھے۔ انھوں نے دوسروں کے نام سے یہ رسالے شائع کیے تھے۔ تین دوستوں سے مراد

میاں داد خاں سیاح اور عبدالکریم ہے۔

۲۔ عود اول و عود دوم "بھیجی" ندارد۔

۳۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں ہے۔ غالب نے خط میں جن تین رسالوں کا ذکر کیا ہے وہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸٦۴ء ۱۸٦۵ء میں شائع ہوئے تھے، اس لیے امکان ہے کہ یہ خط ۱۸٦۵ء میں لکھا گیا ہو۔

۴۔ عود اول و عود دوم "پہنچی"۔

ص ۸۴۰

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں لکھا ہے کہ: "آٹھ جنوری کو فقیر دلی پہنچا" اکتوبر ۱۸٦۵ء کو جب غالب رام پور گئے تھے تو ۸ جنوری ۱۸٦٦ء کو دلی واپس پہنچے تھے۔ اس لیے یہ خط جنوری ۱۸٦٦ء میں لکھا گیا ہے۔

۲۔ عود دوم "خوش خاں"۔

۳ عود اول "فطرت و حیا"۔ عود دوم "فطری و جبلی"

۴۔ عود دوم "عالم"۔

ص ۸۴۱

۱۔ عود اول دوم "ساتھ"۔

۲۔ عود اول و دوم "جس"۔

۳۔ عود دوم "مجلد"۔

۴۔ عود اول "اُن کی"

۵۔ خط میں تاریخِ تحریر نہیں۔ غالب نے "درفش کاویانی" کے بھیجنے کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب دسمبر ۱۸٦۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس لیے خط زیرِ بحث ۱۸٦٦ء میں لکھا گیا ہوگا۔ غالب نے لکھا ہے: "آج یکم اپریل کو جواب لکھتا ہوں۔ اس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط یکم اپریل ۱۸٦٦ء کو لکھا گیا ہوگا۔

٦۔ اردوے معلّی "صاحب"۔ ندارد۔

۷۔ عود اول "اتحاد"۔

ص ۸۴۲

۱۔ عود اول "صدقوں"۔

۲۔ اردوے معلّٰی "ومکاتیب" ندارد۔ عود اول "مکاتب"

۳۔ اردوے معلّٰی "ذی حیات و" ندارد۔

۴۔ عود اول "مکاتب"۔

۵۔ اردو ے معلّٰی "پارسی مکتوبوں اور رسالوں اور نسخوں اور کتابوں"۔

۶۔ اردوے معلّٰی مجموع اجزا چھاپا ہوکر"۔

۷۔ عود اول و دوم "کرنے جائیے" بجائے "کرے"۔

۸۔ اردوے معلّٰی "جاں کنی کے خیالات..... سبک دوش کر دیا" ندارد۔

۹۔ عود اول "بے" بجائے "نے"۔

۱۰۔ عود اول "بے" بجائے "نے"

۱۱۔ عود اول و دوم "گئیں"۔

۱۲۔ عود اول "احدیث"

۱۳۔ اردوے معلّٰی "تا امکان" ندارد۔

ص ۸۴۳

۱۔ اردوے معلّٰی "تعقیدِ معنوی..... نہیں آتی" ندارد۔

۲۔ عود دوم۔ اس بات"

ص ۸۴۴

۱۔ عود اول و دوم "اندایار"

ص ۸۴۵

۱۔ عود دوم "کشت کار"۔

ص ۸۴۶

۱۔ عود اول "حرف"۔

Scholars have considered the present research work on Ghalib's letters, the most systematic, scientific and comprehensive so far without detracting from the valuable work done by the earlier researchers.

(Yogendra Bali, Times of India, New Delhi, 2nd July 1984)

Dr. Khaliq Anjum's work is a work with a difference and the first of its kind in the sub-continent......To say the least "Ghalib ke khatoot" edited by Khaliq Anjum is an encyclopaedia of Ghalib.

(Prof. Jagan Nath Azad, Kashmir Times, Srinagar, July 3, 1984)

All lovers of art and letters owe a debt to Dr. Anjum for his painstaking work which he completed after years of research in India and abroad. It brings Ghalib alive to us and we see the poet as he really was—all agog with the excitement of everyday things which he transformed into momentous events.

(Statesman, New Delhi, July 30, 1984)

ڈاکٹر خلیق انجم نے برسوں کی محنت کے بعد تمام دستیاب خطوط کو چار جلدوں میں یکجا کر دیا ہے، اُن کی تاریخ متعین کرنے کی کوشش کی ہے، خطوط کے ماٰلہٗ و ماعلیہ کے بارے میں تفصیلی حواشی قلمبند کیے ہیں، جہاں اصلی خط مہیا ہو گیا ہے، اس کا عکس شائع کر دیا ہے۔
غرض ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں خطوطِ غالب کا، ممکنہ حد تک، ایک مکمل مجموعہ دستیاب ہو جائے گا۔ اس کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم اردو دنیا کے شکریے کے مستحق ہیں۔ (مالک رام)

"غالب کے خطوط کی پہلی جلد اب چھپ کر سامنے آئی ہے، جس کو دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے اور آنکھوں کی روشنی بڑھ جاتی ہے۔ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات لکھ رہا ہوں کہ خلیق انجم صاحب نے بہت دل لگا کر، اور نظر جما کر اس کام کو انجام دیا ہے۔ انھوں نے بہت صبر و تحمل کے ساتھ کئی سال صرف کیے متن کی تصحیح پر، اور بہت سا وقت خرچ کیا متن سے متعلق حواشی لکھنے پر، انھوں نے ضروری مصادر اور مآخذ کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ یہ قیاس نہیں، میں یہ بات ذاتی معلومات کی بنا پر لکھ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ انھوں نے تلاش و جستجو کا حق ادا کرنے کی ایماندارانہ کوشش کی ہے، اور جدید اصولِ تدوین کی روشنی میں متن کو مرتب کیا ہے۔
میں خلیق انجم صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُن کی اِس کتاب سے جہاں غالب شناسی کے ذخیرے میں اہم اضافہ ہوگا، وہاں غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دلّی کی فہرستِ مطبوعات میں ایک ایسی کتاب کا اضافہ ہوگا جسے صحیح معنوں میں اہم کتاب کہا جا سکے گا۔ ایسی اہم کتاب، جس کا مطالعہ ہر غالب شناس کے لیے ازبس ضروری ہے۔ (رشید حسن خاں)

"اپنی نوعیت کے عظیم تحقیقی کارنامے کی ترتیب پر ڈاکٹر خلیق انجم اور اُس کی اشاعت پر غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ہر طرح مبارکباد کی مستحق ہے۔ "غالب کے خطوط" غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے، اور مجھے یقین ہے کہ غالب شناس اِس کتاب کی وہ قدر کریں گے، جس کی یہ مستحق ہے۔" (پروفیسر مختار الدین احمد)

ڈاکٹر خلیق انجم نے برسوں محنت اور دیدہ ریزی کے بعد خطوطِ غالب کو چار جلدوں میں فراہم کیا ہے۔ غالبیات میں انھوں نے اب تک جو کام کیے تھے وہ بھی اُن کی ناموری کے لیے کافی تھے، لیکن اس کارنامے نے انھیں غالب شناسوں کی صفِ اوّل تک پہنچا دیا ہے۔
(ڈاکٹر نثار احمد فاروقی)

غالبیات کے تقریباً تمام گوشوں پر ڈاکٹر خلیق انجم کی نظر ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں برصغیر سے باہر برطانیہ میں بھی انھوں نے اردو کے علمی ذخیروں کو اچھی طرح دیکھا بھالا ہے۔ بلاشبہ اس علمی کام کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم پوری اردو دنیا کے شکریے کے مستحق ہیں۔ (پروفیسر گوپی چند نارنگ)